مقالاتِ حالی

انجمن ترقی اردو ہند - اردو گھر - راؤز ایونیو - نئی دہلی

مقالات حالی

حصہ اوّل

جس میں مولانا حالی مرحوم کے مضامین جو مختلف اخباروں
اور رسالوں میں وقتاً فوقتاً
شائع ہوئے تھے جمع کیے
گئے ہیں

انجمن ترقی اُردو (ہند) اردو گھر، نئی دہلی

سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو (ہند) ۴۹۰

اشاعت ۱۹۸۲ء

تعداد، ایک ہزار

مطبوعہ، جمال پرنٹنگ پریس دہلی

کتابت، محمد احسن بجنوری

قیمت، تین روپے

فہرست مضامین

دیباچہ

مولانا حالیؔ مرحوم ہماری زبان کے اُن بلند پایہ ادیبوں میں سے ہیں جو شاعر بھی ہیں اور نثار بھی۔ اردو شاعری میں جو انقلاب انھوں نے پیدا کیا اس کا احسان ہم کبھی نہیں بھول سکتے۔ اُردو نثر بھی اُن کی بہت کچھ زیرِ بارِ منت ہے۔ اُن سے پہلے اُردو نثر کو یہ رتبہ حاصل نہیں ہوا تھا جو ان کی بدولت ہوا۔

ان کی نثر نہایت جچی تلی اور متین ہوتی ہے ان میں ضبط اور اعتدال ایسا ہے جو بڑی مشکل سے نصیب ہوتا ہے اور صرف بڑے بڑے اساتذہ ہی اس پر قادر ہو سکتے ہیں، ورنہ اکثر اچھے اچھے انشا پرداز اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر کہیں کے کہیں بھٹک کر نکل جاتے ہیں اور غیر متعلق باتیں کہنے لگتے ہیں اور سمجھتے ہیں جو زیادہ چیخے چلائے گا اسی کی آواز زیادہ سُنائی دیگی۔ وہ دھوکے میں ہیں، وہ نہ انسانی فطرت سے واقف ہیں اور نہ انشا پردازی کے گُر سے۔ مولانا حالیؔ اس وقت تک کبھی کچھ نہیں کہتے جب تک کہ انھیں کسی بات کے کہنے یا خیال کے ظاہر کرنے کی حقیقی ضرورت پیش نہیں آتی، اور جو کہتے ہیں وہ ایسی کہ دل میں اُتر جائے۔ جب کوئی خیال دماغ میں صحیح اور صاف نہیں ہوتا تو بیان میں بھی صحت اور صفائی نہیں آتی اور نزارِ عبارت

آرائی کیجئے دھندلا پن نہیں جاتا۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ہم خیال ادا تو کرتے ہیں مگر ہم جو چاہتے ہیں وہ بات پیدا نہیں ہوتی، اس لیے فقروں کے ردّے پر ردّے چڑھائے جاتے ہیں اور پھر بھی بات نہیں بنتی، ہے کیا؟ ایک ضربے کی کمی ہے جو اس موقع پر آنا چاہیے تھا اور وہ نہیں سوجھا۔ یہ گُر مولانا حالی سے سیکھنا چاہیے۔ انھیں لفظ کے صحیح اور برمحل استعمال میں کمال حاصل ہے۔ بعض وقت وہ ہندی کا پرانا یا کوئی غریب لفظ استعمال کر جاتے ہیں لیکن ایسا برمحل ہوتا ہے کہ کلام میں جان پڑ جاتی ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم ہار کر نثری شاعری کرنے لگتے ہیں۔ یہ شیوۂ ضعف اور عجز کی دلیل ہے۔ مولانا حتی الامکان کبھی نثر میں شاعرانہ رنگ پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے کیونکہ یہ ظلم ہوتی ہے نہ نثر، اور خیال کی صحت اور قوت کو ضعیف کر دیتی ہے۔ ان کی نثر میں متانت، قوت، صفائی اور ضبط پایا جاتا ہے جو اعلیٰ نثر کے جوہر ہیں۔

میرا منشا یہاں مولانا حالی کی نثر نگاری پر بحث کرنے کا نہیں۔ یہ میں کسی دوسرے وقت کے لیے اُٹھا رکھتا ہوں۔ میں صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ ہم نے اُن کی نثر کی پوری قدر نہیں کی۔ ان کی نثر کی کتابیں بارہا طبع ہو چکی ہیں اور اچھی خاصی مقبول ہیں، لیکن ان کے مضامین جو وقتاً فوقتاً مختلف رسالوں اور اخباروں میں شائع ہوئے وہ اب تک یکجا جمع نہیں کیے گئے۔ مولوی وحید الدین سلیم مرحوم نے ایک مجموعہ شائع کیا تھا لیکن وہ بہت مختصر تھا۔ ان سب کا جمع کرنا آسان کام نہ تھا۔ اول تو ان اخبارات اور رسائل کے نام ہی معلوم کرنا مشکل تھا جن میں یہ مضامین شائع ہوئے تھے۔ پھر ان کا بہم پہنچانا اس سے بھی زیادہ کٹھن تھا، اور اگر خوش قسمتی سے تلاش اور جستجو کے بعد ان کے فائل کہیں دست یاب ہو گئے تو اس انبار میں سے ڈھونڈھ کر نکالنا کچھ کم دردسری کا کام نہ تھا۔ میں شیخ محمد اسمٰعیل صاحب سکرٹیری اورنٹیل پبلک لائبریری پانی پتی کا ممنون ہوں کہ انھوں نے ایک مدت کی جستجو اور محنت کے بعد یہ مضامین بہم پہنچا کر مرتب کیے اور انجمن ترقی اُردو کو طبع کے لیے دیے۔ بعض مضامین جو انھیں نہیں ملے تھے، وہ میں نے دوسرے ذرائع سے بہم پہنچائے۔ ان مضامین کے حاشیے بھی شیخ صاحب کے لکھے ہوئے ہیں۔ میں نے نظرثانی کے بعد حسب ضرورت کہیں کہیں کمی بیشی کر دی ہے۔ ورنہ یہ سب کام انھیں کا کیا ہوا ہے۔

یہ مضامین جو "مقالات" کے نام سے شائع کئے گئے ہیں۔ دو حصوں پر مشتمل ہیں ایک میں عام مضامین ہیں اور دوسرے حصے میں کتابوں کے تبصرے اور وہ تقریریں ہیں، جو مولانا نے بعض جلسوں یا کانفرنسوں میں فرمائیں۔

میرے خیال میں یہ مجموعہ مکمل ہے اور اب شاید ہی کوئی ایسا مضمون ہوگا جو بچ گیا ہو۔ اس پر بھی اگر مولانا کا کوئی مضمون یا تبصرہ وغیرہ ہماری نظر سے رہ گیا اور کسی صاحب کو اس کی اطلاع ہو تو وہ براہ کرم اس سے مطلع فرمائیں۔ طبع ثانی میں شریک کر دیا جائے گا۔

عبدالحق
آنریری سکرٹیری انجمن ترقی اُردو

حیدرآباد دکن
۳۰ / اگست ۱۹۳۴ء

دیباچہ طبع ثانی

مولانا حالی جدید شاعری اور نثر کے معماروں میں ہیں۔ جدید نسل آج بھی ان سے شاعری، تنقید، انشا اور سوانح کے آداب سیکھ سکتی ہے۔ انھوں نے ادب کو خلوص، نصب العین، جامعیت اور استواری عطا کی۔ انھوں نے شاعری کے حدود کو وسیع کیا، تنقید کی بنیاد ڈالی اور سنجیدہ اور پُرمغز بات۔ صاف ستھرے انداز میں کہنے کی رسم عام کی۔ حالی کی نظم سے زیادہ یہی ان کی نثر ہمارے لیے نمونہ کا کام دے سکتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مقالات حالی کے مطالعے سے نہ صرف طلبا، اور اساتذہ کو، بلکہ عام اُردو دانوں کو بھی فائدہ ہوگا اور حالی کے چراغ سے برابر نئے چراغ جلائے جاتے رہیں گے۔

حالی کی دوسری اہم تصنیفات بھی عام طور پر بازار میں نہیں ملتیں، انجمن ترقی اُردو ہند کی یہ کوشش ہے کہ حالی کا پورا سرمایہ پھر بازار میں آسکے اور موجودہ نسل کے لیے یہ ذہنی غذا جلد سے جلد فراہم ہو سکے۔

علی گڑھ
یکم جون ۱۹۵۸ء

آل احمد سرور
سکریٹری انجمن ترقی اُردو ہند

۱ مناجات بدرگاہ قاضی الحاجات

مولانا حالی نے ۱۸۶۴ء اور ۱۸۷۰ء کے درمیان ایک
مولودِ شریف" اُردو میں لکھا تھا مگر وہ ان کی زندگی میں نہ
چھپ سکا۔ ۱۹۳۲ء میں مولانا کے فرزند خواجہ سجاد حسین
صاحب نے اسے پہلی مرتبہ شائع کیا۔ یہ مناجات اسی مولود
شریف سے لے کر مضامین کے شروع میں تبرکاً درج کی جاتی ہے۔

الٰہی تیرا کرم وسیع، تیری عنایت شامل، تیرا فیض عام، تیرے ہاتھ کشادہ، تیرا ملک بے زوال، تیرے خزانے بے حساب، تیری نعمتیں سرمدی، تجھ سے کیا کیا مانگیے ہم اور کہاں تک مانگیں؟ تجھ سے دولتِ کونین پہ راضی ہونا ایسا ہے جیسے بحرِ قلزم سے پیالیا بھرنا۔ تجھ سے دنیا اور آخرت مانگنی ایسی ہے جیسے خوانِ یغما سے بھوکا اُٹھنا۔ تیرا گدا نہیں جو ہفت اقلیم کی سلطنت پہ لات نہ مارے، تیرا بھوکا نہیں جو نعیمِ جنت کے لیے ہاتھ پسارے۔ جس نے تجھ سے تیرے سوا آرزو کی، اس نے آرزو کرنی نہ جانی جس نے تیرے ہوتے عرش اور رب العرش پر خاک نہ ڈالی اس نے تیری قدر نہ پہچانی ؎

آنچہ خواہند زِ دنیا بند نخواہند آں را
دریں سخن شستہ از ہمتِ درویشاں است

الٰہی اگر ظرفِ مختصر میں دریائے بے کراں نہیں سماتا تو ہمارے حوصلے فراخ کر!

الٰہی اگر زمینِ شور میں ابرِ فیض رساں اپنا رنگ نہیں جماتا تو ہم کو جوہرِ قابل دے۔

اگر زیں نا سزا دل عار داری
کرم بسیار و دل بسیار بر داری

الٰہی! جس طرح اپنے شریک کو صفحۂ امکان سے مٹایا، اسی طرح نقشِ غیر ہماری لوحِ خاطر سے محو فرما۔

الٰہی! جس طرح ستاروں کو سورج کی روشنی میں کھپایا۔ اسی طرح ہم کو انوارِ ذات میں مضمحل کر۔

الٰہی! وہ جلوہ دکھا جس کا حجاب اسی کی یکتائی ہے جس کی اوٹ دیدۂ تماشائی ہے، جو علم و ادراک کے پردوں میں مستور ہے۔ جس کا منشا رخفا غایت ظہور ہے، جس کے طالب کو وصول سے قطع نظر ہے، جس کا ملنا حوصلۂ توقع سے باہر ہے جو تقریر میں نہ آئے، جو تحریر میں نہ سمائے۔

وہ مانگتا ہوں جس کے بیاں سے زباں ہے لال
اے وائے! اگر روا نہ ہو مطلب فقیر کا

۲۔ سیّد احمد خاں اور اُن کے کام

(از علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۔ ۱۸۷۱ء صفحہ ۱۱۸)

ان دنوں میں جناب مولوی سید احمد خاں بہادر تمام ہندستان کی تربیت میں عموماً اور ہماری قوم کی تہذیب اور اصلاح میں خصوصاً جو ان مردانہ سعی اور کوشش کر رہے ہیں، اور اپنے اُس احسان کی بنیاد ڈال رہے ہیں جس کے بوجھ سے ہم اور ہمارے اخلاف کبھی سُبک دوش نہ ہوں گے۔

اہلِ ملک میں سے جو لوگ سید صاحب کی سرگرمی اور جاں فشانی کو شائبۂ اغراض نفسانی سے پاک اور منزہ نہیں جانتے یا ان کی رائے کو قرینِ صواب نہیں سمجھتے یا ان کے مَسلک ہدیٰ سے متجاوز رکھتے ہیں۔ اگرچہ میں نہ کبھی پہلے ان کا ہم زبان ہوا، نہ اب ہوں اور امید ہے کہ آگے کو بھی نہ ہوں گا، مگر اس میں شک نہیں کہ اس تحریر سے پہلے اُن کے باب میں میری رائے کبھی تذبذب اور تردد سے خالی نہیں رہی۔ لیکن الحمد للہ کہ میرے تذبذب کا منشا کوئی داعیۂ نفسانی نہ تھا۔ لہٰذا میرے خلوص نے مجھے اس مرض سے نجات دی اور جو رائے میری اب ہے غالباً یہی قرینِ صواب بھی ہے۔

میرے نزدیک سید صاحب کی نسبت لوگوں کا سوءِ ظن بہ حسب اختلافِ طبائع ان چار وجہوں میں سے کسی نہ کسی وجہ پر مبنی ہے۔

یا تو یہ بات ہے کہ ہم جنسوں کی خیر خواہی اور ان کی بہبودگی کے لیے تہ دل سے کوشش کرنے اور اپنے عزیز وقت کا ایک معتدبہ حصّہ خاص ایسے کام میں صرف کرنا اور بہ حسب مقتضائے مقام عقل اور مالی تدبیروں میں مضائقہ نہ کرنا، اس زمانے میں ایسا نادرالوجود ہے کہ اگر مردانِ خدا میں سے کوئی مرد اس راہ میں قدم رکھتا ہے تو وہ شوائبِ غرض سے پاک

نہیں سمجھتا اور اس کا خلوص ریاکاری کے سوا اور کسی بات پر محمول نہیں ہوتا۔

یا جیسا کہ ہر قوم ہر ملک ہر زمانے میں جن لوگوں نے گزشتہ زمانے کی رسوم و عادات پر اعتراض کیا ہے یا سابقہ کے قانونِ معاشرت میں کوئی نیا انقلاب پیدا کرنا چاہا ہے وہ ضرور ہدفِ طعن و ملامت ہوئے ہیں۔ اسی طرح سید صاحب کے حسنِ قبول میں خلل واقع ہوا۔

یا یہ کہ سید صاحب اپنی صاف دلی اور کھرے پن سے بعض کلمات ایسے کہہ اٹھتے ہیں جن کو سن کر بعض سامعین کا حوصلہ تنگی کرتا ہے اور وہ کلمات بجائے محبت کے ان کے دلوں میں مخالفت کی بنیاد ڈالتے ہیں۔

کیا عجب ہے کہ سید صاحب کا تقرب سلطانی بھی کسی تنگ ظرف اور تنگ چشم کی نظروں میں کھٹکتا ہو۔

ان چاروں وجوہات میں سے کوئی وجہ ایسی نہیں معلوم ہوتی جس کی طرف کچھ التفات کیا جائے اور جس سے ان کی حقیقی اور نفس الامری خوبیوں کو کچھ ضرر پہنچے۔

اور بعض لوگ سید صاحب پر جو اعتراض کرتے ہیں کہ اولاد کی دنیوی تعلیم میں اس قدر کوشش کرنی اور آدابِ دین سے بالکل کورا رکھنا کہاں تک قرینِ صواب ہے؟

لباس و طعام وغیرہ میں ابنائے جنس کی مخالفت پر اس قدر مبالغہ کرنا جیسے کوئی فرض و واجب پر کرتا ہے اور جو نتائج قوم کی تالیف اور موافقت پر مرتب ہوتے ہیں ان پر لحاظ نہ فرمانا کون سی مصلحت کا مقتضا ہے۔

پہلی بات کا جواب دینا ہمارے ذمے نہیں کیوں کہ جو امور سید صاحب کی ذات خاص سے متعلق ہیں وہ ہماری بحث سے خارج ہیں۔

دوسرا امر بے شک ایسا ہے کہ جب تک اس کا جواب نہ دیا جائے گا۔ اس وقت تک سید صاحب اور ان کے خاص مددگار اپنے ذمے سے فارغ نہ ہوں گے اور میں صرف اس جواب پر اکتفا کرتا ہوں کہ میں نے سید صاحب کے معصوم ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔

سید صاحب کے کارنامے

مگر اس قدر ضرور کہتا ہوں کہ آج سید صاحب اپنی کوششوں کے اعتبار سے اس حدیث کے صحیح مصداق ہیں کہ سید القوم خادمہم

کتاب ''خطباتِ احمدیہ'' جو انھوں نے لندن میں جا کر تالیف کی ہے' ظاہر ہے کہ اپنے لیے ایک عمدہ ذخیرہ آخرت کا مہیا کیا ہے اور کیا عجب ہے کہ فریضہ حج جو باوجود استطاعت اور قربِ مسافت کے ان سے ادا نہ ہو سکا' اس کی تلافی اسی تالیف سے ہو جائے۔ مگر قوم کو بھی اس احسان کی شکر گذاری سے چارہ نہیں' اگرچہ اس کتاب میں اکثر مضامین اور خیالات ایسے ہیں جن میں ہم جناب مؤلف کو منفرد نہیں کہہ سکتے لیکن اور بہت سی حیثیتیں ایسی ہیں جن کے اعتبار سے اس کتاب کو اثباتِ نبوت کی پہلی کتاب کہنا چاہیے اور جن کے لحاظ سے یہ کہنا غیر موزون نہیں کہ آج مولوی سید احمد خاں صاحب کے سوا دوسرے سے اس کام کا سرانجام ہونا محال تھا۔

رعیت کی آزادی جو اس سلطنت کی بے بہا اور برگزیدہ خاصیتوں میں سے ایک خاصیت ہے اور جس کی حقیقت نہ جاننے سے سلطنت کی بڑی خوبی ہماری آنکھوں سے چھپی ہوئی تھی' اگر سچ پوچھیے تو اس کی معرفت کا دروازہ جو ہم پر کھلا' اس کی کنجی سید صاحب کی آزاد تحریریں ہیں۔ ہم کو وہ زمانہ یاد ہے کہ ایامِ غدر کے بعد ہنوز بغاوت کی آگ مدھم نہیں ہوئی تھی اور گورنمنٹ کی نگاہ تمام ہندوستانیوں پر عموماً اور مسلمانوں پر خصوصاً غضب آلود پڑتی تھی' اور چند نااہلوں اور خیرہ سروں کے الزام نے برٹش انڈیا کی کل قوموں کو خوف و رجا اور امید و بیم کے بھنور میں ڈال رکھا تھا' اور کیا دوست اور کیا دشمن اور کیا مخالف اور کیا موافق سب کے دلوں پر رعبِ سلطنت چھایا ہوا تھا۔ اس وقت اس اولوالعزم جواں مرد نے وہ کام کیا جس سے گورنمنٹ کی حق پسندی اور حق شناسی رعایا پر' اور رعایا کی بے گناہی اور بے جرمی گورنمنٹ پر کالشمس فی رابعۃ النہار آشکارا ہو گئی۔ رسالہ ''اسبابِ بغاوتِ ہند'' کا لکھنا اگرچہ سید صاحب کی آزاد اور بے باک طبیعت کی بے شمار موجوں میں سے ایک موج تھی' لیکن ہمارے گراں بار کرنے کو یہ احسان کچھ کم نہ تھا۔

انگلستان سے جو وہ ہر فن اور علم کی منتخب کتابیں اپنے ساتھ لائے ہیں اور یہاں ان کے اردو میں ترجمہ کرانے کی سبیلیں نکالنے میں سرگرم ہیں' اگر غور سے دیکھیے تو یہ ہمارے ان مقاصدِ جلیلہ میں سے ہے جن کے حاصل ہونے کی توقع ہم کو اس سے پہلے گورنمنٹ کے

سوا اور کسی سے نہ تھی اور جن پر ہمارے وہ کام اٹکے ہوئے ہیں جن کے نہ ہونے سے ہم پر انسان بالفعل کا اطلاق اب تک صحیح نہیں ہوا۔

پرچہ تہذیب الاخلاق جو سید صاحب کی حسنِ توجہ سے ابھی جاری ہوا ہے، یہ بھی ہماری حدّتِ بصر اور تیزیٔ نظر کے لیے ایک بہت عمدہ وسیلہ ہے بعض لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ "امرِ معاش میں اس قدر منہمک ہونے کی ترغیب دینی گویا امرِ معاد کی طرف سے بالکل ذہول اور غفلت کا پردہ ڈالنا ہے۔ کیوں کہ چین۔ مصر اور یونان کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی عقل معاش کو جس قدر ترقی ہوتی گئی، اسی قدر عقل معاد میں تنزل ہوتا گیا اور رفتہ رفتہ امرِ دین میں ایسے کوتاہ بیں اور ناعاقبت اندیش ہو گئے کہ ان کی حماقت کی مثالیں شمار اور بیان کی حد سے باہر ہیں اور اب یورپ کی اعلیٰ درجہ کی ترقی بیان کرنے کی حاجت نہیں۔" اگرچہ یہ اعتراض ایسا نہیں ہے جس سے تہذیب الاخلاق کی خوبی کو دھبہ لگے لیکن اس سے بچنے کے لیے میانہ روی اختیار کرنی اور دونوں مصلحتوں کو ملحوظ رکھنا اور اعتدال کی حد سے تجاوز نہ کرنا قرینِ صواب ہی نہیں، بلکہ واجب ہے اور اس پرچہ کا مقبول خاص و عام ہونا زیادہ تر اسی بات پر موقوف ہے۔

علی گڑھ سوسائٹی جو اپنے بانی کے حسنِ سلیقہ پر گواہی دیتی ہے اور جس کی دیکھا دیکھی اور بہت سی علمی مجلسیں ہندوستان میں منعقد ہوئیں، اگرچہ آج تک اس کی خوبی کو نہیں پہنچیں، اس کی مثال ہماری نسبت ایسی ہے جیسے ایک خشک پودے میں پانی دیا جائے جس طرح پانی دینے سے خشک پودا اُسی وقت سرسبز اور بارآور نہیں ہو جاتا۔ اسی طرح اس سوسائٹی کے فوائد اور منافع اگرچہ بالفعل محسوس نہیں ہوتے، لیکن ہم لوگ ان سے برابر متمتع ہوتے چلے جاتے ہیں اور اب جو اس کے بانی اور سرگروہ اور میر مجلس مولوی سید احمد خاں بہادر عنقریب علی گڑھ میں رونق افروز ہونے والے ہیں۔ امید ہے ان کی موجودگی میں اُس کی کوششیں اور زیادہ بارآور ہوں گی۔

کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم اہلِ اسلام جس کے سرمنشا اور مہتمم سید صاحب ممدوح ہیں اس کا قائم ہونا اس مرض کا علاج ہے جس نے ہماری قوم میں اُنس باقی نہیں رکھا اور جو اس

کمیٹی کے قائم ہونے سے پہلے لاعلاج معلوم ہوتا تھا۔

کاش ہمارے ملک کے دولت مند مسلمان اس کمیٹی کے مطالب اور مقاصد کو غور سے دیکھیں اور سمجھیں کہ سید صاحب نے اُن کے اور ان کی قوم کے لیے کیسا اعلیٰ طریقہ نکالا ہے اور وہ بارگراں جو سید صاحب نے محض بہ مقتضائے رقتِ جنسیت اپنے سر پر رکھا ہے اس کے اُٹھانے میں آپ بھی شریک ہوں اور صرف روپے پیسے ہی سے نہیں بلکہ جان و دل سے ان کی امداد کریں۔

یہاں کے مسلمانوں میں جو روز بروز جہل پھیلتا جاتا ہے اور جس بات میں وہ ہندوستان کی عام قوموں میں ممتاز گنے جاتے تھے۔ اب اسی بات میں سب سے زیادہ متبذل ہوتے جاتے ہیں، اس کا بڑا سبب دولت مند مسلمانوں کی بے اعتنائی، تن آسانی اور نفس پروری ہے، کیا وہ اس بات کو گوارا کرتے ہیں کہ دہلی اور لکھنؤ سے شہر جو ہندوستان کے بڑے دارالعلوم گنے جاتے ہیں، اُن میں کوئی اتنا نہ رہے جس سے یہ پوچھا جائے کہ نماز میں کتنے فرض ہیں؟ اور وضو کن کن چیزوں سے ٹوٹتا ہے؟ کیا وہ اس بات کو جائز رکھتے ہیں کہ جو شائستہ قوم آج ہندوستان میں فرماں روا ہے، اور جس کے زن و مرد اور پیر و جوان سب علم و دانش کے پتلے اور جہل و ناشائستگی کے دشمن ہیں، ان کے عہد میں مسلمانوں سے زیادہ کوئی ذلیل و خوار نہ ہے۔

سید صاحب کی جو یہ تمنا ہے کہ مسلمانوں کے حسنِ اتفاق سے ہر ضلع میں کم سے کم ایک مدرسہ ایسا قائم ہو جس میں علوم قدیمہ اور فنونِ جدیدہ کی تعلیم جو بوجہ شائستہ ممکن ہو، سو خداتعالیٰ ان کی یہ آرزو پوری کرے۔

ظاہراً اس کوشش کے بار آور ہونے میں ابھی بہت دن باقی ہیں۔ ہاں اگر دولت مند اور ذی مقدور مسلمانوں نے اس مہم عظیم کا بوجھ صرف سید صاحب ہی پر نہ ڈالا اور اُن کے درد میں آپ بھی شریک ہوئے اور اپنے عیش و عشرت کے اوقات و مصارف کا ایک معتدبہ حصہ ان کی غم خواری میں صرف کیا تو البتہ خداتعالیٰ کی ذات سے اُمید ہے کہ ہندوستان کے پانچ سات بڑے شہروں میں ایسے مدرسوں کی بنیاد پڑ جائے اور جو تاریکی ساری قوم پر چھا رہی ہے اس کے دُور ہونے کی کچھ کچھ امید بندھے۔

اگر مسلمانوں نے اب بھی بے پروائی کو کام فرمایا اور سید صاحب کا ساتھ دینے میں کوتاہی کی اور اپنی آئندہ نسلوں کے لیے کچھ پود نہ لگائی تو ان کی وہی مثل ہوگی جیسا کہ شمالی امریکہ کے وحشیوں کے حال میں لکھا ہے کہ جس وقت لین گسٹر کا وہ عہد نامہ لکھا گیا جو ۱۷۴۴ء میں سلطنت ورجینیا اور چھ قوموں میں بمقام پنسل وینیا قرار پایا تھا تو اس کے لکھے جانے کے بعد سلطنت ورجینیا کے ایلچیوں نے امریکہ والوں سے کہا کہ:-

"ولیمزبرگ" میں ایک کالج ہے، اس ملک کے لڑکوں کی تربیت کے لیے کچھ روپیہ جمع ہے، اگر تم میں سے چھ قوموں کے سردار اپنے لڑکے کالج میں بھیج دیں تو ہماری سرکار سے ہر شئے کا سرانجام ہوسکتا ہے اور یورپ کے کل علوم سکھائے جائیں گے۔"

ان وحشیوں نے کہا:

"پہلے ایک بار ہمارے لڑکوں نے اضلاع شمالی کے کالجوں میں تعلیم پائی تھی اور ان کو تمہارے علوم سکھائے گئے تھے، مگر وہ پڑھ لکھ کر آئے تو ہمارے کام کے نہ تھے۔ بھاگنا، جنگل میں رہنا، کوٹھا بنانا، ہرن پکڑنا، کچھ نہ جانتے تھے۔ ہم کو منظور نہیں کہ اپنی اولاد کو علم پڑھا کر اپنے کاموں سے بالکل کھو دیں۔"

میں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے مجھ کو مولوی سید احمد خاں کا خوش کرنا منظور نہیں نہ ان کے مخالفوں سے بحث کرنی مقصود۔ بلکہ اس کا منشا وہ ضرورت اور مصلحت ہے جن کے سبب سے بھولے کو راہ بتائی جاتی اور مریض کو دوائے تلخ کی ترغیب دی جاتی ہے۔

وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغ

۳۔ انبیاءؑ

نبی کی ضرورت پر ایک وجدانی شہادت

(از رسالہ تہذیب الاخلاق جلد ۶ نمبر ۱۳۔ بابت یکم شوال ۱۲۹۲ھ صفحہ ۱۶۰ تا ۱۶۴)

جو باتیں انسان کو مذہب نے تعلیم کی ہیں اور جن کو وہ الہامی جانتا ہے، وہ عموماً یا تو خدا تعالیٰ کی ذات و صفات سے علاقہ رکھتی ہیں۔

یا اس سزا و جزا سے جس کا وقت موت کے بعد مقرر کیا گیا ہے اور اس لیے ہم تمام مذہبی تعلیمات کو علم مبدأ و معاد کہتے ہیں۔"

پس "نبی کی ضرورت" ثابت کرنے کے لیے ہم کو دو باتوں کا ثبوت دینا کافی ہے ایک یہ کہ "مبدأ و معاد" نفس الامر میں ایسی دو حقیقتیں ہیں جن کا علم حاصل کرنا انسان پر واجب ہے۔ دوسرے یہ کہ "مبدأ و معاد" کا علم نبی کے سوا کسی اور ذریعے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

جس طرح مثلاً علم کیمیا کے ذریعہ سے ہم اس بات کا مشاہدہ کرا سکتے ہیں کہ پانی بسیط نہیں ہے بلکہ دو مختلف گیسوں یعنی اوکسیجن اور ہائیڈروجن سے مرکب ہے۔ اسی طرح ہم یہ ہرگز نہیں دکھا سکتے کہ یہ مبدأ ہے اور یہ معاد۔ لیکن ہم ان دونوں چیزوں کے وجود پر انسان کی اصل فطرت کو گواہ کر سکتے ہیں اور اس کی گواہی ہمارے نزدیک مشاہدہ سے بھی زیادہ یقینی ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ انسان کا حال جو تفحص کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے

تو ادنیٰ تامل کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو اکثر چیزوں کا علم محنت کرنے سیکھنے اور غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ اس کو کسبی علم کہتے ہیں جیسے پڑھنا لکھنا، ایجادات و اختراعات کرنا، کھانا پکانا، بونا اور کاٹنا وغیرہ

بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کا علم انسان کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ اس کو فطری یا وہبی یا قدرتی علم کہتے ہیں۔ مثلاً ضرورت کے وقت کھانا پینا، دھوپ اور مینہ میں سایہ ڈھونڈنا، جاڑے میں گرم ہونے کی تدبیریں کرنی۔ یہ باتیں اس کو فطرت کے سوا کسی نے نہیں سکھائیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہم یہی باتیں اس کے ابنائے جنس یعنی دیگر حیوانات میں بھی مشاہدہ کرتے ہیں جن کا معلم اور استاد قطعاً قدرت کے سوا کسی اور کو نہیں ٹھہرا سکتے۔

جب ہم گھونسلا بنانے میں بئے کی کاریگری اور شہد کے حاصل کرنے میں مکھی کی حکمت اور جالا پورنے میں مکڑی کا ہنر دیکھتے ہیں اور اکتساب کی راہیں چاروں طرف سے مسدود پاتے ہیں تو ہم کو اس بات میں بالکل شک نہیں رہتا کہ قدرتی علم صرف میل طبعی ہی کا نام نہیں ہے بلکہ بعضے ایسے دقائق اور صنائع بھی اس میں داخل ہیں جو بادی النظر میں قوت متفکرہ کے نتائج معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن جب ذرا اور تامل کیا جاتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسی قدرتی علم کے لحاظ سے انسان اور ابنائے جنس میں دو طرح کا امتیاز رکھا گیا ہے۔

ایک یہ کہ حیوانات کا قدرتی علم ہمیشہ ایک خاص درجے پر محدود رہتا ہے۔ کبھی اس سے تجاوز نہیں کرتا۔ مثلاً جو گھونسلا ابابیل نے حضرت نوح علیہ السّلام کی کشتی میں بنایا تھا اُس میں اس زمانے کے گھونسلوں میں ہرگز تفاوت نہ ہوگا۔ بہ خلاف انسان کے اس کا قدرتی علم ہمیشہ ایک ہی حالت پر نہیں رہتا۔ مثلاً اگر چار پانچ ہزار برس پہلے کی بعض انسانی عمارتوں کا مقابلہ زمانۂ موجودہ کی عمارات سے کیا جائے تو شاید اس بات کا یقین بہت مشکل سے آئے کہ دونوں کام ایک ہی نوع کے افراد نے بنائے ہیں۔

دوسرے یہ کہ حیوانات کو صرف وہ باتیں سکھائی گئی ہیں جو ان کے مصالح جزئیہ

اور اغراض محسوسہ کے لیے مفید ہوں اور بتری عمل طرح ان کی حاجت رفع کر دیں۔ جیسے بھوک کے وقت دانہ گھاس یا گوشت وغیرہ کھا لینا، پیاس کے وقت پانی پینا۔ شبق کی حالت میں اپنی مادہ کے ساتھ نزدیکی کرنی، دھوپ اور مینہ یا سردی کے بچاؤ کے لیے گھونسلا یا بل یا بھٹ وغیرہ بنانا، اپنے بچوں کی خاص مدت تک پرورش کرنی بخلاف انسان کے کہ اس کے سینے میں ان باتوں کے سوا وہ علوم بھی القا کئے گئے ہیں جن کے ذریعے سے وہ اپنے مصالح کلیہ اور منافع آئندہ کا سراغ لگا سکتا ہے۔ جیسے جھوٹ یا زنا یا خیانت کو بُرا جاننا اور سچ یا عصمت یا امانت کو اچھا سمجھنا۔

جب ذرا او زیادہ غور کیا جاتا ہے تو انسان کے قدرتی اور اکتسابی علم میں تین طرح کا امتیاز ہونا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اول یہ کہ قدرتی علم کی اصل تمام نوع میں متحقق ہونی ضرور ہے۔ کیوں کہ ہم اس علم کے آثار دیگر حیوانات میں اسی طرح مشاہدہ کرتے ہیں۔ مثلاً شہد کی مکھی جس طرح سے شہد حاصل کرتی ہے اور مکڑی جس ہنر سے جالا بورتی ہے وہ طریقہ اور وہ ہنر ان کے تمام بنی نوع میں پایا جاتا ہے۔ مگر چوں کہ انسان کو خدا تعالیٰ نے عقل عنایت کی ہے اور عقل کا مقتضا تمام افراد میں یکساں نہیں ہوتا اس لیے وہ قدرتی اصل ایک صورت پر قائم نہیں رہتی۔ مثلاً عورت اور مرد کو بغیر کسی تخصیص کے ایک دوسرے پر حرام جاننا ایک عام قانون ہے جو کہ انسان کو فطرت نے تعلیم کیا ہے، مگر اس کی تخصیص کی صورتیں ہر قوم میں جُدا جُدا ہیں۔ مسلمانوں کے ہاں اور طریقہ ہے۔ ہندوؤں کے ہاں اور دستور ہے، عیسائیوں کے ہاں اور قاعدہ ہے۔ بہ خلاف اکتسابی علم کے کہ وہ نوع کے بعض افراد میں متحقق ہوتا ہے۔ بعض میں نہیں ہوتا۔ جیسے علم جیولوجی اور علم برق، کہ یہ دونوں علم آج کل اہل یورپ کے ساتھ مختص ہیں، یا جیسے حرکات کواکب کا علم، علم ہندسہ کہ ایک زمانہ میں اہل مصر کے کے ساتھ مختص تھا۔

دوسرے یہ کہ جب انسان کو کوئی ایسی تعلیم دی جائے جو قدرت نے اس کو پہلے سے سکھا رکھی ہے تو ضرور ہے کہ وہ بات بغیر دلیل اور برہان کے اس کے دل میں تہ نشین ہو جائے، بخلاف اکتسابی علم کے کہ جب تک اس پر کافی دلیلیں قائم نہ کی جائیں تب تک

اس کی صداقت پر ہرگز دل گواہی نہیں دے سکتا، مثلاً اگر ہمارے سامنے کوئی یہ کہے کہ "گرمی کی شدت میں سرد ہوا سے نہایت فرحت حاصل ہوتی ہے" تو خواہ اس کا طبعی سبب بیان کرے خواہ نہ کرے ہم کو اس کے تسلیم کر لینے میں کوئی عذر نہیں ہوتا، لیکن اگر وہ ہم سے یہ آکر کہے کہ "ہوا دو مختلف گیسوں یعنی اوکسیجن اور ہائیڈروجن سے مرکب ہے" تو ہم اس بات کے خواہاں ہوں گے کہ وہ عمل کیمیا کے ذریعے ہوا کے اجزا تحلیل کر کے ہم کو دکھا دے۔

تیسرے جو علم انسان کو قدرت نے تعلیم کیا ہے، ضرور ہے کہ وہ سچا اور مطابق واقع کے ہو، بخلاف اکتسابی علم کے اس میں غلطی اور خطا کا احتمال بھی ہو سکتا ہے، مثلاً صحت کی حالت میں ٹھنڈے پانی سے پیاس کا بجھانا جو انسان کو قدرت نے تعلیم کیا ہے، اس میں کبھی خطا واقع نہیں ہوتی۔ لیکن مرض کی حالت میں جب پیاس اس قدر بڑھ جائے تو ممکن ہے کہ وہ بالکل فائدہ نہ بخشے یا پیاس کو اور زیادہ کر دے۔

ان سب باتوں پر غور کرنے کے بعد جب ہم اپنے اصل مقصود کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ہم کو اس بات کا اقرار کرنا پڑتا ہے کہ جہاں قدرت نے انسان کو اور ہزاروں باتیں تعلیم کی ہیں انہیں باتوں میں سے مبدأ و معاد کا علم اجمالی بھی ہے۔ یعنی اس قدر جاننا کہ "ہمارا کوئی صانع ہے اور مرنے کے بعد ہم کو کچھ نہ کچھ اپنی برائی بھلائی کا ثمرہ ملنے والا ہے" یہ انسان کی اصل فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے اور ہمارے پاس اس کی دو زبردست دلیلیں ہیں۔

جہاں تک ہماری نگاہ پہنچتی ہے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آدمی عام اس سے کہ مذہب کا پابند ہو یا نہ ہو اور عام اس سے کہ الوہیت کا قائل ہو یا منکر، بہرحال جس وقت وہ کسی ایسی خطرناک حالت میں پھنس جاتا ہے جس سے جانبر ہونے کی کوئی تدبیر نظر نہیں آتی اور جن وسائل پر اس کو بھروسا تھا وہ سب منقطع ہو جاتے ہیں تو جس طرح لوہا مقناطیس کی طرف کھنچتا ہے اسی طرح اس کی دلی توجہ اور باطنی ہمت چاروں طرف سے سمٹ کر ایسی ان دیکھی اور ان سمجھی قوت کی طرف کھنچتی ہے جس کو وہ آڑے وقت کا سہارا اور اپنی تمام تدبیروں کا منتہا سمجھتا ہے۔

دوسرے جہاں تک ہم کو معلوم ہے ہم نوعِ انسان کے کسی فرد کو اس بات سے خالی نہیں پاتے کہ وہ بعض برائیوں سے نہ کسی دُنیوی مضرت کے اندیشہ سے بلکہ ایک ایسے خوف کے سبب سے بچتا ہے یا بچنے کا ارادہ کرتا ہے جس کا کھٹکا اس کو مرنے کے بعد ہے۔ اور بعض بھلائیاں نہ کسی دُنیوی منفعت کے لیے بلکہ ایک ایسی توقع پر کرتا ہے یا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے جس کے پورے ہونے کی امید اس کو مرنے کے بعد ہے۔ اسی مطلب کو ہم یوں بھی ادا کر سکتے ہیں کہ ہر فرد انسانی بعضے کاموں کو نہ کسی دُنیوی مضرت یا منفعت کے لحاظ سے بلکہ محض دل کی شہادت سے مذموم یا محمود جانتا ہے۔ پس متذکرہ بالا بیان سے اس کے سوا کوئی بات ذہن میں نہیں آتی کہ "معاد کا اجمالی علم" جو اس کی فطرت میں رکھا گیا ہے صرف اسی کی ہدایت سے وہ اُن کاموں کو بُرا یا بھلا جانتا ہے۔

اس ساری تقریر سے یہ نتیجہ نکلا کہ "مبدأ و معاد کا اجمالی علم" انسان کو قدرت نے تعلیم کیا ہے۔ کیوں کہ اگر اکتساب سے حاصل ہوتا تو اس کے آثار تمام بنی نوع میں بلا استثنا ہرگز نہ پائے جاتے۔

یہاں ایک شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ شاید یہ خیالات انسان کی اصل فطرت میں ودیعت نہ کیے گئے ہوں بلکہ مذہبی تعلیمات کے سبب رفتہ رفتہ تمام دنیا میں پھیل گئے ہوں مگر یہ شبہ ہم کو ایک ایسی دلیل کی طرف ہدایت کرتا ہے جس سے ہمارے مطلب کو اور زیادہ تقویت حاصل ہوتی ہے۔ ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ قدرتی علم کا ایک یہ بھی خاصہ ہے کہ جب کوئی بات اس کے موافق انسان کو تعلیم دی جاتی ہے تو وہ اس کو بغیر دلیل اور بُرہان کے تسلیم کر لیتا ہے۔ پس اگر یہ بات مان لی جائے کہ خیالات مذکورہ مذہبی تعلیمات کے سبب دنیا میں شائع ہوئے ہیں تو بھی ہمارا مطلب کہیں نہیں جاتا۔ کیوں کہ اگر یہ دونوں اصول یعنی مبدأ و معاد مجملاً انسان کی فطرت میں مخفی نہ ہوتے تو کسی طرح ممکن نہ تھا کہ سارا جہان ایسی ہی نادیدہ باتوں کے تسلیم کرنے پر متفق ہو جاتا جن کا نمونہ سلسلۂ محسوسات میں کہیں نظر نہیں آتا۔

ہم اوپر یہ بھی لکھ چکے ہیں کہ قدرتی علم میں اکتسابی علم کی طرح غلطی کا احتمال کبھی نہیں ہوتا بلکہ وہ ہمیشہ سچا اور مطابق واقع ہوتا ہے۔ پس جب کہ ہم یہ بات ثابت کر چکے کہ مبدأ و معاد

کا اجمالی علم، قدرتی ہے، اکتسابی نہیں، تو ضرور ہے کہ جیسا مبدأ و معاد کی نسبت ہمارا اعتقاد ہے، اسی طرح واقع میں بھی ہمارا کوئی صانع ہے اور مرنے کے بعد ہماری بُرائی بھلائی کا ثمرہ ہم کو ملنے والا ہے۔

جب یہ بات ثابت ہو چکی کہ مبدأ و معاد کا اعتقاد صحیح اور مطابق واقع کے ہے، تو ہماری عقل ہرگز جائز نہیں رکھتی کہ جس فیاض حکیم نے بغیر طلب اور خواہش کے اس اجمالی علم کی چاٹ لگا کر ہم کو اس تفصیل کا مشتاق بلکہ ایسا حاجت مند کیا، جیسے بیمار دوا کا، اور پیاسا پانی کا محتاج ہوتا ہے، وہ باوجود ہماری طلب اور خواہش کے اس کی تفصیل کا دروازہ ہم پر نہ کھولے۔ ہمارے نزدیک اگر مبدأ و معاد کا تفصیلی علم حاصل کرنے کے وسائل اگر ہم سے منقطع لئے جائیں تو ہمارا حال یا تو بعینہٖ اس پیاسے کا سا ہو جس کو ایک سرد اور شیریں اور شفاف پانی کے چشمے سے دو گھونٹ پلا کر اس چشمے کی راہیں چاروں طرف سے مسدود کر دی جائیں، یا اس غلام کا سا حال ہو جس کو اس کا آقا کسی دور دراز مسافت پر ایک خطرناک راستے سے بھیجے اور سوا اس کے اس راستے کا خطرناک ہونا اس کو کسی طرح نہ جتائے۔ ان خطرات کی حقیقت یا ان کے موقع و محل سے آگاہ نہ کرے اور کوئی تدبیر اُن سے بچنے کی اس کو نہ بتائے۔ کیا ہمارا وہی نعمت جس کو ہم جود و کرم کے ساتھ متصف اور بخل و خست سے منزہ جانتے ہیں، وہ ہمارے ساتھ ایسا معاملہ کر سکتا ہے؟ نہیں! ہرگز نہیں، بلکہ ضرور ہے کہ ہمارے لیے کوئی ایسی شمع روشن کرے جو اس اجمال کے دھندلکے پر تفصیل کی روشنی پھیلا کر ہمارے جہل و تردد کو علم و یقین کے ساتھ مبدل کر دے۔

یہاں شائد ہمارے دل میں یہ خیال گزرے کہ وہ شمع ممکن ہے کہ ہماری عقل ہو جو کہ ہم میں اور ہمارے ابنائے جنس دیگر انات میں مابہ الامتیاز ہے اور جس کے سبب سے ہم کو تمام محسوسات پر شرف اور فضیلت حاصل ہے اور جس کی بدولت ہمارے بنی نوع پر موجودات عالم کے اسرار روز بروز کھلتے جاتے ہیں۔

ہم کو امید نہیں کہ اس خیال کو ہمارے دل میں پانی کے بلبلے سے زیادہ قیام ہو۔ کیوں کہ ہم اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھتے ہیں تو اپنی عقل کو مبدأ و معاد کی حقیقت

کے ساتھ وہ نسبت پاتے ہیں جو آنکھوں والے کو ایک اندھیری کوٹھری کے ساتھ ہوتی ہے کیا کسی کو یہ امید ہے کہ آنکھوں کی روشنی ایک کلبۂ تیرہ و تار میں کچھ کام دے سکتی ہے؟ نہیں! ہرگز نہیں دے سکتی۔ اسی طرح آدمی کی عقل مبدأ و معاد کی حقیقت کا سراغ ہرگز نہیں لگا سکتی۔

بڑے بڑے حکیم اور فیلسوف اور بڑے بڑے محقق اور دانش مند جنھوں نے سارے جہان کی چیزوں کو چھان مارا، اور حقائق اشیاء پر جو جہالت کے پردے پڑے ہوئے تھے ان کو مرتفع کیا اور قانونِ قدرت سے وہ اصول اور قاعدے استنباط کئے... جن کے سبب سے انسان کے چہرے پر خلافت رحمانی کا منصب دار ہونا کھل گیا۔ جب انھوں نے اپنی حد سے آگے قدم بڑھایا یعنی بے اس کے کہ کسی شمع غیبی سے اپنا چراغ روشن کریں۔ اپنی اٹکل سے مبدأ و معاد کا سُراغ ڈھونڈھنے لگے تو صرف یہی نہیں کہ وہ منزل مقصود تک نہ پہنچ سکے، بلکہ انھوں نے ایسی ٹھوکریں کھائیں اور ان کی رایوں نے ایسی غلطیاں کیں کہ جب ان کے دیگر حالات کے ساتھ مبدأ و معاد کے متعلق خیالات کو دیکھا جاتا ہے تو ان میں وہ نسبت معلوم ہوتی ہے جو کہ عاقل اور مجنوں کے کلام کے درمیان ہونی چاہیے۔ اور بڑی دلیل اس بات کی کہ یہ گروہ اپنی اس سعی میں ناکام رہا، یہ ہے کہ اس بیشمار گروہ میں سے شاید وہ شخصوں کی رائیں ایسی نہ نکلیں جو کہ باہم اتحاد کلی رکھتی ہوں۔

یہاں ہم کو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مطلب کے زیادہ تر دل نشین کرنے کے لیے قدیم مصر والوں کا تھوڑا سا ضروری حال رولن صاحب کی تاریخ سے بطور انتخاب نقل کریں۔

جس طرح اس زمانے میں اہل یورپ اپنے تئیں پورا شائستہ اور اپنے سوا تمام عالم کو وحشی یا نیم وحشی خیال کرتے ہیں اسی طرح اہلِ مصر غیر قوموں اور غیر ملکوں کے لوگوں کو وحشی کہا کرتے تھے۔ چناں چہ جب نکیو بادشاہ تخت پر بیٹھا تو اس نے اول دریائے نیل کی نہر پر بدستور سابق مدد جاری رکھی۔ مگر تھوڑا عرصہ گزرنے کے بعد ایک غیبی خیال سے خوف کھا کر اس نہر کی تعمیر بند کرا دی کیوں کہ اس سے یہ بات کہی گئی کہ اس نہر کے بننے سے وحشی قوموں کے

لیے مصر میں آنے کی راہ کھل جائے گی۔

پہلے لوگ مصر کو فنون و آداب سلطنت کا ایک عمدہ مدرسہ (جہاں سے علوم کو نشوونما اور روز بروز ترقی ہو) سمجھتے تھے اور حقیقت میں بھی عمدہ عمدہ فن وہاں ایجاد ہوتے تھے اور اس ملک سے نہایت عمدہ عمدہ ہنر اور عجیب عجیب فن ان لوگوں کو جو علم و ہنر میں ترقی کرنے کی کوشش کرتے تھے حاصل ہوتے تھے۔

یونان کے بڑے بڑے لوگوں مثل ہومر[1] اور فیثاغورث[2] اور افلاطون[3] اور وہاں کے اچھے اچھے مقننوں نے مثل لائیکرگس[4] اور سولن[5] اور بہت سے ناموں کے جن کا بیان یہاں ضروری نہیں۔ بہ نظر تکمیل علوم مصر کا سفر اختیار کیا اور خدا تعالیٰ نے بھی (کتاب مقدس میں)

۱؎ ہومر یونان کا نہایت قدیم اور مشہور و معروف شاعر ہے۔ مشہور یونانی مورخ ہیروڈوٹس اس کا زمانہ ساڑھے آٹھ سو برس قبل حضرت عیسیٰ بتاتا ہے۔ لیکن بعد کے مورخین کا خیال ہے کہ گیارھویں صدی قبل مسیح میں تھا اس کی رزمیہ نظمیں ایلیڈ (Iliad) اور اوڈیسی (Odyssey) یونانی علم ادب کی جان ہیں

۲؎ فیثاغورث۔ یہ مشہور حکیم ۵۸۲ تا ۵۰۷ قبل حضرت مسیح کے درمیان گذرا ہے۔ شاعری، موسیقی، حکمت، فلسفہ، ہندسہ، طبیعات، ہیئت، جغرافیہ اور بہت سے علوم و فنون کا بے نظیر ماہر تھا۔ علوم طبیعیہ کے متعلق اس نے بہت سی نئی نئی باتیں دریافت کیں۔ دنیا میں چل پھر کر جغرافیائی معلومات حاصل کیں۔ زمین کے متحرک ہونے کا مسئلہ سب سے پہلے اسی نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔

۳؎ افلاطون۔ شہر ایتھنز کا باشندہ، سقراط کا شاگرد اور ارسطو کا استاد تھا (۴۲۷ تا ۳۴۷ ق م) دنیا کا نہایت نامور فلسفی جس کے فلسفے کا اثر اب تک دنیا پر ہے۔

۴؎ لائیکرگس۔ (۸۲۵ قبل مسیح) اسپارٹا (یونان) کا زبردست فاضل اور مقنن تھا۔ مدت تک مصر و شام کی سیاحی کرنے اور وہاں کے آئین سلطنت کو بہ نظر امعان مطالعہ کرنے کے بعد سلطنت اسپارٹا کے لیے نہایت قابلیت سے قوانین وضع کیے جو مدت مدید تک ملک میں جاری رہے۔

۵؎ سولن۔ (۶۳۸ تا ۵۵۸ ق م) یونان کا مشہور مقنن اور فاضل تھا۔ اس نے لائیکرگس کی طرح اپنی سلطنت کے لیے ایک مجموعہ قوانین مرتب کیا تھا جس پر ملک میں مدت تک عمل درآمد ہوتا رہا۔

مصر کی تعریف کی ہے۔ کیوں کہ اس نے موسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا کہ :

"وہ مصریوں کے ہر طرح کے علم و ہنر میں کامل تھا۔ مصری ایک عجیب طرح کی موجد طبیعت رکھتے تھے اور ہر کام میں نئی نئی ایجادیں نکالتے تھے۔ انھوں [علمانے جوکہ] نے اپنی طبیعت کو مفید کاموں کی ایجاد کی طرف متوجہ کیا تھا۔ اور ان کے زمانے کے علماء جو کہ مرکری کہلاتے تھے، مصر کو عجیب عجیب ایجادوں سے معمور کر دیا تھا۔ انھوں نے کسی ایسی چیز سے جس سے طبیعت انسانی کی تکمیل ہوتی ہے یا جس سے آرام یا خوشی حاصل ہوتی ہے مصر کو محروم نہ رکھا تھا۔ ستاروں کی حرکات پر وہ لوگ سب سے پہلے مطلع ہوئے اور سب سے پہلے انھوں ہی نے علم ہندسہ ایجاد کیا۔ موجوداتِ عالم کے حالات اور خواص دریافت کرنے میں یہ لوگ بہت کوشش کرتے تھے۔

مصریوں نے فن عمارت اور رنگ آمیزی اور سنگ تراشی اور تمام فنون کو کمال پر پہونچایا تھا۔ جن لوگوں نے قواعدِ حکمت و حکومت کو خوب سمجھا۔ ان میں سب سے اول مصری تھے۔ اس قوم نے یہ بات سب سے پہلے دریافت کی کہ فنونِ قواعدِ سلطنت کا اصلی مطلب یہ ہے کہ اپنی زندگی مزے سے کٹے اور رعیت آباد رہے......"

مگر دین کے معاملات میں جس قدر مصری احمق تھے کوئی نہ تھا۔ ان کے ان بایں دعوائے تہذیب و شائستگی بتوں کی بہت کثرت تھی۔ ان کی تقسیم اور ان کے درجے جدا جدا تھے۔ ان بتوں میں اوسیرس اور اسس جن کو وہ چاند اور سورج تصور کرتے تھے بہت بڑے بت تھے۔ ان کی پرستش عموماً ہوتی تھی۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ ان میں سیاروں کی پرستش سے بت پرستی نے ظہور پایا۔

ان کے سوا بیل اور کتا اور بھیڑ اور بلی اور باز اور مگر اور لنگ لنگا بھی پرستش ہوتی تھی اور ان میں سے بعض جانور ایسے تھے کہ خاص خاص شہروں میں پوجے جاتے تھے اور یہ قصہ تھا کہ ایک قوم ایک جانور کو قبلہ و کعبہ سمجھ کر دیوتا کی طرح پوجتی تھی اور دوسری قوم اس کی صورت

سے نفرت کرتی تھی۔ ان جانوروں میں سانڈ اپیس نہایت ممتاز سمجھا جاتا تھا۔ اسس کے نام کے بڑے بڑے عالی شان مندر بنائے جاتے تھے اور اس کے مرجانے کے بعد بہ نسبت اس کے ایّامِ حیات کے عزّت و توقیر زیادہ ہوتی تھی۔ تمام مصر اس کے سوگ میں ماتم کرتا تھا اور اس کی تجہیز و تکفین اس دھوم دھام سے ہوتی تھی کہ اس پر مشکل سے یقین آتا ہے۔ ٹولیمی لیگس کے زمانہ میں جب ایک ایسا جانور ضعیف ہو کر مرا تو اس کے ساز و سامان میں معمولی اخراجات کے علاوہ ایک لاکھ بارہ ہزار پانچ سو روپیہ صرف ہوا تھا۔ جب اس کی تجہیز و تکفین سے فراغت ہوتی تھی تو اس کی جگہ دوسرے سانڈ کے مقرر کرنے کی فکر ہوتی تھی اور تمام مصر اس کی تلاش میں ۔جاتا تھا۔ اس سانڈ میں چند علامتیں ہونی ضرورتھیں جن کے سبب وہ اور سانڈوں سے ممتاز ہوتا تھا۔ پیشانی پر ہلال کی شکل، پشت پر عقاب کی صورت، زبان پر بھونری کا نقشہ ہونا ضرور تھا۔ اور جب قسمت سے ایسا سانڈ ہاتھ آجاتا تو تمام مصر میں گھر گھر خوشی ہوتی تھی اور ماتم جاتا رہتا تھا۔ جب شاہ کیمبس اتھوپیا کی مہم سے ناکام واپس آیا تو وہ ایسے دنوں میں مصر پر گزرا کہ مصری نئے سانڈ ایپس کے ملنے کی خوشی میں کھیل کود رہے تھے۔ یہ ناکام دل سوختہ اُن کو خوشیاں کرتا دیکھ کر یہ سمجھا کہ یہ لوگ میری ناکامی پر ہنستے ہیں۔ اس نے اس نئے سانڈ کو جس نے اپنی خدائی کا لطف بہت کم اُٹھایا تھا قتل کرادیا اور تمام مصریوں کو بن خدا کا کردیا۔ مصریوں نے صرف جانوروں کے آگے خوشبوئیں جلانے پر ہی اکتفا نہ کیا تھا بلکہ اپنے باغوں کے نباتات کو بھی دیوتا سمجھتے تھے۔

نہایت تعجب کی بات ہے کہ جو لوگ تمام دنیا سے فضل و ہنر میں فائق ہوں اور وہ آپ کو ایسا ہی سمجھتے بھی ہوں، وہ ایسی حماقت میں گرفتار ہو جائیں اور جھوٹے معبودوں کی پرستش میں، ایسے اندھا دھند پڑ جائیں کہ تھوڑی سی سمجھ والا بھی اسے پسند نہ کرے، جانوروں اور کیڑے مکوڑوں کا مندروں میں پوجنا اور کمال احتیاط سے ان کو پالنا اور ان کے قاتلوں سے قصاص لینا اور مرنے کے بعد ان جانوروں کو عطریات سے بھرنا اور بڑی دھوم دھام سے قبروں میں دفنانا اور رفتہ رفتہ پیاز اور لہسن کو بھی پوجنا اور آڑے وقتوں میں ان سے مدد

مانگنی اور ان پر بھروسا کرنا ایسی نادانی کی باتیں ہیں کہ اس زمانے میں ان پر مشکل سے یقین آتا ہے مگر اگلے لوگ ان سب باتوں پر گواہی دیتے چلے آئے ہیں۔ لوشین صاحب لکھتے ہیں:

"اگر تم کسی ایسے عالی شان مندر میں جاؤ جو سونے چاندی سے جگمگا رہا ہو اور چاند سورج اس کی ٹیپ ٹاپ کی تاب نہ لا سکیں تو تم کو اس مندر کے دیوتا کے دیکھنے کا بہت شوق ہوگا اور تم نہایت مشتاق ہو کر جب اندر جاؤ گے تو کیا دیکھو گے کہ لک لک یا بلّی یا بندر بڑی شان و شوکت اور تمام کر و فر سے وہاں جلوہ فرما ہیں"

خدا تعالیٰ نے بے شک اس بات کے دکھانے کو کہ انسان اگر اپنی عقل پر چھوڑ دیا جائے تو اس کا یہ روپ ہو جاتا ہے کہ اہلِ مصر جیسے لوگوں کو جنھوں نے عقل انسانی کو نہایت اعلیٰ درجے پر پہونچا دیا تھا، ایسی نفرت انگیز اور بیہودہ بت پرستی میں پھنسا رہنے دیا تاکہ لوگوں کی تماشگاہ بنیں۔

مصریوں کے علاوہ اہلِ یونان کا حال بھی اسی کے قریب قریب تھا اور یہ اس بات کا نہایت کامل ثبوت ہے کہ انسان کی عقل معاش کیسی ہی اعلیٰ درجے پر کیوں نہ پہنچ جائے مگر مبدأ و معاد کا علم حاصل کرنے میں ہرگز کافی نہیں ہو سکتی۔

"تاریخ یونان میں لکھا ہے کہ:

"جب ہائرو بادشاہ سسلی نے حکیم سائیمونیڈیز[1] سے باری تعالیٰ کی حقیقت دریافت کی تو اس نے پہلے روز ایک دن کی اور دوسرے روز دو دن کی مہلت چاہی۔ اور اسی طرح روزانہ مہلت مانگتا رہا۔ آخر ایک دن بادشاہ نے بار بار مہلت مانگنے کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ "یہ مضمون سمجھ اور فکر سے اس قدر بعید ہے کہ جس قدر اس میں غور کرتا ہوں، اسی قدر تحیر زیادہ

---

[1] حکیم سائیمونیڈیز یونان کا ایک نامور حکیم اور شاعر گزرا ہے۔ سنہ ۵۵۶ء قبل مسیح جزیرہ کیوسی میں پیدا ہوا۔

ہوتا ہے اور تاریکی چھائی جاتی ہے"

کنفیوشس[1] جو حکمائے چین کا سر گروہ اور اہل چین کا مقتدا ہے اور جس کی عقلیات کا مدار محض عقل و رائے پر ہے۔ جب اُس سے لوگوں نے آخرت کا حال پوچھا تو اس نے اس کا جواب دینے میں اپنی کمال دانائی اور انصاف ظاہر کیا۔ اس نے کہا کہ

"جب دنیا ہی کی ہزاروں چیزیں ہماری نظر سے مخفی ہیں تو وہاں تک ہماری عقل کیوں کر پہنچ سکتی ہے"

بہرحال اگر ہماری اس رائے سے جو اوپر بیان کی گئی (یا کسی اور دلیل سے) یہ بات ثابت ہو جائے کہ واقع میں ہمارا کوئی صانع ہے اور مرنے کے بعد ہم کو اپنی بُرائی بھلائی کا ثمرہ ضرور ملنے والا ہے تو بے شک ہم کو ان دونوں باتوں کا تفصیلی علم حاصل کرنے کے لیے اپنی عقل ناقص کے سوا کوئی اور ذریعہ ڈھونڈنا پڑے گا اور وہ ذریعہ نہیں ہے مگر وجود صاحب الہام۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی الْاِتْمَامِ •

---

[1] کنفیوشس (۵۵۱ تا ۴۷۸ ق م) ملک چین کا نہایت نامور حکیم اور ایک مدبر و خوش خلق ریفارمر تھا۔ اس کے پیرو اب تک چین و جاپان میں بے شمار ہیں۔

۴۔ زمانہ

"جب زمانہ بدلے تم بھی بدل جاؤ"

(از رسالہ تہذیب الاخلاق جلد ۲ نمبر ۱۵۔ بابت یکم ذی الحجہ ۱۲۸۸ھ صفحہ ۲۱۲ تا ۲۱۶)

زمانہ کی نیرنگیاں مشہور اور اس کی تلون مزاجیاں ضرب المثل ہیں۔ وہ سدا ایک حال پر نہیں رہتا۔ وہ ہمیشہ ایک چال پر نہیں چلتا وہ گرگٹ کی طرح برابر رنگ بدلتا رہتا ہے۔ وہ اس پتھر کی طرح جو پہاڑ کی چوٹی سے لڑھکا یا جائے۔ ہزاروں پلٹے کھاتا چلا جاتا ہے، وہ بہروپ بھرتا ہے، اس کے چہرے پر کھل جاتا ہے وہ جو ٹھاٹھ بدلتا ہے، اس کا رنگ ساری مجلس پر چھا جاتا ہے اور کبھی رات کی تاریکی میں، کبھی گرمی کی تپش میں اور کبھی جاڑے کی ٹھٹھر میں ظہور کرتا ہے پر کسی بھیس میں اس کا رنگ جمے بغیر نہیں رہتا۔ جب وہ دن کا بانا بدلتا ہے تو رات کے سارے عمل باطل کر دیتا ہے۔ سوتوں کو نیند سے جگاتا ہے نکموں کو کام پر لگاتا ہے۔ طبیعتوں سے سستی کو دور کرتا ہے اور دلوں کو امنگوں سے بھر دیتا ہے۔ جب رات کا برقع اوڑھتا ہے تو دن کی ساری کائنات حرف غلط کی طرح مٹا دیتا ہے۔ مزدوروں کا دل محنت سے اچاٹ کرتا ہے، جفاکشوں کو بستر راحت کی طرف کھینچ کر لاتا ہے اور ساری دنیا پر غفلت کا پردہ ڈال دیتا ہے۔ گرمی میں اس کی بازی کا نقشہ کچھ اور ہے اور جاڑے میں اس کی حکومت کا ڈھنگ کچھ اور۔

مبارک ہیں وہ جنھوں نے اس کے تیور پہچانے اور اس کی چال ڈھال کو نگاہ میں رکھا۔ جدھر کو وہ چلا اس کے ساتھ ہو لئے اور جدھر سے اس نے رخ پھیرا اس کے ساتھ

پھر گئے۔ گرمی میں گرمی کا سامان کیا، اور جاڑے میں جاڑے کی تیاری کی۔ دن کو دن کی طرح بسر کیا اور رات کو رات کی طرح کاٹا۔ اور بدنصیب ہیں وہ جنھوں نے اس کی پیروی سے جی چرایا، اور اس کی ہمراہی سے ناک چڑھائی۔ گرمی پڑنے پر انھوں نے جاڑے کے کپڑے نہ اُتارے اور ہلکے پھلکے نہ پہنے۔ دن نکلا پر انھوں نے کروٹ نہ بدلی اور خوابِ شبینہ سے بیدار نہ ہوئے۔ اور اب وہ بہت جلد دیکھیں گے کہ پیچھے کون رہا اور منزل تک کون پہنچا؟

جو لوگ زمانے کی پیروی نہیں کرتے وہ گویا زمانے کو اپنا پیرو بنانا چاہتے ہیں۔ مگر یہ ان کی سخت خام خیالی ہے۔ چند مچھلیاں دریا کے بہاؤ کو نہیں روک سکتیں اور چند چھاتیاں ہوا کا رُخ نہیں پھیر سکتیں۔ اسی لیے ایک پختہ کار شاعر نے کہا ہے ؎

زمانہ با تو نہ سازد تُو با زمانہ بساز

اور عرب کے ایک حکیم کا قول ہے کہ "دُرْ مع الدَّهرِ کیفَ مَا دارَ" (یعنی جدھر زمانہ پھرے اس کے ساتھ پھر جاؤ)۔ شیخ اکبرؒ[۱] فرماتے ہیں کہ "صر هيُولىٰ بكلّ صُوَرٍ" (یعنی اپنی ذات میں ایسی قابلیت پیدا کرو کہ جس رنگ کو چاہے فوراً قبول کر لے) یہ اس لیے فرمایا کہ زمانہ کبھی انقلاب سے خالی نہیں رہتا اور اس کا مقابلہ انسان ضعیف البنیان سے نہیں ہو سکتا۔ پس انسان میں ایسی قابلیت ہونی ضرور ہے کہ جیسی ضرورت دیکھے ویسا بن جائے تاکہ زمانے کا کوئی انقلاب اس کو کوئی سخت صدمہ نہ پہنچائے۔ آندھی کے پُر زور حملے انھیں تناور درختوں کو نقصان پہنچاتے ہیں جو اپنی جگہ سے ٹلنا نہیں چاہتے، پر چھوٹے چھوٹے لچک دار پودے جو ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ جھک جاتے ہیں، ہمیشہ برقرار رہتے ہیں۔

---

[۱] محی الدین ابن عربی ملقب بہ شیخ اکبر، فتوحاتِ مکیہ اور فصوص الحکم کے مصنف، بہت سے علوم بالخصوص تصوف اور فلسفہ کے زبردست عالم، اندلس کے شہر مرسیہ میں ۱۷ رمضان ۵۶۰ھ کو پیدا ہوئے۔ کثیر التصانیف، آزاد، نڈر اور نہایت صاف بیان شخص تھے۔ آپ نے ۶۳۸ھ میں بمقام دمشق رحلت کی اور میدان قاسیون میں دفن ہوئے۔

اس بات کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عارضی یا چند روزہ کامیابی مقتضائے وقت کی مخالفت میں بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ مگر جو لوگ دنیا میں اگر کامیابی کا پورا پورا استحقاق حاصل کر گئے، وہ وہی تھے جنھوں نے مقتضائے وقت کو ہاتھ سے نہ دیا اور جیسا زمانہ دیکھا ویسے بن گئے۔

حکیم اوحدالدین انوری[1] جس نے اپنے زمانے کے تمام علوم میں کامل دستگاہ حاصل کی تھی اور پھر عجم کے ان تین شاعروں میں شمار کیا گیا جو "پیمبر شعر" مانے گئے ہیں[2]۔ اگر وہ مقتضائے وقت کی پیروی نہ کرتا تو یہ شہرت اور عزت اس کو ہرگز حاصل نہ ہوتی۔ وہ خراسان کی ایک بستی زاکان نامی میں ٹھہرا ہوا تھا کہ اتفاق سے اس عہد کے ملک الشعرا ابوالفرج سنجری کا لشکر بھی وہیں آکر ٹھہرا۔ انوری نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ سارا جلوس سنجری کے ساتھ ہے کہا: "سبحان اللہ علم کا مرتبہ ایسا بلند اور میں اس قدر مفلس، میں ایسا ذلیل اور اس شخص کو یہ جاہ و حشمت! اب مجھ کو بھی قسم ہے جو شاعر ہی بن کر نہ دکھاؤں۔" چنانچہ اسی رات کو ایک قصیدہ سلطان سنجر[3] کی مدح میں لکھ کر تمام کیا۔ جس کا مطلع یہ ہے:

---

[1] انوری فارسی زبان کا اعلیٰ درجہ کا شاعر، بڑا حکیم اور فلسفی تھا۔ اہل سخن اسے پیغمبر سخن مانتے ہیں۔ اس کو نجوم کا بھی دعویٰ تھا جس کی بدولت بڑی بڑی تکلیفیں اٹھائیں۔ سلطان سنجر کے دربار سے بھاگ کر بلخ چلا گیا۔ بلخ والوں سے ناراض ہو کر بلخ اور اہل بلخ کی ہجو میں ایک قصیدہ لکھا اس پر لوگوں نے ناراض ہو کر ۵۸۳ھ میں قتل کر ڈالا۔

[2] اس فقرے میں اس مشہور و معروف رباعی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ؎

در شعر سہ کس پیمبر انند　　ہر چند کہ لا نبی بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را　　فردوسی و انوری و سعدی

[3] سلطان سنجر فارس کا نہایت مشہور اور علم دوست بادشاہ تھا۔ ۴۹۰ھ میں تخت پر بیٹھا ۱۱۵۳ء میں ترکمانوں پر حملہ کیا۔ وہاں گرفتار ہو گیا۔ چار سال تک ان کی قید میں رہا۔ اس کی غیر حاضری میں اس کی بیوی سلطانہ خاتون نہایت قابلیت اور خوبی کے ساتھ حکومت کرتی رہی۔ سنجر آخر قید سے فرار ہوا اور تھوڑے ہی دن حکومت کرنے پایا تھا کہ ۱۱۵۷ء میں پیغام اجل آ گیا۔

گر دل و دست بحر و کاں باشد — دل و دست خدایگاں باشد

پھر تمام عمر شاعری کی بدولت خوش حال اور فارغ البال رہا اور دنیا میں شہرت اور بلند نامی حاصل کی۔

ایک مجلس میں شیخ ابو الفضل[1] کے کمالات اور ترقیات کا مذکور تھا۔ ایک صاحب بولے "وہ باایں ہمہ کمالات اگر اس زمانہ (یعنی انیسویں صدی) میں ہوتا تو شاید عدالتوں میں عرضی نویسی کر کے اپنا پیٹ پالتا"۔ ہم نے کہا "اگر وہ اس زمانے میں ہوتا تو ہرگز اپنی کامیابی کا ذریعہ اس لیاقت کو نہ گردانتا جس کی بدولت سولھویں صدی عیسوی میں ترقیات حاصل کی تھیں بلکہ اس عہد میں وہ کم سے کم ایم۔ اے یا ایل۔ ایل۔ ڈی کا درجہ ضرور حاصل کرتا اور کچھ نہیں تو لندن کے کسی نامی گرامی اخبار کا کارسپانڈنٹ (نامہ نگار) ضرور رہتا"۔ یہ ہمارا ایک سرسری جواب تھا جو اس وقت بلا تامل زبان سے نکل گیا۔ مگر اب غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جواب بالکل صحیح تھا۔ ابو الفضل کی ذات میں ہر زمانے کا رنگ بدلنے کی ایسی قابلیت تھی کہ وہ جس زمانے میں ہوتا اس زمانے کی حیثیت کے موافق ضرور اپنے ہم چشموں میں ممتاز ہوتا۔ وہ ایک رقعے میں جو غالباً اس نے اپنے باپ کے نام لکھا ہے تحریر کرتا ہے کہ "بعض لوگ میری نسبت یہ کہتے ہیں کہ ایک طالب علم کو اس قدر منصب جلیل تک پہنچا دینا بادشاہ کو زیبا نہ تھا۔ اس لیے اب میری بھی یہی تمنا ہے کہ سپہ گری کا کوئی کارِ نمایاں دکھاؤں"۔ اس کا یہ قول نرا دعویٰ ہی دعویٰ نہ تھا بلکہ اس نے مرتے وقت نرسنگھ دیو بندیلے[2] کے

---

[1] شیخ ابو الفضل نہایت فاضل، بڑا ادیب اور شہنشاہ اکبر کا وزیرِ اعظم تھا۔ آئینِ اکبری اور اکبر نامہ اس کی مشہور تصانیف ہیں۔ فیضی کا بھائی اور شیخ مبارک کا بیٹا تھا۔ ۹۵۸ھ میں پیدا ہوا اور صرف ۲۳ سال کی عمر میں وزیرِ اعظم بن گیا۔ جہانگیر کے اشارے سے نرسنگھ دیو نے ۱۰۱۱ھ میں قتل کیا۔

[2] نرسنگھ دیو بندیلہ دکن کا ایک لٹیرا اور قزاق تھا۔ جب بادشاہ نے ابو الفضل کو دکن کی مہم پر بھیجا تو اسی نرسنگھ دیو نے شہزادہ سلیم کی تحریک سے ابو الفضل پر اس مہم کی واپسی پر اجین کے قریب حملہ کیا۔ ابو الفضل کمال شجاعت اور بہادری سے لڑا لیکن مارا گیا۔

مقابلے میں اپنی قابلیت کا جوہر سب پر ظاہر کر دیا۔ مقابلے کے وقت اس کے اکثر ہمراہی بھاگ گئے تھے اور چند آدمی جو بچے تھے وہ اس کو یہ صلاح دے رہے تھے کہ اس تھوڑی سی جمعیت پر بندیلے کا مقابلہ کرنا مصلحت نہیں۔ مگر وہ نہایت ترشی سے یہ کہہ کر کہ "نگر گریزم" اکیلا فوج مخالف میں جا گھسا۔ لیکن چوں کہ پیمانۂ عمر لبریز ہو چکا تھا گھوڑا ٹھوکر کھا کر گرا اور اس کے گرتے ہی مخالفوں نے شیخ کا کام تمام کر دیا۔

سلطان شہاب[۵] الدین غوری کو مورخوں نے بہت سخت اور تند مزاج لکھا ہے اور اس کے ثبوت کے لیے اس کی وہ زیادتی پیش کرتے ہیں جو فتح جمیر کے بعد اس سے ظہور میں آئی یعنی کئی ہزار آدمی جو فتح کے بعد بچ رہے تھے ان سب کو تیغ بے دریغ کے حوالے کیا۔ مگر باوجود اس کے اس کی سختی اور تند مزاجی کو اس سبب سے مذموم نہیں سمجھا کہ جس فتنہ و فساد کے زمانے میں وہ متسلط ہوا تھا اس کے لیے ایسے ہی مزاج کا بادشاہ ہونا سزاوار تھا۔

جس طرح دنیا کی بہبودی کا مدار مقتضائے وقت کی موافقت پر ہے اسی طرح دین کی کامیابی بھی اسی پر موقوف ہے۔ کتاب مقدس (توریت) میں خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بڑی تعریف اس بات پر کی ہے کہ وہ مصریوں کے تمام علوم میں کامل تھے۔ اس سے ثابت ہوا کہ نبوت جیسا جلیل القدر منصب بھی اس شخص کو عطا ہوتا ہے جس میں

---

۵ شہاب الدین غوری۔ افغانستان کے پہاڑی علاقہ غور کا حاکم، ہندوستان میں سلطنت اسلامیہ کی بنیاد ڈالنے والا اور نہایت اولوالعزم اور باہمت بادشاہ تھا۔ اس نے ۱۲۰۶ء تک حکومت کی ہے۔ ہندوستان پر پہلے حملے میں پرتھی راج والی دہلی اور اجمیر سے شکست کھا کر واپس لوٹ گیا مگر تیسرے سال ۱۱۹۳ء میں پرتھی راج کو تھانیسر کے مقام پر بڑی سخت شکست دی جس میں تقریباً ایک سو پچاس راجہ پرتھی راج کی امداد کو اپنی اپنی فوجیں لے کر آئے تھے۔ اس فتح سے تمام شمالی ہندوستان قبضے میں آ گیا۔ واپسی پر شہاب الدین نے اپنے غلام قطب الدین نامی کو ہندوستان کا بادشاہ کر کے چھوڑ گیا جس کی اولاد نے مدتوں یہاں سلطنت کی ہے۔

زمانۂ حال کے حسب حال ہونے کی پوری پوری قابلیت ہوتی ہے۔

ہمارے نبی برحق علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے جو دعوت اسلام میں نمایاں کامیابی حاصل کی اُس کا بڑا ذریعہ عبارات قرآنی کی حلاوت اور ملاحت تھی جس کا مدار بالکل مقتضائے وقت کی موافقت پر تھا۔ کیوں کہ اس وقت شعروشاعری کے شور سے تمام عرب گونج رہا تھا۔ اور فصاحت و بلاغت کے دعوے نہایت توجہ سے سُنے جاتے تھے، کوئی کمالِ علم ادب کے ہم پلّہ نہ سمجھا جاتا تھا اور کوئی ہتھیار تیغ زبان کے برابر کارگر نہ ہوتا تھا۔

آں حضرت صلعم کے بعد پہلی اور دوسری خلافت میں جو اسلام کو ترقی روز افزوں نصیب ہوئی اور کوئی فتنہ ایسا حادث نہ ہوا جو اس کے زورِ طاقت کی مزاحمت کرتا اس کا اصلی سبب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ منصب خلافت کے لیے آگے پیچھے ایسے دو شخص انتخاب کیے گئے جن کا چلن اور برتاؤ بالکل مقتضائے وقت کے موافق تھا اور اس سبب سے زمانہ ان کا معین و مددگار بن گیا۔ چنانچہ اسی مصلحت کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مرتضویؓ کے استخلاف کی نسبت وَاِنْ تَوَلَّوْا عَلِیًّا فرمایا اور شیخین² کی نسبت کچھ تردد ظاہر نہ فرمایا۔

عمر فاروقؓ³ کی شدت چوں کہ مقتضائے وقت کے موافق تھی۔ اس لیے مزرعۂ اسلام

---

1 یعنی میں تمھیں کرنے والا نہیں دیکھتا۔

2 شیخین سے مراد حضرت ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ ہیں۔

3 عمر فاروقؓ صدیق اکبرؓ کے جانشین، اسلام کے دوسرے خلیفہ، آپ کے عہد مبارک میں تمام عراق، شام، ایران مسلمانوں کے قبضے میں آئے اور اسلام کو وہ شوکت حاصل ہوئی جس کی نظیر مستقبل میں پھر نہ مل سکی۔ ساڑھے دس سال خلافت کرنے کے بعد صبح کی نماز پڑھتے ہوئے ایک غلام کے ہاتھ سے شہید ہوئے۔ آپ نے ۱۳ھ (۶۳۴ء) سے ۲۳ھ (۶۴۴ء) تک خلافت کی۔ آپ کا بے نظیر عدل، انتہا درجے کی سادگی، خوش انتظامی مشہور و معروف ہے۔

کے حق میں ابرِ رحمت کا کام کر گئی اور عثمان[لہ] ذی النورین رضی کی مروت جو انھوں نے مروان[ٹہ] بن الحکم وغیرہ کے ساتھ برتی۔ چونکہ وہ مقتضائے وقت کے مطابق نہ تھی اس لیے فتنۂ عظیم کی اصل قرار دی گئی جو آپ رضی کے آخر عہد خلافت میں رونما ہوا، اور جس کا نتیجہ آپ کی شہادت تھا۔

ایک زمانے میں مقتضائے وقت یہ تھا کہ محدثین اسلام اسی خیال سے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات تمام و کمال فراہم ہو جائیں، روایات کے اخذ کرنے میں رطب و یابس کی کچھ تمیز نہ کرتے تھے۔ پھر دوسرے زمانے کا مقتضا یہ ہوا کہ ان روایتوں کی تنقید اور ان کے راویوں کی چھان بین کی جائے اور صحیح کو سقیم سے، قوی کو ضعیف سے، معروف کو منکر سے اور ثابت کو موضوع سے جدا کیا جائے۔ اگر وہ پہلا طبقہ مقتضائے وقت کا لحاظ نہ کرتا تو علم نبیؐ کا ایک بڑا حصہ ضائع ہو جاتا۔ اور اگر یہ دوسرا گروہ بیکار رہتا تو حق و باطل اور صدق و کذب کا امتیاز دشوار ہو جاتا۔

بڑی دلیل اس بات کی کہ مقتضائے وقت کا لحاظ ضروریات دین سے ہے وہ

لہ عثمان رضی ذی النورین اسلام کے تیسرے خلیفہ ہیں۔ فارس کے اکثر شہر و شام و روم کا علاقہ اور شمالی افریقہ کے بعض ممالک آپ کے عہد میں اسلامی حکومت میں شامل ہوئے۔ نہایت رحم دل، رقیق القلب اور منکسر المزاج تھے۔ ۱۲ سال خلافت کرنے کے بعد ۷۵ سال کی عمر میں شہید ہوئے۔ آپ نے سنہ۲۴ھ (۶۴۴ء) سے سنہ۳۵ھ (۶۵۶ء) تک خلافت کی ہے

ٹہ مروان بن الحکم۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حقیقی عم زاد بھائی اور بڑا عیار شخص تھا اسی کی شرارتیں اور چالاکیاں حضرت خلیفۂ ثالث رضی کی مظلومانہ شہادت کا باعث ہوئیں۔ بنی امیہ کی حکومت قائم ہونے پر اپنی ہوشیاری سے معاویہ ثانی کی وفات کے بعد سنہ۶۴ھ (سنہ۶۸۴ء) میں تمام دنیائے اسلام کا بادشاہ ہو گیا۔ مگر صرف ۲۹۰ دن حکومت کرنے پایا تھا کہ اسی کی بیوی زینب نے ۲ رمضان سنہ۶۵ھ مطابق ۱۲ اپریل سنہ۶۸۵ء کو اسے زہر دے کر مار ڈالا۔

روایت ہے جس کو مسلم[1] نے ابوہریرہؓ[2] سے روایت کیا ہے۔ اس روایت کا ماحصل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا کہ:

''جو شخص صدق دل سے۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کہے گا وہ ضرور بخشا جائے گا''

عمر فاروقؓ یہ سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ''اس بشارت سے لوگ اعمال صالحہ کی بجا آوری میں قصور کریں گے۔'' آپ نے فاروق اعظمؓ کی اس رائے کو پسند فرمایا اور نادقتیکہ روایات کی تدوین کرنے کی ضرورت نہ پڑی یہ خوشخبری تمام امت میں عام نہ ہوئی۔

الغرض دنیا کی بہبودی یا دین کی کامیابی مقتضائے وقت کی موافقت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔

مگر اس موافقت سے ہماری یہ مراد ہرگز نہیں کہ مثلاً بے دینی اور الحاد کے زمانے میں دین و مذہب سے ہاتھ اٹھا بیٹھیں اور عیش و عشرت کے زمانے میں جفاکشی اور محنت سے دست بردار ہو جائیں، یا جہاں خوشامد کا بازار گرم ہو وہاں خوشامدی بن جائیں اور جہاں مسخرہ پن کا دور دورہ ہو وہاں غیرت اور حمیت کو بالائے طاق رکھ دیں نہیں بلکہ ہماری رائے میں کوئی بُرے سے بُرا زمانہ ایسا نہیں ہوتا جس میں مقتضائے وقت کے موافق کوئی نہ کوئی جائز طریقہ کامیابی موجود نہ ہو۔

جب فلسفہ یونانیہ یونانی زبان سے عربی زبان میں منتقل ہوا اور بطلیموس[3] اور . . . .

---

[1] مسلم۔ امام مسلم بن حجاج نیشاپوری بہت بڑے محدث اور امام المحدثین حضرت امام بخاری کے خاص اور ممتاز شاگردوں میں سے تھے۔ صحاح ستہ کی کتابوں میں صحیح بخاری کے بعد آپ کی کتاب کا درجہ ہے، جو عام طور پر صحیح مسلم کے نام سے مشہور ہے ۲۰۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۶۱ھ میں انتقال فرمایا۔

[2] ابوہریرہؓ حضور صلعم کے بڑے پایہ کے صحابیوں میں سے تھے۔ ۵۸ھ میں وفات پائی۔

[3] بطلیموس۔ مصر کا ایک مشہور مہندس علم نجوم و ہندسہ کا ماہر، پہلا جغرافیہ داں اور ہیئت کی مشہور کتاب ''مجسطی'' کا مصنف ہے۔ اسی نے پہلے کرۂ ارض کا نقشہ بنایا اور نظام شمسی کی تحقیقات کیں۔ ۷۰ برس کی عمر میں ۲۴۳ قبل مسیح وفات پائی۔

ارسطوؔ کے خیالات عرب اور عجم کے گلی کوچوں میں منتشر ہو گئے تو الحاد اور بے دینی نے لوگوں کے دلوں میں چٹکیاں لینی شروع کیں۔ یہاں تک کہ نصوص قرآنی اور احادیث نبوی پر دھڑادھڑ اعتراض ہونے لگے اور جا بجا دین میں رخنے ڈالنے لگے۔ اس وقت علمار کے فروغ اور کامیابی کے دو طریقے پائے جاتے تھے۔ ایک ناجائز دوسرا جائز۔

ناجائز طریقہ یہ تھا کہ مسائل فلسفہ کی تائید کر کے الحاد کی آگ کو اور مشتعل کر دیتے اور آزادی جیسی من بھاتی چیز کو دنیا میں پھیلا کر دنیوی فروغ حاصل کرتے۔

جائز ذریعہ یہ تھا کہ شریعت اور حکمت میں تطبیق یا مسائل حکمیہ کی تغلیط کر کے الحاد کی آنچ سے دین کو بچاتے اور معترضوں کی زبان بند کرتے۔

چنانچہ علمائے اسلام نے شکر اللہ سعیہم یہی جائز طریقہ اختیار کیا اور فلسفہ یونانیہ کے مقابلے میں ایک جدید فلسفہ قائم کیا جو اب اسلام میں علم کلام کے نام سے مشہور ہے۔

جلال الدین اکبر کا زمانہ (جیسا کہ اکثر مورخوں نے لکھا ہے) ظاہرا بے دینی اور الحاد کا زمانہ ثابت ہوتا ہے اور اس سبب سے ممکن ہے کہ بہت سے لوگوں کی کامیابی کا ذریعہ یہی بے دینی اور الحاد ہو مگر تاریخ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے عہد میں کامیابی کا بڑا ذریعہ شجاعت و بہادری یا فضل و کمال اور علم و ہنر تھا کیونکہ اس کے درباریوں اور مقربوں میں کوئی آدمی ایسا نہیں معلوم ہوتا جس نے بغیر کسی کمال یا ہنر کے محض بے دینی اور الحاد کے ذریعے سے معتد بہ امتیاز حاصل کیا ہو بلکہ اس کے ارکان دولت میں ایسے آدمی پائے جاتے ہیں جو اپنے مذہبی قواعد کے نہایت پابند تھے اور جنھوں نے

لہ ارسطو۔ معروف بہ ارسطاطالیس حکمائے یونان کا سرکردہ، شہنشاہ سکندر اعظم کا استاد اور افلاطون کا شاگرد تھا۔ صرف و نحو، ادب، معانی، علم الاخلاق، سیاست مدن، طبعیات، نامیات، اور ریاضیات کا زبردست عالم تھا۔ اہل علم میں "معلم اول" کے نام سے مشہور ہے ۳۸۴ ق م پیدا ہوا اور ۳۲۲ ق م وفات پائی۔

اپنے فضل و کمال کی بدولت بادشاہ کے دل میں جگہ پائی تھی جیسے ملا فتح اللہ شیرازی[1] مسلمانوں اور راجہ ٹوڈرمل[2] ہندوؤں میں یہ دونوں شخص اکبری دور میں مذہب کے نہایت متعصب گنے جاتے تھے۔ بایں ہمہ ملا نے اپنے علوم عقلیہ ونقلیہ کے سبب اور راجہ نے حساب سیاق کی مہارت سے باوانش مندی اور حسن تدبیر کی جہت سے دربار شاہی میں جو مرتبہ حاصل کیا وہ سب پر روشن و ہویدا ہے۔

بہر حال، جہاں کامیابی کے دو جائز ناجائز طریقے پائے جاتے ہیں وہاں کوئی نہ کوئی جائز طریقہ بھی ضرور موجود ہوتا ہے اور جو کامیابی ان ناجائز طریقوں سے حاصل ہوتی ہے، وہ اس کامیابی کے برابر کبھی پائدار اور مستحکم نہیں ہوتی جو جائز طریقہ سے حاصل ہوتی ہے۔ ہم نے بارہا تجربہ کیا ہے کہ جن درباروں میں مثلاً خوشامد کا بازار گرم تھا اور جہاں حاکم کی مرضی کے خلاف بولنا جرائم کبیرہ کے ارتکاب سے زیادہ خطرناک سمجھا جاتا تھا جب وہاں کوئی سچا اور آزاد طبیعت کا آدمی پہنچا تو اگرچہ اس کو چند روز اپنی آزاد طبیعت کی کسی قدر روک تھام کرنی پڑی، لیکن آخر اس کی راستی اپنا رنگ جمائے بغیر نہ رہی، رفتہ رفتہ اسی کا قول معتبر ٹھہرا اور اسی کی صلاح نیک سمجھی گئی۔

ان تمام شہادتوں سے ہم بآسانی یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ہندوستان کی اکثر قومیں جو روز بروز اقبال مند ہوتی جاتی ہیں، اور مسلمانوں کی قوم بد اقبالی کے بھنور اور

---

[1] ملا فتح اللہ شیرازی۔ دربار اکبری کا نہایت گراں پایہ عالم اور مقتدر رئیس تھا۔ باوجود تقدس مذہبی کے علوم عقلیہ مثلاً ہیئت و ہندسہ، نجوم، رمل، حساب، طلسمات، نیرنجات خوب جانتا تھا۔ خصوصاً علم ہیئت میں نہایت کامل تھا اور علوم عربیہ حدیث، تفسیر اور علم کلام سے بھی خوب واقف تھا۔ کشمیر میں ۹۹۷ھ (۱۵۸۹ء) میں وفات پائی۔

[2] ٹوڈرمل۔ عہد اکبر کا بہت بڑا محاسب اور قانون مال گزاری کا مدون۔ اکبر اس سے بہت خوش تھا، اور اس کو اپنے بہترین رفیقوں میں سمجھتا تھا۔ ۱۵۸۹ء عیسوی میں وفات پائی۔

ذلّت کی دلدل سے کسی طرح نہیں نکلتی۔ اس کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں کہ اور لوگ اپنی حالت کو زمانے کے موافق بناتے جاتے ہیں۔ لیکن مسلمان اپنی وضعداری کو ہاتھ سے نہیں دیتے۔

اے ہندوستان کے مسلمانو! کیا تم ابھی اسی عالم میں ہو جس میں تمہارے آبا و اجداد زندگی بسر کر گئے ہیں؟ اور کیا تم اسی کھیتی کے پروان چڑھنے کے منتظر ہو جس میں تمہارے بزرگوں نے تخم افشانی کی تھی؟ مدت ہوئی کہ وہ عالم گذر گیا اور وہ کھیتی دریا برد ہو گئی۔ ذرا آنکھیں کھولو اور دیکھو کہ تم کون ہو؟ اور کہاں ہو؟ تمہاری گرہ میں جو دام ہیں وہ بازار میں آج پھوٹی کوڑی کو نہیں چلتے۔ تمہاری دکان میں جو مال ہے، اسے کوئی مفت بھی لینا نہیں چاہتا۔ تمہارے چراغ میں جو تیل تھا وہ جل گیا اور تمہاری کھیتی میں جو پانی تھا وہ سوکھ گیا۔
دیکھو! تمہاری ناؤ بودی ہے اور دریا دم بہ دم چڑھتا جاتا ہے تمہارا قافلہ پیادہ پا ہے اور منزلیں کٹھن آتی جاتی ہیں۔

اس تمہید سے ناظرین کو ضرور یہ خیال پیدا ہو گا کہ ہم آگے چل کر اپنی قوم کو انگریزی پڑھنے، میز کرسی لگانے، کوٹ پتلون پہننے اور چھری کانٹے سے کھانے کی ترغیب دیں گے۔ کیوں کہ بظاہر زمانہ حال کا مقتضا یہی معلوم ہوتا ہے۔ مگر ان کو یاد رہے کہ ہماری مراد اس تمہید سے یہ ہرگز نہیں ہے بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ جس بری حالت میں ہیں اس سے نکلنے کی جو سیدھی راہ انھیں نظر آئے اسی راہ کو اختیار کریں اور جس طرح ہو سکے اپنا قدم آگے بڑھائیں کیوں کہ زمانہ بآواز بلند کہہ رہا ہے:
من استوی یوماہ فھو مغبون یعنی جس کے دو دن ایک حالت پر گزریں وہ خسارے میں رہا اور در و دیوار سے یہ صدا آ رہی ہے کہ ع

اقدم آگے بڑھاؤ ورنہ لو راہِ عدم

دنیا میں آج کل ایک گھوڑ دوڑ کا تماشہ ہو رہا ہے، ہر گروہ کے شہسوار جوق در جوق اس میں آتے ہیں اور اپنے اپنے ہنر دکھاتے جاتے ہیں کچھ ان میں سے گھبرا دم

آتے ہی برقِ خاطف کی طرح ایک آنِ واحد میں گزر گئے، کچھ ان سے پیچھے پیچھے، کچھ راہ میں ہیں، افتاں و خیزاں چلے جاتے ہیں۔ کتنوں نے ابھی اپنے گھوڑوں کی باگ تھامی ہے۔ کتنے چلنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ لیکن بہتوں کو ابھی گھوڑ دوڑ کی خبر بھی نہیں پہنچی۔ ان کے گھوڑے تھان پر بندھے ہیں، اور خود آرام سے پڑے سوتے ہیں شاید وہ اس وقت بیدار ہوں گے، جب گھوڑ دوڑ کا وقت نکل جائے گا اور وہ ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔ اے مسلمانو! ہم کو خوف ہے کہ وہ ناکام گروہ کہیں تمھاری ہی قوم نہ ہو! اور وہ ہاتھ جو حسرت سے ملے جائیں گے تمھارے ہی ہاتھ نہ ہوں۔

اے مسلمانو! تم کو یہ بھی معلوم ہے کہ جو شے تم کو ابھرنے نہیں دیتی وہ کیا ہے؟ اور جس کے سبب تم جنبش نہیں کر سکتے، وہ کون سی بندش ہے؟

یاد رکھو وہ تمھاری بے ہودہ تقلید ہے جس نے تم کو مذہبی امور ہی میں مجبور اور بے اختیار نہیں کیا، بلکہ تجارت میں، زراعت میں، علم و ہنر میں، حرفے اور پیشے میں، غرض ہر کام میں تمھاری عقلوں پر پردہ اور تمھاری ہر راہ میں تمھارے پاؤں میں بیڑی ڈال رکھی ہے اور تم کو اس پرند جانور کی مانند بے بس کر رکھا ہے جس کے پر کٹے ہوں اور آنکھیں سی ہوئی ہوں۔ نہ تم میں طاقتِ پرواز ہے نہ نگاہ دُوربیں۔ تقلید نے تم کو تمام دینی اور دُنیوی ترقیوں سے فارغ البال کر رکھا ہے۔ اور تمھارے کان میں یہ پھونک دیا ہے کہ جو کچھ کرنا تھا سو اگلے کر گئے، اب اس سے زیادہ کرنا غیر ممکن ہے، تمھارے نزدیک جس قطع کی کشتی طوفانِ نوحؑ میں بنائی گئی تھی، اس سے بہتر کوئی وضع انسان کے ذہن میں نہیں آسکتی۔ اور جو حیلہ آج سے ہزار برس پہلے تمھارے بزرگوں نے اختیار کیا تھا، اس کے سوا کسی حیلے سے تم روٹی نہیں کما سکتے، تمھارے نزدیک تمام عقلِ انسانی پہلے طبقوں پر تقسیم ہو گئی اور انھوں نے تمھارے لیے کوئی موقع نہ چھوڑا، جس میں تم کو اپنی انسانیت سے کچھ کام لینے کی ضرورت پڑے۔ شیخ[1] نے قانون میں

---

[1] شیخ الرئیس، بوعلی حسین بن علی بن سینا۔ حکمائے اسلام میں بڑا حاذق طبیب اور بے نظیر فاضل گزرا ہے۔ ۳۰ صفر ۳۷۰ھ کو پیدا ہوا اور ۴۲۸ھ میں وفات پائی۔

بدن انسان کی تشریح جو لکھ دی سو لکھ دی، محمد حسین دکنی برہانِ قاطع میں لغاتِ فارسی کی تحقیق کر گیا سو کر گیا، اب کون ہے جو قانون سے بڑھ کر لکھ سکے یا برہان میں کوئی عیب نکال سکے۔ تم صرف انھیں لوگوں کی تقلید نہیں کرتے جن کے ساتھ تم کو حُسنِ عقیدت ہے بلکہ طب میں جالینوس کی منطق میں ارسطو کی ہندوستان کی رسموں میں ہندوؤں کی تقلید کو بھی اسی قدر ضروری جانتے ہو جس قدر مذہب میں امام[۵] اعظم کی تقلید تمہارے نزدیک واجب و لازم ہے۔ اگر کسی کو اسی بات میں تامل ہو تو نکاحِ بیوگان کے معاملہ میں غور کرے اور دیکھے کہ اس کا مجوز کون ہے اور مانع کون؟ اور ہندوستان کے عام مسلمانوں نے مجوز حکم کی تعمیل کی ہے یا مانع کا کہنا مانا ہے۔

اسی تقلید کی بدولت تم میں ایک اور مرض پیدا ہو گیا ہے جس نے تمہاری رہی سہی ہمت خاک میں ملا دی ہے اور تم کو بالکل اپاہج کر دیا ہے۔ پوچھو وہ کیا ہے؟ وہ خانہ خراب وضعداری ہے، جس کی ہدایت سے تم ترقی کرنے والوں کو متلون مزاج سمجھتے ہو اور ڈھور ڈنگروں کی طرح سدا ایک حالت پر رہنے کو کمالِ نفسِ انسانی قرار دیتے ہو۔

ہندوستان کے وضعداروں کی یہ رائے ہے کہ آدمی اپنی زندگی میں جو طریقہ یا جو حالت اختیار کرے، اس کو آخر عمر تک ترک نہیں کرنا چاہئے۔ جوانی میں اگر داڑھی چڑھانے کی عادت ہو جائے تو سنِ شیخوخت تک اس وضع کو نباہنا ضرور ہے، اور بچپن میں اگر کامدار ٹوپی پہننے کا چسکا پڑ جائے تو بڑھاپے کے ٹھیرانے

۵؎ امام اعظم:۔ نعمان بن ثابت نام، ابو حنیفہ کنیت اور امام اعظم لقب ہے ۸۰ھ میں پیدا ہوئے۔ سنت والجماعت کے امام، بہت بڑے فقیہہ مجتہد اور محقق شریعت تھے۔ خلیفۂ وقت نے باوجود اصرار کے عہدۂ قضا قبول نہ کرنے کی وجہ سے قید کر دیا تھا اور وہیں ۱۵۰ھ میں خفیہ طور پر زہر دے کر اس آفتابِ علم کا خاتمہ کر دیا۔

ہوئے پہرے کو بھی اس سے محروم نہیں رکھنا چاہیے۔

چناں چہ معتبر راویوں سے سُنا گیا ہے کہ دو بزرگوار نجف خانی جن کا سن شریف ساٹھ پینسٹھ سے متجاوز ہو گیا تھا اور نہایت متقی اور متورع آدمی تھے۔ ہر جمعہ کو شاہ عبدالعزیز[1] صاحبؒ کے درس میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ شاہ صاحب بھی ان کی کمال تعظیم کرتے تھے۔ بایں ہمہ تقدس دونوں حضرات داڑھی گھٹواتے تھے۔ بعضے منہ پھٹ آدمیوں نے جو ان پر اعتراض کیا تو یہ فرمایا کہ ہم خود اس حرکت سے منفعل ہیں، مگر کیا کریں جو وضع قدیم سے چلی آتی ہے اس کے خلاف کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔

اسی طرح ایک شریفوں کی بستی میں ایک صاحب سن رسیدہ بڑے نمازی اور پرہیزگار تھے، مگر عشاء کی نماز کبھی نہ پڑھتے تھے۔ لوگوں نے سبب پوچھا تو فرمایا کہ بچپن میں تو اس سبب سے نہ پڑھی کہ کھاتے ہی شام سے سو رہتے تھے۔ جوانی میں لہو و لعب مانع رہا۔ اب بڑھاپے میں نئی بات کرتے ہوئے جی ہچکچاتا ہے۔

خیر ہم اپنے قدماء کی اس رائے پر اعتراض نہیں کرتے، کیوں کہ اس وقت زمانے کا مقتضا یہی تھا۔ سلطنت مغلیہ پر زوال آچکا تھا۔ ترقی کی راہیں فتنہ و فساد کے سبب چاروں طرف سے مسدود تھیں۔ طبیعتوں پر مایوسی اور افسردگی چھائی ہوئی تھی، ایسے وقت میں تنزل کے جس قدر آثار مسلمانوں میں پائے جاتے تھوڑے تھے۔ مگر ہم کو اپنے معاصرین کے حال پر بے اختیار رونا آتا ہے جو اس امن و آزادی کے زمانے میں بھی وضعداری کے حصار سے باہر نہیں نکلتے اور مقتضائے وقت کو نہیں دیکھتے۔ نہ آپ ترقی کرنا چاہتے ہیں، اور نہ اوروں کی ترقی کو پسند کرتے ہیں۔ جو شخص اپنی پست حالت سے نکل کر اچھی حالت میں آنا چاہتا ہے، اس کو نرا متلون مزاج یا بے استقلال ہی نہیں بتاتے بلکہ اس پر الحاد

---

[1] شاہ عبدالعزیزؒ :- ہندوستان کے قابل فخر اور مایہ ناز محدث حضرت شاہ ولی اللہؒ کے نامور فرزند اور نہایت قابل اور عالم باعمل بزرگ تھے، تفسیر فتح العزیز۔ تحفۂ اثنا عشریہ اور الشہادتین ملک کی مشہور کتابیں ہیں۔ ۱۱۵۹ھ (۱۷۴۶ء) میں پیدا ہوئے اور ۱۲۳۹ھ (۱۸۲۴ء) میں انتقال فرمایا

واقسام کی رائے لگاتے ہیں ۔ جن میں سب سے ہلکا الحاد کا فتویٰ ہے ۔

شائستہ ملکوں میں آج کل ترقی کی یہ صورت ہے کہ جو شخص پانچ سات برس کہیں پردیس میں رہ آتا ہے، وہ اس قابل نہیں رہتا کہ وطن میں پہنچ کر اسی وقت وہاں کی عام مجلسوں میں شریک ہو جائے ۔ جتنے دنوں وہ باہر رہتا ہے اتنی مدت میں وہاں اس قدر ترقی ہو جاتی ہے کہ یہ وہاں پہنچ کر ایک دوسرا عالم دیکھتا ہے اور اپنے تئیں اس شعر کا مصداق پاتا ہے ؎

عبارت کوتہ و دل تنگ خاصان ملک زیبا چہ داند مرد صحرائی طریق کارسازی را

سچ یہ ہے کہ آیۂ کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ کے معنی ایسے ہی ملکوں میں جا کر کھلتے ہیں، اور انسان کا اشرف المخلوقات اور خلیفۃ الرحمٰن ہونا وہیں جا کر ثابت ہوتا ہے نہ کہ ہندوستان میں اور خاص کر ہمارے بھائی مسلمانوں میں جن کی حالت کو دیکھ کر خدائے تعالیٰ کی قدرت اور اس کی فیاضی ایک خاص حد تک محدود معلوم ہوتی ہے اور اس آیت کے معنی اعتقاداً تسلیم کرنے پڑتے ہیں کہ [1] وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْۤ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰی كَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا ۔

بار خدایا! ہماری قوم کو تقلید بیجا اور وضعداری بے سرو پا سے نجات دے اور ان کو نئی، دنیوی ترقیات پر آمادہ کر ۔ ان کا ادب ان کو قدم آگے نہیں بڑھنے دیتا اور ان کی وضعداری پستی سے بلندی کی طرف نہیں جانے دیتی، کاش یہ بے ادب سکون مزاج ہی بن کر قدم آگے بڑھائیں اور جوہر قابل کی قدر پہچانیں جو تو نے بنی انسان کے تمام اگلے اور پچھلے طبقوں کو یکساں عنایت کیا ہے:

سر روحانیان داری ولے خود را نہ دیدستی
بخواب خود درآتا قبلۂ روحانیاں بینی

---

[1] یہ آیت پندرھویں پارہ اور سورۂ بنی اسرائیل کے ساتویں رکوع کے آخر میں ہے "اور البتہ ہم نے بزرگی دی انسان کو اور اس کو بحر و بر کا حاکم بنایا اور تمام پاکیزہ اشیا میں اس کے لیے سامان معاش رکھے اور جتنی چیزیں ہم نے پیدا کی ہیں ان میں سے اکثر پر انسان کو فضیلت دی ۔"

۵۔ مدعیانِ تہذیب کی بداعمالیاں

یہ مضمون مولانا کی مشہور نظم "زمزمہ قیصری" کے ایک طویل فٹ نوٹ کی نقل ہے۔
یہ نظم مولانا نے ۱۹۱۱ء میں لکھی تھی اور ایک انگریزی نظم کا ترجمہ ہے۔

انگریز مورخوں اور شاعروں کو جب یہ منظور ہوتا ہے کہ لوگوں کو اپنی رحم دلی اور انسانی ہمدردی پر فریفتہ اور مسلمانوں پر غضب ناک اور برافروختہ کریں تو وہ محمود غزنوی اور تیمور وغیرہ کی سختی اور تشدد کو خوب بھڑک بھڑک کر جلوہ گر کرتے ہیں۔

مسٹر اسٹوک ایک انگریز مصنف نے دربارِ قیصری منعقدہ ۱۹۱۱ء کے موقع پر ایک انگریزی نظم لکھی تھی جس کے تین حصے تھے۔ پہلے حصہ میں ہندوستان اور مسلمان بادشاہوں اور انگریزی سلطنت کی ابتدا اور ترقی کا ذکر ہے۔ دوسرے اور تیسرے حصے میں اُن ہندوستانی رؤسا اور والیانِ ریاست کا تذکرہ ہے جو دربارِ قیصری میں شریک ہوئے تھے۔ پہلے حصے میں مصنف نے بعض مسلمان بادشاہوں پر نکتہ چینی کی ہے جس کے ایک بند کا ترجمہ مثالاً پیش کیا جاتا ہے ؎

پھر ہوا اسلام کے اقبال کا تارا بلند
جانبِ ہندوستان محمود نے ہانکا سمند

وہ مسلمانوں کے حق میں ابرِ رحمت تھا مگر
ہندوؤں کے دل ہیں اُس کے ستم سے دردمند

وہ پہنچتا تھا جہاں ہوتی تھی واں آفت بپا
اور چلتا تھا جلو میں اُس کے آسیب و گزند

غش پہ غش آتے تھے سرذی روح کو پیہم وہاں
سانس لیتا تھا بار، وہ اژدہائے زورمند

روندتا تھا جس کو وہ کھیتی نہ ہوتی تھی ہری
صلح سے بجھتا نہ تھا، ہوتا تھا جو شعلہ بلند

خوف تھا دل میں خدا کا اور نہ کچھ ہندوں پہ رحم
قتل اور تاراج تھا اک بازیٔ سلطاں پسند

جب وہ آیا تھا تو سرتاپا گلستاں تھا یہ ملک
جب گیا یاں سے تو مثلِ دشت ویراں تھا یہ ملک

اسی طرح ایک اور انگریز نے محمود کے متعلق کچھ اشعار نظم کئے ہیں، جن کا ترجمہ یہ ہے سہ

اے ملک[لہ] زرنگار قدم ہے وہ کون سا — حملے سے جس کے ہے ترے ارکان میں زلزلہ
وہ تیرے قصر اور ستون دار سائباں — معبد وہ جو پہاڑوں کے غاروں میں ہیں نہاں
ٹھاکر اور اُن کے مندر۔ راجا اور اُن کے تخت — حملے سے اُس کے آ گئے سب پر وقت سخت
نیلا غضب کا کون سادہ ہولناک ہے — اے ملک زرنگار وہ غزنیں کی خاک ہے
آتا ہے لوٹتا ہوا اس بزم گاہ میں — بکھرے ہیں بکھرے تاج بہت اس کی راہ میں
کُتّے جو اس کے ساتھ شکاری ہیں بے شمار — اُن کے گلوں میں ہیں وہ جواہر نگار ہار
بے رحم فوج لائی ہے جو لوٹ مار کر — مقتول رانیوں کے گلے سے اُتار کر
کرتا ہے قتل لڑکیوں کو وہ گھروں کے بیچ
اور بے گنہ پجاریوں کو مندروں کے بیچ

اگرچہ ان دونوں شاعروں نے محمود کے تشدد کو بہت مبالغہ کے ساتھ بیان کیا ہے، مگر حق یہ ہے مسلمانوں کے لیے اُن کے بعض بادشاہوں کی ظالمانہ کارروائیاں گو وہ کیسی ہی تاریکی اور وحشت کے زمانے میں کی گئی ہوں ہمیشہ باعثِ شرم و ندامت رہیں گی۔

لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ آیا دنیا میں کوئی ایسی قوم ہے جو اس دھبے سے پاک ہو؟ یورپ کی تاریخ سے ظاہر ہے کہ وہاں کی شائستہ قومیں جو آج اپنے سوا تمام دنیا کی قوموں کو وحشی یا نیم وحشی کا خطاب دیتی ہیں محمود کے زمانے میں بلکہ اس کے بعد کئی صدیوں تک ایشیا سے بمراتب زیادہ وحشت و خوں ریزی و بے رحمی میں مبتلا تھیں۔

اگر انصاف سے دیکھا جائے تو بنی نوعِ انسان کی دو خصلتیں نہ کبھی بدلی ہیں، نہ آئندہ بدلنے کی اُمید ہے:

(۱) طمع اور خود غرضی

لہ ۔ یعنی ہندوستان۔

(۲) زبردستوں کا زیر دستوں کو دبا لینا۔

جس طرح نرگرمچھ مچھلیوں اور مینڈکوں کو، یا شیر اور چیتا ہرن اور نیل گائے کو نوش جان کرتا ہے، اسی طرح جو انسان قوی اور زبردست ہیں وہ ضعیف اور کمزور انسانوں کے شکار کرنے سے کبھی درگزر نہیں کرتے۔

سولھویں صدی کو، جس میں اہل یورپ امریکہ میں جاکر آباد ہوئے، کچھ بہت زمانہ نہیں گزرا۔ اس صدی میں یورپ کی بعض قوموں کے ہاتھ سے امریکہ کے اصلی باشندوں پر کون سا ظلم اور کون سی بے رحمی ہے جو روا نہیں رکھی گئی۔ میکسیکو اور پیرو جو کہ امریکہ کے دو شائستہ ملک تھے، وہاں کے مفتوحین پر جو وحشیانہ ظلم ہسپانیہ والوں نے کئے ان کی نظیر دنیا کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ کورٹیز جو ہسپانیہ کا رہنے والا اور میکسیکو کا فاتح تھا اس نے اور اس کے بعد آنے والے جرنیلوں نے یہ ٹھان لی تھی کہ میکسیکو کو قاطبۃً ویران کر دیجئے اور وہاں ہسپانیہ کی کولونی (نو آبادی) آباد کیجئے۔ جہاں تک ہو سکا وہاں کے قدیم باشندوں کو نیست و نابود کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ کورٹیز نے میکسیکو کے شہنشاہ مونٹی زوما کو گرفتار کرکے پھانسی لٹکا دیا اور اس کی رعایا کو اس کی آنکھ کے سامنے جلایا اور قتل کرایا۔ بڑے بڑے الاؤ لگے ہوئے تھے جن میں ہزاروں بنی آدم عام طور پر بے تکلف جلائے جاتے تھے معصوم بچوں کے روبرو ان کی مائیں اور ماں باپ بہ ہزار عقوبت و سختی آگ میں جھونک دیے جاتے تھے۔ دیہات اور جنگلوں میں ہزاروں آدمی شکاری کتوں سے پھڑوا دیے جاتے تھے۔ یہ ہسپانیہ کے وہی مقدس اور بے عیب عیسائی تھے جنہوں نے کافروں (یعنی مسلمانوں) کو غرناطہ سے ایک ناپاک اور گنہگار قوم ہونے کا الزام لگا کر نکالا تھا اور جن کا قول تھا کہ:

"ظالم اور بد دین مسلمان اس لائق نہیں کہ فرشتہ صفت عیسائیوں کے ہمسائے اور ہم وطن ہو کر رہیں۔"

اندازہ کیا گیا ہے کہ تقریباً ایک ملین (دس لاکھ) بنی آدم ان مقدس عیسائیوں کے ہاتھ سے طرح طرح کی سختی اور عقوبت کے ساتھ مارے اور جلائے گئے۔

یہی حال کچھ دنوں بعد پیرو کا ہوا۔ یہ ملک جنوبی امریکہ میں بحرالکاہل کے کنارے واقع ہے، فرانسیسکو پزیرو جو کہ غالباً اٹلی کا رہنے والا ایک مجہول النسب آدمی تھا، اس کو جنوبی امریکہ میں فتوحات کرنے، اور وہاں سے سونا چاندی روانہ کا مدت سے خیال تھا۔ اُس نے پناما یا اُس کے قریب کسی مقام میں ایک جماعت کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ ایک بیڑہ جہازوں کا اور کچھ سپاہ اس کے ماتحت ملک پیرو کو جس کے سونے کی بہت شہرت تھی، روانہ کریں۔ چناں چہ اس سامان کے ساتھ وہ وہاں پہونچا، اور ایک دو پھیرے کے بعد اس ملک پر قابض ہوگیا۔ پھر تو کوئی ظلم اور تعدی ایسی نہ تھی جو پیرو کے اصلی باشندوں پر جائز نہ رکھی گئی ہو۔ اُن سے سونا اور چاندی چھین چھین کر اپنے ملک کو بھیجتا تھا۔ ہزاروں بندگانِ خدا اُس کے ظلم و ستم کے باعث ملک چھوڑ چھوڑ کر پہاڑوں پر چڑھ گئے تھے، جہاں وہ آخر کار فاقے کر کے مرجاتے تھے، اور ہزاروں قتل کرائے جاتے تھے، تمام مورخوں کا اتفاق ہے کہ ایسی بیرحمی کبھی دنیا میں نہیں ہوئی۔

انگریزوں کا بیان ہے کہ آسٹریلیا کے قدیم باشندوں پر بہت سختی نہیں کی گئی۔ اگر یہ بیان صحیح ہے تو وہاں سختی کی ضرورت بھی نہ تھی۔ وہ بیچارے اس درجہ ناہموار بے ڈھنگ اور ناشائستہ تھے کہ انگریز فاتحوں کی صورتیں، ٹیپ ٹاپ اور چمک دمک دیکھ کر شرم کے مارے زمین میں گڑے جاتے تھے، اور کسی طرح ممکن نہ تھا کہ ان کے پڑوس میں رہ سکیں۔ جس قدر انگریز مہاجروں کی تعداد آسٹریلیا میں بڑھتی گئی، وہ لوگ ملک کے اندرونی حصے میں غائب ہوتے گئے اور رفتہ رفتہ وہیں معدوم ہوگئے۔ اب شاذ و نادر کہیں کہیں اندرونی پہاڑوں کے سلسلے میں پائے جاتے ہیں۔

تسمانیہ[1] کے قدیم باشندے جو ایک خوش بشرہ، مگر اُن سے ویلائزڈ قوم (نا تربیت یافتہ) تھی۔ یورپ والوں کی ہمسائیگی کے باعث بالکل فنا ہوگئی۔ یہاں تک کہ اب

---

[1] تسمانیہ :۔ براعظم آسٹریلیا کے ایک صوبے کا نام ہے۔

ایک متنفس بھی ان کی نسل کا باقی نہیں۔

پس آسٹریلیا کے قدیم باشندے جو انڈین والوں سے بھی زیادہ بدقوارہ اور ناشائستہ تھے، انگریز جیسی اعلیٰ درجہ کی شائستہ قوم کے پڑوس میں کیونکر ٹھہر سکتے تھے ؎

تو بجلوہ چوں در آئی اجل از سر ترحم
ہمہ جا کند منادی پئے احتراز کردن

اگر فی الواقع انگریزوں نے آسٹریلیا والوں پر سختی نہیں کی تو یہ اُن کی عین دانائی تھی کہ انھوں نے مفت کی بدنامی نہیں لی اور تمام براعظم ان کے لیے خود بخود خس و خاشاک سے پاک ہو گیا۔

بات یہ ہے کہ دنیا کے ایک بہت بڑے حصے نے علم و ہنر میں اس قدر ترقی کی ہے، اور وہ دوسرے حصے کے ابنائے جنس سے اس قدر آگے بڑھ گیا ہے کہ اگلے زمانے کے فاتح اور کشورکشا جن جائز ذریعوں سے مفتوحین کی دولت و ثروت اور سلطنت کے مالک ہوتے تھے، اُن ذریعوں کے کام میں لانے کی اب مطلق ضرورت نہیں رہی۔ جس قدر مال و دولت پہلے قتل و غارت اور لوٹ کھسوٹ سے حاصل کیا جاتا تھا، اس سے اضعاف مضاعفہ اب صنعت و تجارت کے ذریعے سے خود بخود کھچا چلا آتا ہے۔ یہاں تک کہ جب دو ایسی گورنمنٹوں کے درمیان جن میں سے ایک شائستہ اور دوسری ناشائستہ ہو، تجارتی عہد نامہ تحریر ہو جاتا ہے۔ تو یقیناً یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ شائستہ گورنمنٹ بغیر اس کے کہ ہلدی لگے نہ پھٹکری دوسری گورنمنٹ کے تمام ملک و دولت و منافع و محاصل کی بالکل مالک ہو گئی کسی شاعر نے خوب کہا ہے ؎

نہیں خالی ضرر سے وحشیوں کی لوٹ بھی لیکن
حذر! اُس لوٹ سے جو لوٹ ہے علمی و اخلاقی
نہ گل چھوڑے نہ برگ و بار چھوڑے لوٹنے گلشن میں
یہ گلچینی ہے یا لُٹس ہے گلچیں! یا ہے قزّاقی

شاید ان شعروں میں کچھ مبالغہ ہو، لیکن اس میں شک نہیں کہ جو نتیجہ اگلے زمانہ

کے غارت گروں کی لوٹ کھسوٹ سے مرتب ہوتا تھا۔ اسی نتیجے کے قریب قریب یہ شائستہ لوٹ بھی پہنچا دیتی ہے۔

کروڑوں اہلِ صنعت و حرفت جن کی دستکاری مکینکس (کلوں، مشینوں) کا کسی طرح مقابلہ نہیں کر سکتی۔ نانِ شبینہ کو محتاج ہو جاتے ہیں۔ زراعت پیشہ لوگوں پر یہ بیتا پڑتی ہے کہ زمین کی پیداوار جس قدر کثرت کے ساتھ غیر ملکوں کو جاتی ہے، اسی قدر ملک میں زیادہ کاشت کا تردد کیا جاتا ہے اور اس سبب سے روز بروز زیادہ لاگت لگانی پڑتی ہے اور محنت کا کافی معاوضہ نہیں ملتا۔

پولیٹیکل اکانومی (علمِ سیاست مدن) کا یہ مسلّم مسئلہ ہے کہ قدرتی پیداوار کی جس قدر زیادہ مانگ ہوتی جاتی ہے، اسی قدر اس کے بہم پہنچانے میں زیادہ لاگت اور زیادہ محنت صرف ہوتی ہے اور مصنوعی چیزوں کی جس قدر زیادہ طلب ہوتی ہے اسی قدر اُن پر کم لاگت آتی ہے اور کم محنت صرف ہوتی ہے۔

ملکی تاجروں کے لیے جو کہ شائستہ ملکوں کی مصنوعی چیزوں کی تجارت کرتے ہیں، اول تو اوپر والے منافع کی کچھ گنجائش ہی نہیں چھوڑتے۔ اور اگر قدرِ قلیل (جیسے آٹے میں نمک) کچھ فائدہ ہوتا بھی ہے تو اپنے ملک کی نہایت ضروری اور ناگزیر اشیاء کا نرخ گراں ہونے کے سبب ان کی کمائی میں سے بہت کم پس انداز ہوتا ہے، وہ غیر ملکوں کی آرائشی اور غیر ضروری چیزوں کے خریدنے میں جو باوجود کمال نفاست اور لطافت کے نہایت ارزاں دستیاب ہوتی ہیں، صرف ہو جاتا ہے۔ پس ان کو بھی فارغ البالی اور آسودگی کبھی نصیب نہیں ہوتی۔ اگر سو دو سو میں دو چار ایسے نکل بھی آتے ہیں جو اپنے ملک میں مرفہ الحال سمجھے جاتے ہیں، ان کا معاملہ اور لین دین ان کروڑپتیوں سے ہوتا ہے جن کے مقابلے میں وہ اپنے تئیں محض مفلس اور قلاش تصور کرتے ہیں اور جن کی مانگ کے خوف سے ہمیشہ دوالہ نکل جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ طمع، خود غرضی اور زبردستوں کا زیردستوں کو ڈانٹا اور پیٹنا آریکی

اور وحشت کے زمانے میں تھا۔ اُسی کے قریب قریب اب بھی ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ دولت گھسیٹنے کے لیے پہلے جبر و تعدی کی ضرورت تھی، اب اس کی ضرورت نہیں رہی، اَن سویلائزڈ (وحشی)، دنیا کی دولت سویلائزڈ (مہذب)، دنیا کی طرف خود بخود کھچی چلی جاتی ہے۔

ایک اژدہا شیر کو بہت بُرا بھلا کہہ رہا تھا کہ تُو کیسا بے رحم ہے کہ ہمیشہ جانداروں کا خون پینے کی فکر میں رہتا ہے اور شکار کی دھن میں دُور دُور کے دھاوے کرتا ہے، تمام جنگلوں میں تیری دھاک ہے۔ آج اس ہرن کو پھاڑ ڈالا، کل اُس پاڑھے کے ٹکڑے اُڑائے۔ ایسی خونخواری پر کمر باندھنی اچھی نہیں ہے۔ شیر نے کہا ہتنلہ! اگر میرے سانس میں بھی ایسی کشش ہوتی کہ دُور دُور سے جانور خود گھسٹے ہوئے منہ میں چلے آتے اور میری حرص و آز کی آگ کو بجھا دیتے تو میں بھی ہرگز کسی بے گناہ کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین نہ کرتا۔

مع ذالک، اگر کہیں آزادیٔ تجارت میں کوئی مزاحمت پیش آتی ہے اور اور بغیر جبر و تعدی کے کام نہیں چلتا تو اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کی شائستہ قوم بھی سب کچھ کرنے کو موجود ہو جاتی ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ آزادیٔ تجارت کی مزاحمت رفع کرنی عین انصاف ہے، حالانکہ آج تک پولیٹیکل اکانومی نے اس بات کا تصفیہ نہیں کیا کہ فری ٹریڈ (FREE TRADE) کا قاعدہ مطلقاً قرینِ انصاف ہے یا خاص خاص صورتوں میں خلافِ انصاف بھی ہو سکتا ہے۔ انگلینڈ کا فائدہ فری ٹریڈ میں ہے اس لیے وہ اسی کو عین انصاف سمجھتا ہے، فرانس اور یونائیٹڈ اسٹیٹس (اضلاع متحدہ امریکہ) اس کو اپنے حق میں بالفعل مضر سمجھتے ہیں اس لیے وہ اس کو جائز نہیں رکھتے۔

لیکن انصاف شرط ہے، جن حکمتوں اور تدبیروں سے آج کل دُنیا کی دولت گھسیٹی جا رہی ہے، ان پر برخلاف اگلے زمانے کے جابرانہ لوٹ کھسوٹ کے کچھ اعتراض نہیں ہو سکتا۔ مشہور ہے کہ حکیم علوی خاں[1] جو کہ محمد شاہ کا معالج اور نہایت حاذق طبیب تھا۔ اس کے زمانے

---

[1] حکیم علوی خاں دراصل خطاب ہے۔ اصل نام محمد ہاشم تھا۔ (رشنلہ ۱۹۶۹ء)

میں ایک عطار بھی اُس کے نسخے دیکھتے دیکھتے علاج کرنے لگا۔ لوگوں نے اس کا ذکر علوی خاں کے سامنے بھی کیا اور یہ کہا کہ:

جس قدر مریض آپ کے علاج سے اچھے ہوتے یا مرتے ہیں، اسی کے قریب اس کے علاج سے اچھے بھی ہوتے ہیں اور مرتے بھی ہیں"

علوی خاں نے کہا:

"بلے! لاکن من بقاعدہ می کشتم وآں قرم ساق بے قاعدہ می کشد"

صفحہ ۴۸ کا باقی حاشیہ:- میں بمقام شیراز پیدا ہوئے۔ بڑے ہونے پر ۱۱۱۱ ہجری میں ہندوستان آئے اور شہزادہ محمد اعظم (ابن حضرت عالمگیرؒ) کے یہاں ملازم ہوئے۔ محمد شاہ کے دربار میں منصب شش ہزاری پر فائز، اور خطاب "معتمد الملک" سے سرفراز ہوئے تو بادشاہ نے ان کو چاندی میں تلوا کر سب چاندی ان کو مرحمت فرمائی۔ سلطنت کی ابتری کی بدولت جب محمد شاہ کے زمانے میں نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کیا تو واپسی پر ان کو بھی اپنے ہمراہ لے گیا۔ وہاں سے حج کرتے ہوئے ۱۱۶۱ء میں واپس دہلی چلے آئے اور ۱۱۶۲ء میں انتقال فرمایا۔ نامی طبیب اور حاذق معالج تھے۔ جامع الجوامع طب میں ان کی ایک مشہور کتاب ہے۔

۶۔ الدّین یُسرٌ

(از رسالہ تہذیب الاخلاق ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) صفحہ ۱۳)

دین برحق کی شان یہ ہے کہ اس میں کوئی چیز انسان کو مجبور کرنے والی نہ ہو، نہ اعتقادات میں کوئی محال بات تسلیم کرائی جائے۔ نہ عبادات میں کوئی بوجھ ایسا ڈالا جائے کہ عاجز بندوں سے اس کی برداشت نہ ہو سکے۔ کھانے پینے اور پہننے اور برتنے کی چیزوں میں ان کے لیے اسی قدر روک ٹوک ہو جیسے طبیب کی طرف سے بیمار کے حق میں ہوتی ہے۔ اس کا بڑا مقصد اخلاق کی تہذیب اور نفس انسانی کی تکمیل ہو۔ اس میں عبادت کے طریقے ایسے عمدہ ہوں جن میں مشقت کم اور فائدہ بہت ہو، اس کے اصول ایسے جامع ہوں کہ ایک نیکی میں بہت نیکیاں مندرج ہوں۔ اس میں کوئی بندش ایسی نہ ہو جس سے انسان کو اپنی واجبی آزادی سے دست بردار ہونا پڑے، اس میں کوئی مزاحمت ایسی نہ ہو جس سے انسان پر ترقی کی راہیں مسدود ہو جائیں اور وہ خلافت رحمانی کا منصب حاصل کرنے سے محروم رہ جائے اور جس خوانِ یغما سے اس کے بنی نوع بہرہ مند ہوں، اس میں ان کا شریک نہ ہو سکے۔ جیسے ایک کوتل گھوڑا جو اپنے ہم جنسوں کو جنگل میں آزاد اور بے قید چرتا اور کلول کرتا دیکھتا ہے مگر خود اپنے مالک کے بس میں ایسا مجبور و ناچار ہے کہ حیرت بھری نگاہ سے دیکھتا ہے لیکن ہاتھ پاؤں نہیں ہلا سکتا اور بوجھ میں لدا ہوا چپ چاپ چلا جاتا ہے۔

صرف دینِ اسلام ہی وہ دین ہے کہ جب اس کی اصل ماہیت پر نظر کی جاتی ہے تو وہ نہایت پاک اور سچا دین ثابت ہوتا ہے۔ یہ دین انسان کی آزادی کو قائم رکھتا ہے اور اس کو کسی دشوار بات کے کرنے یا ماننے پر مجبور نہیں کرتا۔ اس میں تثلیث اور کفارہ جیسی کوئی انوکھی بات تسلیم کرنی پڑتی ہے، نہ رہبانیت جیسی کوئی سخت مشقت

اُٹھانے کی ضرورت ہے۔

خدا تعالیٰ نے اس دین کے آسان ہونے کو اپنے کلام پاک میں طرح طرح سے جتایا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے (۱) يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (بقرہ) (۲) لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (بقرہ) (۳) مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِى الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ۔ (الحج) یعنی (۱) "خدا تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے دشواری نہیں چاہتا (۲) خدا کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ (۳) خدا نے دین میں تم پر کسی طرح کی تنگی نہیں کی۔

ہمارے ہادیؐ اور رہنما نے بھی اس ضروری بات کو طرح طرح سے اُمت کے خاطر نشین کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا: اِنَّ الدِّيْنَ يُسْرٌ وَلَنْ يُّشَادَّ الدِّيْنَ اَحَدٌ اِلَّا غَلَبَهٗ - (بخاری) یعنی دین آسان ہے اور جو کوئی اس دین میں سختی اختیار کرے گا وہ آخر کو عاجز اور درماندہ ہوگا" (یعنی اعمال شاقہ سے تھک کر ضروری فرائض بھی ترک کرنے لگے گا۔) یہ بھی فرمایا کہ:

بعثت بالحنیفۃ السمحۃ البیضاء (بخاری) یعنی "میں وہ شریعت لایا ہوں جو آسان اور روشن ہے" یہ بھی کہا کہ خُذُوْا مِنَ الْاَعْمَالِ مَا تُطِيْقُوْنَ ۔ یعنی وہ اعمال اختیار کرو جن کے تم متحمل ہو سکو۔ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِيْنَ وَلَمْ تُبْعَثُوْا مُعَسِّرِيْنَ ۔ یعنی (اے اسلام والو) تم سہل گیر بھیجے گئے ہو نہ کہ سخت گیر" اُس نے نجات کا مدار صرف ایک نیکی یعنی توحید پر رکھا جو تمام نیکیوں کا سرچشمہ ہے اور یہ کہا: مَنْ شَهِدَ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ صَادِقًا بِهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ اس نے استحقاق رحمت سے صرف ایک بدی یعنی شرک کو مستثنیٰ کیا جو تمام بدیوں کی جڑ ہے اور یہ کہا کہ مَنْ مَاتَ لَا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا حَرَّمَهُ عَلَى النَّارِ[1]

تعصب جو کہ انسان کی ترقی کا سخت مانع ہے اس کے ناگوار بوجھ سے اسلام کو

---

[1] یعنی جو شخص اس حال میں مرا کہ اللہ کے سوا کسی کو نہیں پوجتا تھا اس پر اللہ نے دوزخ کو حرام کر دیا۔

طرح طرح سے سبکدوش کیا گیا۔ مسلمانوں کو اجازت دی گئی کہ فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔ یعنی اگر تم سابقہ اُمم کا علم نہیں رکھتے تو اہلِ کتاب سے پوچھ لو۔ زید بن ثابتؓ کو سریانی زبان سیکھنے کے لیے ارشاد ہوا بنی اسرائیل سے روایت کرنے کی صاف صاف اجازت دی گئی۔ ہر مسلمان کو آگاہ کیا گیا کہ "دانشمندی کی بات مومن کی گم شدہ پونجی ہے۔ پس جہاں کہیں اس کو ملے وہ اس کا زیادہ حقدار ہے"۔ یہ بھی صاف صاف ارشاد ہوا کہ مَنْ دَعَا اِلٰی عَصَبِیَّةٍ فَلَیْسَ مِنَّا وَمَنْ مَاتَ عَلٰی عَصَبِیَّةٍ فَلَیْسَ مِنَّا وَمَنْ قَاتَلَ عَلٰی عَصَبِیَّةٍ فَلَیْسَ مِنَّا۔ یعنی جس نے تعصب کی طرف بلایا یا تعصب کی حالت میں مرا یا تعصب کی بنا پر لڑا وہ ہم میں سے نہیں ہے"۔ اہلِ کتاب کا کھانا مسلمانوں کے لیے اور مسلمانوں کا کھانا اہلِ کتاب کے لیے حلال کیا گیا یہ بھی جتایا گیا کہ کَانَ یُحِبُّ مُوَافَقَةَ اَهْلِ الْکِتَابِ فِیْمَا لَمْ یُؤْمَرْ فِیْهِ بِشَیْءٍ (شمائل ترمذی) یعنی "جس بات میں کوئی نصِ صریح نہ ہو اس میں موافقت اہلِ کتاب کی پسندیدہ ہے"۔

لونڈی غلاموں کی اس قدر حمایت کی گئی کہ وہ حقیقتہً یا حکماً ہمیشہ کے لیے آزاد کئے گئے۔

رائے انسانی کو یہاں تک آزادی حاصل ہوئی کہ نبی کے حکم کی نسبت جو وہ اپنی رائے سے دے لوگوں کو ماننے یا نہ ماننے کا اختیار دیا گیا۔ خود نبی کریم صلعم کو یہ حکم ہوا کہ "مسلمانوں سے مشورہ لیا کرو"۔

سفر، خوف یا مرض وغیرہ کی حالت میں عبادات مفروضہ میں طرح طرح کی آسانیاں کی گئیں۔ یہ بھی اجازت دی گئی کہ اگر کہیں قبلے کی سمت محقق نہ ہو تو اٹکل سے کوئی سمت مقرر کر کے اُسی سمت نماز پڑھ لو۔ اگر چاند نظر نہ آئے تو تیس روزے رکھ کر رمضان کو ختم کر دو۔ اگر پانی نہ ملے تو تیمم کر لو۔ اگر کپڑا نہ ہو تو ننگے بدن نماز پڑھ لو۔

الغرض اس پاک دین میں جب تک وہ اپنی اصلیت پر برقرار رہا کوئی چیز انسان کی داجبی امنگ اور خوشی اور آزادی کو روکنے والی نہ تھی۔ مگر افسوس ہے کہ وقتاً بعد

وقت اور جیساکہ بعد میں اُس پر حاشیے چڑھنے شروع ہوئے اور رفتہ رفتہ ان کی کثرت اس درجہ کو پہنچی کہ متن اور حاشیوں میں تمیز کرنی دشوار ہوگئی بلکہ وہ متن نظروں سے غائب ہوگیا۔

پہلا حاشیہ جو اس ملتِ بیضا پر چڑھایا گیا وہ یہ تھا کہ جو باتیں رسول خداؐ نے محض اصلاحِ معاش کے لیے تعلیم فرمائی تھیں اور جن کا مدار صرف مصالح دُنیوی پر تھا وہ بھی شریعت میں داخل کی گئیں اور ان کو بھی ضروریاتِ دین سے سمجھا گیا۔ حالانکہ یہ ایک صریح مغالطہ تھا جس کو خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں حل کر دیا تھا۔

اصل یہ ہے کہ جس قوم میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تھے اس کی اندرونی اور بیرونی دونوں حالتیں زمانہ جاہلیت کے امتداد سے معالجہ اور اصلاح کی محتاج تھیں۔ جس طرح اُن کے عقائد اور اخلاق بگڑ گئے تھے اسی طرح اُن کا تمدن اور طرزِ معاشرت بُری حالت میں تھا۔ وہ جیسے مبدا اور معاد سے غافل تھے، ویسے ہی کھانے پینے اور پہننے کے آداب سے ناواقف تھے، اُن کی مجلسیں تہذیب سے معرا تھیں، ان کے معاملات وحشیانہ تھے۔ اُن کا طریقِ معاش بے ڈھنگا تھا۔

پس اُس دین کے ہادی اور دنیا کے رہبر نے جیسا اپنے فرائضِ منصبی یعنی تبلیغ احکام الٰہی کو ضروری سمجھا اور ان کو مبدا و معاد کی حقیقت سے آگاہ کیا اور اُن کے عقائد باطلہ اور اخلاق رذیلہ کی اصلاح فرمائی۔ اس طرح رقتِ نوعی اور قومی ہمدردی کے مقتضائے ان کے طریقِ معاش کو بھی درست کیا۔ اُن کی مجلسوں میں تہذیب پھیلائی۔ لباس اور طعام کے آداب سکھائے۔ نشست و برخاست کے قاعدے بتائے۔ سلام، مصافحہ، معانقہ، تہنیت، تعزیت، مہمانی، ضیافت، بیاہ شادی، لین دین، سفر، اقامت، کھیتی، تجارت، حفظ صحت، دوا، دارو غرضکہ جملہ امورِ دُنیوی کے اصول تعلیم فرمائے، مگر اسی قدر جتنے کہ اُس زمانے اور اُس ملک کے مناسب تھے۔

ان دونوں میں پہلی تعلیم آپ کا منصبی فرض تھا جس کے لیے آپ مبعوث ہوئے تھے اور جس کی نسبت کلام الٰہی میں آپ کو یہ ارشاد ہوا کہ یَا اَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ[1]۔ اور امت کو یہ حکم ہوا کہ مَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا[2]۔ اسی کا تمام شریعت رکھا گیا اور اسی کی مخالفت پر ضلالت کا اطلاق کیا گیا۔

دوسری تعلیم جو کہ معاش سے علاقہ رکھتی تھی، وہ آپ کے منصبی فرائض سے بالکل علیحدہ تھی۔ نہ اس کی تعمیل امت پر فرض کی گئی اور نہ اس کے خلاف عملدرآمد کرنے کی ممانعت ہوئی۔ اور اسی تعلیم کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ اِذَا اَمَرْتُكُمْ بِشَیْءٍ مِنْ دِیْنِكُمْ فَخُذُوْا بِهٖ وَاِذَا اَمَرْتُكُمْ بِشَیْءٍ مِنْ رَأْیٍ فَاِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ[3]

حضرت شاہ ولی اللہ[4] محدث دہلوی (قدس سرہٗ) نے اپنی کتاب

---

[1] "یعنی اے رسول! جو کچھ تجھ پر تیرے پروردگار کی جانب سے نازل ہوا ہے، وہ لوگوں تک پہنچا دے۔"

[2] یعنی "جو کچھ یہ رسول تم کو دے وہ لے لو اور جس سے منع کرے پس اس سے باز رہو۔"

[3] یعنی "یقیناً میں بھی (تم جیسا) ایک آدمی ہوں۔ جب دینی امور میں تمھیں کوئی حکم دوں تو اسے لے لو اور جب اپنی رائے سے کوئی حکم دوں تو میں بھی ایک انسان ہوں۔" (یعنی غلطی بھی کر سکتا ہوں)

[4] حضرت شاہ ولی بارھویں صدی کے مجدد اعظم زبردست عالم۔ بے نظیر فاضل اور اعلیٰ پایہ کے محدث تھے۔ ۴ شوال ۱۱۱۴ھ (۱۷۰۲ء) کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ سات سال کی عمر میں قرآن مجید ختم کر لیا اور پندرہ سال کے تھے تو حدیث، تفسیر، فقہ، منطق، علم کلام، تصوف، طب، صرف و نحو، معانی و بیان اور علم ہندسہ و حساب وغیرہ تمام مروجہ وقت علوم میں کامل دستگاہ حاصل کر لی اور مدرسہ رحیمیہ میں بیٹھ کر درس دینے لگے۔ حضرت شاہ صاحب ہی وہ سب سے پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے قرآن پاک کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ ۵۹ سال کی عمر میں ۱۱۷۶ھ (۱۷۶۲ء) میں وفات پائی۔

حجۃ اللہ بالغہ[1] کے ساتویں مبحث میں اس بات کا بیان کیا ہے کہ احکام شرعیہ کو احادیث نبویؐ سے کیوں کر استنباط کرنا چاہیے اور اس مبحث کے پہلے باب میں احادیث نبویؐ کو دو قسموں پر تقسیم کیا ہے۔

ایک وہ قسم ہے جو تبلیغ رسالت سے متعلق ہے اور جس کی نسبت کتاب اللہ میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ:

مَآ اٰتَاکُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوہُ وَمَا نَھَاکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوا۔

"یعنی جس بات کا رسول تم کو حکم دے اسے مان لو اور جس بات سے وہ تم کو روکے اس سے باز رہو۔"

اس قسم کو علم آخرت اور علم عجائب ملکوت اور علم شرائع و احکام اور علم اخلاق و فضائل اعمال پر منحصر کیا ہے۔ پھر لکھا ہے کہ اسی قسم سے ہماری غرض متعلق ہے اور اسی کو ہم اس مبحث میں بیان کریں گے (یعنی جو باتیں دُنیوی تعلیم سے علاقہ رکھتی ہیں، وہ اس کتاب کے مباحث سے خارج ہیں۔)

پھر وہ لکھتے ہیں کہ "دوسری قسم وہ ہے جو تبلیغ رسالت سے تعلق نہیں رکھتی اور جس کی نسبت آپؐ نے فرمایا کہ:

"میں صرف ایک آدمی ہوں، جب میں تم کو تمہارے دین کی کوئی بات بتاؤں تو اس کو مان لو، اور جب اپنی رائے سے کوئی بات کہوں تو یہ جان لو کہ میں صرف ایک آدمی ہوں۔" اور نیز قصۂ بیرنخل[2] میں اسی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ:

---

[1] حجۃ اللہ بالغہ۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تصنیف ہے جو بالاتفاق بڑے پایہ کی کتاب سمجھی جاتی ہے۔

[2] کھجوروں میں ایک درخت نر ہوتا ہے اور ایک مادہ۔ نر کے پھول مادہ پر جھاڑنے کو تابیر کہتے ہیں مسلم نے یہ قصہ رافع بنؓ خدیج سے اس طرح نقل کیا ہے کہ جب آنحضرت مدینہ (باقی آئندہ صفحہ پر)

"میں نے ایک رائے لگائی تھی، سو تم مجھ سے اس رائے کی بابت مواخذہ نہ کرو۔ لیکن جب میں کوئی بات خدا کی طرف سے کہوں تو اسے مان لو کیونکہ میں خدا پر جھوٹ نہیں باندھتا۔" اس کے بعد شاہ صاحب نے دوسری قسم میں بہت سے ابواب داخل کئے ہیں۔

ازآنجملہ وہ بے شمار حدیثیں جو طب سے علاقہ رکھتی ہیں یا جو آپ نے اپنے ذاتی تجربہ کی رو سے ارشاد فرمائی ہیں جیسے عَلَيْكُمْ بِالْاَدْهَمِ الْاَقْرَحِ یعنی "جس مشکی گھوڑے کی پیشانی پر سفید دھبا ہو اُسے ڈھونڈ لیا کرو۔"

ازآنجملہ وہ افعال جو آپ نے عبادت کی نظر سے نہیں بلکہ عادت کی راہ سے قصداً نہیں بلکہ اتفاقاً کیے ہیں۔ ازآنجملہ وہ امور جن کا ذکر آپ بھی اُسی طور کیا کرتے تھے جس طرح آپ کی قوم کرتی تھی۔ جیسے حدیث امّ ذرع اور حدیث خرافہ۔ ازآنجملہ وہ حدیثیں جو خاص کسی وقت کی مصلحت کے لحاظ سے ارشاد ہوئی ہیں نہ یہ کہ تمام اُمّت کے لیے ہمیشہ کے واسطے ضروری ہیں، اور اس اخیر باب کی نسبت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ اس پر بہت سے احکام محمول کئے گئے ہیں۔ (انتہیٰ ملخصاً)

صحابہ کرام بھی جیسا کہ صحیح روایتوں سے ثابت ہے۔ احادیث نبویؐ کی نسبت ایسا ہی اعتقاد رکھتے تھے، جیسا کہ شاہ صاحب نے بیان کیا ہے اور آپ کی تمام تعلیمات کو تبلیغ رسالت سے متعلق نہیں جانتے تھے۔

گزشتہ سے پیوستہ: میں آئے تو اہل مدینہ کو تابیر کرتے ہوئے دیکھا۔ پوچھا کیا کرتے ہو؟ لوگوں نے عرض کیا کہ ہم یونہی طرح کرتے رہے ہیں، آپ نے فرمایا شاید اگر نہ کرو تو بہتر ہو۔ انھوں نے چھوڑ دیا۔ اس سال پھل کم آیا۔ لوگوں نے آپ سے ذکر فرمایا۔ آپ نے فرمایا: اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ الخ اور بعض روایتوں میں یہ ہے کہ آپ نے یہ کہا اِنَّمَا ظَنَنْتُ ظَنًّا وَلَا تُؤَاخِذُوْنِیْ بِالظَّنِّ وَلٰکِنْ اِذَا حَدَّثْتُکُمْ عَنِ اللّٰهِ شَیْئًا فَخُذُوْا بِهٖ فَاِنِّیْ لَمْ اَکْذِبْ عَلَی اللّٰهِ۔ ۱؎ زید بن ثابت آنحضرت صلعم کے جلیل القدر صحابی اور کاتب وحی تھے (باقی صفحہ ۵۹ پر)

ایک بار کچھ لوگ زید بن ثابت[۱]ؓ کے پاس حدیث سُننے کو آئے۔ انھوں نے پہلے اس سے کہ اُن کے سامنے کچھ حدیثیں بیان کریں یہ کہا کہ :

"میں آنحضرت صلعم کے ہمسایہ میں رہتا تھا، سو جب آپؐ پر وحی نازل ہوتی تھی آپؐ مجھے بُلا بھیجتے تھے۔ میں حاضر ہو کر وحی لکھتا تھا، پھر جب ہم دُنیا کی باتیں کرتے تھے تو آپ بھی ہمارے ساتھ ویسی ہی باتیں کرنے لگتے تھے اور جب آخرت کا ذکر کرتے تھے تو آپ بھی ہمارے ساتھ آخرت ہی کا ذکر کرنے لگتے تھے۔ اور جب ہم کھانے کا ذکر کرتے تھے تو آپؐ بھی ویسا ہی ذکر کرنے لگتے تھے سو میں ان سب باتوں کو بطور حدیث نبویؐ کے تمھارے سامنے بیان کروں گا۔" (حجۃ اللہ البالغہ)

اس روایت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ زید بن ثابتؓ ان لوگوں کو یہ جتانا چاہتے تھے کہ میں بہت سی حدیثیں تمھارے سامنے ایسی بیان کروں گا جو امرِ دین سے علاقہ نہیں رکھتیں۔

مسلم[۱] اور ترمذی[۲] میں ابن عمر[۳]ؓ اور جابر[۴]ؓ سے روایت ہے کہ آن حضرت صلعم

باقی حاشیہ ۵: علم الفرائض اسلامی اور قانونِ وراثت کے ماہر تھے ۴۵ھ/۶۶۶ء یعنی عمر ۶۵ سال مدینہ میں انتقال فرمایا۔

نوٹ صفحہ ہذا۔ ۱ھ صحیح مسلم حدیث کی مشہور کتابوں میں صحیح بخاری کے بعد اسی کا درجہ ہے حضرت امام ابوالحسین مسلم بن الحجاج قشیری نیشاپوری کی تالیف ہے جو بڑے پایہ کے محدث اور علم حدیث کے ماہر گزرے ہیں حضرت امام بخاری کے شاگرد تھے اور بڑے بڑے محدث ان کے شاگرد ہیں۔ ۲۵ رجب ۲۶۱ھ میں انتقال فرمایا۔

۲ھ سنن ترمذی: احادیث کی مشہور کتاب اور صحاح ستہ میں داخل ہے۔ امام محمد بن عیسٰی ترمذی کی تالیف ہے جو حضرت امام بخاریؒ کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ ۲۷ رجب ۲۷۹ھ کو وفات پائی۔

۳ھ ابن عمرؓ - عبداللہ نام ہے۔ فاروق اعظم خلیفہ حضرت عمر بن خطاب کے فرزند گرامی اور بڑے پرہیزگار، عابد و زاہد اور صحابہ میں خاص علم و فضل کے مالک تھے ۷۳ھ (۶۹۲ء) میں وفات پائی۔ آپ کی عمر ۸۶ یا ۸۴ برس کی ہوئی۔

۴ھ حضرت جابرؓ بن عبداللہ آنحضرت کے اکابر صحابہ میں ہیں حضورؐ کے ہمراہ ۱۹ غزوات میں شرکت فرمائی۔ ۹۴ سال کی عمر میں ۷۴ھ (۶۹۳ء) میں انتقال فرمایا۔

نے طواف میں رمل[1] کا حکم دیا اور اب تک اُسی کے موافق عملدرآمد ہے۔ مگر حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں جب حج کا موسم آیا تو انھوں نے طواف میں رمل کرنے سے منع کیا اور یہ کہا کہ مَا لَنَا وَلِلرَّمَلِ کُنَّا نَتَرَاءَیٰ بِہٖ قَوْمًا قَدْ اَھْلَکَھُمُ اللّٰہُ یعنی جس قوم کے دکھانے کو ہم رمل کرتے تھے اس کو خدا نے ہلاک کر دیا۔ (حجۃ البالغہ)

ابوداؤد[2] میں ابوطفیل[3] سے روایت ہے کہ میں نے ابن عباس[4] سے پوچھا کہ لوگ کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے رمل کیا اور یہ سنّت ہے۔ ابن عباسؓ نے جواب دیا کہ اس میں کچھ صحیح ہے کچھ غلط۔ میں نے کہا صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے؟ کہا رمل کرنا آنحضرتؐ کا تو صحیح ہے مگر اس کو سنّت جاننا غلطی ہے۔

۱۔ رمل بازو ہلا کر پہلوانوں کی طرح چلنے کو کہتے ہیں۔ مدینہ کے بخار سے کفارِ مکہ مہاجرین کی نسبت یہ خیال کرتے تھے کہ وہ ضعیف و کمزور یا ہلاک ہو جائیں گے، ان کا گمان غلط کرنے کے لیے آپؐ نے رمل کا حکم دیا تھا۔

۲۔ سنن ابوداؤد۔ حدیث کی مشہور کتاب ہے اور صحاح ستہ میں اس کا چوتھا درجہ ہے۔ امام ابوداؤد سلیمان بن الاشعث سجستانی اس کے مؤلف ہیں۔ ۷۳ سال کی عمر میں ۱۶ شوال ۲۷۵ھ (۸۸۸ء) کو بصرے میں انتقال فرمایا۔

۳۔ ابوالطفیل عامرؓ بن واثلہ۔ آٹھ برس کے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انتقال فرمایا۔ یہ صحابہ میں، دُنیا میں سب سے آخری شخص تھے جو باقی رہ گئے تھے۔ آخر ۱۱۰ھ(?) میں آپ نے بھی مکہ میں وفات پائی۔

۴۔ عبداللہ بن عباسؓ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی اور بڑے پایہ کے صحابی تھے ۶۱۹ء میں مکہ میں پیدا ہوئے۔ حضرت علیؓ کے زمانۂ خلافت میں بصرہ کے حاکم بھی رہے ہیں۔ ۶۸ھ (۶۸۷ء) میں وفات پائی۔

ان دونوں روایتوں سے ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ رمل کے حکم کو مصالح دنیوی سے جانتے تھے اور عبداللہ بن عباسؓ آنحضرتؐ کے ہر فعل کو سنّت یا دین نہیں سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ اکثر حدیثیں اسی مطلب پر دلالت کرتی ہیں۔ طوالت کے خوف سے یہاں نقل نہیں کی گئیں۔

غرض اس میں شک نہیں کہ ایک بہت بڑا حصہ احادیث نبوی کا ایسا تھا جو تبلیغ رسالت سے کچھ علاقہ نہ رکھتا تھا، مگر غلطی سے وہ بھی اس میں شامل سمجھا گیا اور جو طریقہ تمدن اور معاشرت کا اب سے تیرہ سو برس پہلے خاص عرب کو اس زمانہ اور اس ملک کی ضرورتوں کے موافق تعلیم کیا گیا تھا وہ ہر ملک اور ہر قوم کے لیے الی یوم القیامۃ واجب العمل اور واجب الاذعان ٹھیرایا گیا۔ یہاں تک کہ جس طرح نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے مسائل میں علماء کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت تھی، اسی طرح ان باتوں کے دریافت کرنے کی بھی حاجت ہوئی کہ کھانا کس وضع پر کھائیں؟ لباس کیسا پہنیں؟ جوتا منڈا پہنیں یا نوکدار؟ ٹوپی ہلکی پہنیں یا بھاری؟ برتن چینی کے برتیں یا تانبے کے، غیر قوموں کے علوم پڑھیں یا نہ پڑھیں۔ غیر زبانوں میں سے کونسی زبان سیکھیں اور کون سی نہ سیکھیں۔ غیر زبانوں کے الفاظ حسب ضرورت اپنی زبان میں استعمال کریں یا نہ کریں۔ نئی وضع کا مکان جس میں ہر موسم کی آسائش ہو بنائیں یا نہ بنائیں۔ تمباکو میں گڑ ڈال کر پئیں یا خشک، چائے میں کچا دودھ ملا کر پئیں یا اوٹا ہوا؟ غرض کہ انسان کے تمام قوائے جسمانی اور نفسانی اور اس کی تمام حرکات و سکنات اور اس کے تمام اعضاء و جوارح پر قیدیں اور بندشیں لگائی گئیں اور اس کے لیے کوئی موقع ایسا نہ چھوڑا گیا جس میں وہ بدنصیب عقل سے بھی کچھ مشورہ یا کام لے سکے۔

دوسرا جا شبہ یہ پڑھا کہ اعمالِ بدنی اور احکام ظاہری جو کہ بمنزلہ قالب کے تھے اُن میں اس قدر تعمق اور تدقیق کی گئی اور اُن پر اس قدر زور دیا گیا کہ اخلاق فاضلہ اور

ملکاتِ صالحہ جو بمنزلہ روح کے تھے، اور جن کے تر و تازہ رکھنے کے لیے اعمال ظاہری مشروع ہوئے تھے اُن کی طرف اصلاً توجہ باقی نہ رہی اور دُنیوی ترقیات جن کے بغیر دین کی شوکت قائم نہیں رہ سکتی مسدود ہو گئیں۔ خدا اور رسول کی نہیں بلکہ فقہا کی تکلیفات نے عاجز بندوں کو ایسے شکنجے میں کھینچا کہ اُن میں دنیا کے بڑے بڑے کام کرنے کا دم باقی نہیں رہا۔

انبیا کی بعثت کا خاص مقصد انسان کے نفس کی تکمیل اور اس کے اخلاق کی تہذیب تھی اور اگرچہ ہر نبی بہ حسب ظاہر ایک جُدا گانہ شریعت کے ساتھ بھیجا گیا، مگر نتیجہ تمام شریعتوں کا واحد تھا۔ خدا تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے۔ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ

یعنی "مقرر کیا تمھارے لیے وہ دین جو تعلیم کیا تھا ہم نے نوح کو اور جس کی وحی بھیجی ہم نے تجھ کو اور تعلیم کیا ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو، اور وہ یہ ہے کہ برپا رکھو دین کو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو"۔ اس سے معلوم ہوا کہ امت محمدیہ کو وہی دین تعلیم ہوا جو نوح اور ابراہیم اور موسیٰ علیہم السّلام کو تعلیم ہوا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ۔ یعنی "میں صرف اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاق کی خوبیوں کو کمال کے درجے پر پہنچا دوں"۔ اس آیت اور اس حدیث کا مطلب ملانے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تمام ادیان کا خاص مقصد تہذیب اخلاق انسانی کے سوا اور کوئی شے نہ تھی۔

ایک شخص آنحضرتؐ کی خدمت آیا اور اس نے چار بار آپ سے یہ پوچھا کہ دین کیا چیز ہے؟ آپؐ نے ہر بار یہی فرمایا کہ "حسن اخلاق" (احیاء العلوم) فضیل[1] سے روایت ہے

---

[1] فضیل بن عیاض ایک نہایت دیندار زاہد و عابد بزرگ تھے حضرت امام جعفر صادق کے شاگرد اور سری سقطی کے استاد تھے۔ حرم کعبہ میں نماز پڑھتے ہوئے ۱۸۷ھ (۸۰۳ء) میں انتقال فرمایا۔

کہ ایک عورت کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ "وہ ہمیشہ روزے رکھتی ہے اور ہمیشہ شب بیدار رہتی ہے۔ مگر بدخلق ہے، ہمسایوں کو اپنی بدزبانی سے آزار پہنچاتی ہے"۔ آپؐ نے فرمایا" اس میں کچھ خیر نہیں، وہ اہلِ دوزخ سے ہے"۔ (احیاء العلوم) آپؐ فرماتے ہیں کہ "مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے لوگ سلامت رہیں، اور مہاجر وہ ہے جو برائیوں کو چھوڑ دے"۔ (بخاری) ایک شخص نے آنحضرتؐ سے پوچھا کہ اسلام کی کونسی چیز سب سے بہتر ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ کھانا کھلانا اور جان پہچان اور انجان دونوں سے صاحب سلامت کرنی (بخاری)، آپؐ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ" تم میں سے کوئی صاحبِ ایمان نہ ہوگا جب تک اپنے بھائی کے لیے بھی وہی نہ چاہے جو اپنے لیے چاہتا ہے"۔

اس سے ظاہر ہے کہ وضو اور غسل، نماز اور روزہ، حج اور زکوٰۃ اور اسی طرح تمام ظاہری احکام مقصود بالذات نہ تھے بلکہ محض تصفیۂ باطن اور معالجۂ نفس اور تہذیبِ اخلاق کے لیے بمنزلۂ آلات کے تھے۔ چنانچہ نماز کی نسبت ارشاد ہوا کہ وہ "فحشا اور منکر سے باز رکھتی ہے"۔ اور روزہ کی نسبت یہ فرمایا کہ "وہ اس لیے فرض کیے گئے ہیں کہ تم برائیوں سے بچو"۔ اسی طرح قرونِ اولیٰ اور خاص کر قرنِ اول میں طہارت اور نجاست اور عبادات بدنی اور اعمال ظاہری میں اس مبالغہ اور تشدد کا کہیں نام نہ تھا جو اس کے بعد عباد، زہاد، فقہا اور صوفیہ میں پیدا ہوا۔ امام غزالیؒ[۱] احیاء العلوم میں لکھتے ہیں کہ صحابہ کرام کسب معاش اور طلبِ علم اور اعلائے

---

[۱] امام غزالی : ابو حامد محمد بن محمد نام اور حجۃ الاسلام لقب ہے۔ عوام میں اپنی جائے پیدائش غزالہ (واقع طوس ملک خراسان) کی نسبت سے غزالی مشہور ہیں۔ بہت سی معرکۃ الآراء کتابوں مثل احیاء العلوم، جواہر القرآن، تفسیر یاقوت التاویل (چالیس جلدوں میں)، مشکوٰۃ الانوار اور کیمیائے سعادت وغیرہ کے مصنف ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ شہرت احیاء العلوم کو حاصل ہے۔ بہت بڑے صوفی، فقیہ، ادیب، محقق، فلسفی اور ادیب تھے۔ ۴۵۰ھ (۱۰۵۸ء) میں پیدا ہوئے اور ۵۰۵ھ (۱۱۱۱ء) میں وفات پائی۔

کلمۃ اللہ اور ضروری کاموں میں ایسے مصروف تھے، زمین پر نماز پڑھتے تھے، خاک پر بیٹھتے تھے۔ گھوڑے اور اونٹ وغیرہ کے پسینے سے پرہیز نہ کرتے تھے، دل کی پاکیزگی میں بہت کوشش کرتے تھے۔ ظاہری پاکی پر چنداں التفات نہ کرتے تھے۔ غیر مذہب والوں کے برتن کا پانی برابر استعمال کرتے تھے۔ جس برتن میں عام لوگوں کے ہاتھ پڑیں، اس سے نفرت نہ کرتے تھے۔ انتہیٰ۔

آنحضرت بھی ظاہری احکام کی چنداں پابندی نہ فرماتے تھے۔ کبھی ایک چلو سے مضمضہ[1] اور استنشاق[2] دونوں کر لیتے تھے۔ کبھی دو چلو سے کبھی تین سے۔ جس زمین پر نماز پڑھتے اسی پر تیمم کر لیتے اور فرماتے کہ جہاں نماز کا وقت آجائے وہیں مسلمان کی مسجد ہے اور وہیں اس کی طہارت ہے۔ ہمیشہ مقتدیوں کا خیال رکھتے تھے اگر جماعت میں سے کسی بچے کے رونے کی آواز آتی تو نماز جلد ختم کر دیتے۔ اگر کوئی بچہ نماز میں آپؐ سے آن لپٹتا تو اُسے اُٹھا کر کندھے پر بٹھا لیتے۔ بارہا امام حسینؓ سجدے کی حالت میں آپ کی پشتِ مبارک پر چڑھ گئے اور آپؐ نے اُن کے خیال سے سجدے کو طول دیا۔ کبھی آپ نماز میں ہوتے تھے اور حضرت عائشہؓ اپنے حجرہ کی کنڈی کھٹکھٹاتیں تو آپ نماز ہی میں جاکر باہر کی کُنڈی کھول دیتے تھے۔ کبھی آپ سے نماز میں کوئی سلام کرتا تو آپؐ نماز ہی میں اشارہ سے اس کو جواب دیتے۔ ایک بار بنی عبدالمطلب کی دو لڑکیاں لڑتی ہوئی جب آپؐ کے قریب آئیں تو نماز ہی میں آپ نے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر ان کو چھڑا دیا۔ کبھی جوتیوں سمیت نماز پڑھتے تھے اور کبھی ننگے پاؤں۔ (سفرالسعادۃ) ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے ظہر کو عصر کے ساتھ اس حالت میں جمع کیا کہ نہ سفر تھا نہ کوئی خطرہ تھا اور نہ بارش تھی۔ لوگوں نے ابن عباسؓ سے پوچھا کہ آپؐ نے ایسا کیوں کیا؟ کہا، کہ اس لیے کہ امت پر تنگی نہ رہے۔ (ترمذی)

---

[1] مضمضہ۔ کلی کرنے کو کہتے ہیں۔

[2] استنشاق کے معنی ناک میں پانی ڈالنا۔

موسم حج میں ایک شخص نے آپؐ سے آکر عرض کیا کہ میں نے قربانی سے پہلے سر منڈوالیا ہے فرمایا کچھ حرج نہیں۔ اب قربانی کرے۔ پھر ایک اور شخص نے آکر کہا کہ میں نے کنکریاں پھینکنے سے پہلے قربانی کرلی ہے۔ فرمایا کچھ حرج نہیں، اب کنکریاں پھینک لے۔ اس طرح جس نے بے ترتیبی کی بابت پوچھا اس سے آپ نے یہی فرمایا کہ اِفْعَلْ وَلَا حَرَجَ (بخاری)

عمروؓ بن عاصؓ[1] ایک آیت سے یہ سمجھ گئے کہ جنب کی ضرورت کی حالت میں تیمم کافی ہے اور عمرؓ بن خطاب ایک دوسری آیت سے یہ سمجھے کہ تیمم لمس نساء کے لیے ہے نہ جنابت کے لیے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں پر کوئی اعتراض نہیں فرمایا۔ طارقؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص جنبی تھا اُس نے نماز پڑھی، جب آپؐ سے ذکر کیا تو فرمایا تو ٹھیک سمجھا۔ پھر ایک دوسرے شخص نے جنابت کی حالت میں تیمم کر کے نماز پڑھ لی اور جب آپؐ سے ذکر کیا تو اسے بھی آپؐ نے یہی فرمایا کہ تو ٹھیک سمجھا۔ (عقد الجید) غرض کہ تمام اعمالِ ظاہری اور عباداتِ بدنی میں آپؐ کے برتاؤ ایسے تھے جن میں امت کے لیے آسانی ہو۔

شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ البالغہ میں لکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں احکام کی بحث ایسی نہ تھی جیسی فقہا کے وقت میں ہوئی کہ وہ کمال اہتمام سے ہر شئے کے ارکان اور شرائط اور آداب جدا جدا بیان کرتے ہیں اور فرضی صورتوں پر گفتگو کرتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تو یہ حال تھا کہ صحابہ نے جس طرح آپ کو وضو کرتے دیکھا اسی طرح آپ بھی کرنے لگے۔ نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ نے کسی چیز کو رکن ٹھہرایا اور نہ ادب ٹھہرایا، اسی طرح انھوں نے جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے اور

---

[1] عمرو بن عاص سہمی قریشی مشہور صحابی، زبردست بہادر اور فاتح مصر ہیں۔ سنہ ۸ھ یا سنہ ۷ھ میں حضرت خالد بن ولیدؓ کے ساتھ مکہ سے حاضر ہو کر اسلام لائے، اور عمان کے حاکم مقرر کئے گئے، پھر انھوں نے حضرت عمرؓ کے زمانے میں مصر فتح کیا، حضرت معاویہؓ کے بڑے مشیروں میں سے تھے، ۹۰ برس کی عمر سنہ ۴۳ھ میں وفات پائی۔ [2] طارقؓ، آنحضرت صلعم کے صحابہ میں سے ہیں۔

اور حج کرتے دیکھا ویسا ہی آپ بھی کرنے لگے۔ . . . . آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کبھی یہ نہیں فرمایا کہ وضو میں چھ فرض ہیں یا چار۔ اور کبھی آپ نے (فقہا کی طرح) کوئی صورت فرض کر کے اس پر کوئی حکم نہیں لگایا الا ماشاء اللہ اور صحابہ بھی ایسے امور میں آپ سے کچھ سوال نہ کرتے تھے۔ ابن عمر بن اسحٰق[1] سے منقول ہے کہ اصحابِ نبیؐ میں سے جتنے صحابیوں کو میں نے دیکھا ہے وہ اُن کی نسبت زیادہ ہیں جو مجھ سے پہلے گزر گئے۔ میں نے کوئی گروہ دین میں آسانی کرنے والا اور سختی نہ کرنے والا اُن سے زیادہ نہیں دیکھا۔ (دارمی)، عبادہ[1] بن بسیر کندی سے لوگوں نے سوال کیا کہ اس عورت کی بابت کیا حکم ہے جو کسی ایسے قافلہ میں مرجائے جس میں اس کا کوئی ولی نہ ہو۔ عبادہ نے کہا "جن لوگوں کو میں نے دیکھا ہے نہ وہ تمہاری سی نکتہ چینیاں کرتے تھے اور نہ ایسے مسائل پوچھتے تھے۔" (دارمی)

ہندوستان کے ایک پرہیزگار اور ذی علم امیر نے شیخ العلماء عبداللہ سراج مکی سے حقّے کی باحت اور حرمت کی بابت سوال کیا۔[2] شیخ نے مسکرا کر یہ آیت پڑھی کہ وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَٰذَا حَلَالٌ وَهَٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ ۔

یعنی "نہ کہو تم اپنی زبانوں کی بے اصل باتوں کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے خدا پر جھوٹ باندھنے کے لیے"

افسوس کہ ہمارے علماء نے احکام ظاہری میں تعمق اور تدقیق کو اس قدر کام فرمایا کہ شریعت کا موضوع بالکل بدل گیا اور جس دین کی نسبت اَلدِّیْنُ یُسْرٌ کہا گیا تھا وہ اَلدِّیْنُ عُسْرٌ کہنے کا مستحق ہو گیا۔ طہارت اور نجاست کی تحقیق میں اتنا کچھ لکھا گیا کہ انسان کی تمام عمر اس کے دیکھنے اور پڑھنے اور سمجھنے کے لئے کفایت نہیں کر سکتی۔ اگر فقط آمین اور رفع یدین

---

[1] عمر بن اسحٰق اور عبادہ بن بسیر کندی دونوں مشہور تابعی ہیں۔

[2] یہ سوال نواب مصطفیٰ خاں مرحوم (شیفتہ حسرتی) آف جہانگیر آباد نے کیا تھا اور راقم نے خود اُن کی زبان سے یہ روایت سنی ہے (حالی)

اور قراءتِ فاتحہ کی تحقیقات میں کوئی شخص اپنا تمام وقت صرف کرے تو اس کی عمر کا ایک بڑا حصہ اس میں تمام ہو جائے گا۔ اگر کوئی شخص ایک سجدۂ سہو کی تمام جزئیات کو ازبر کرنا چاہے اور اس نالائق دنیا کی ضروریات بھی سرانجام دیتا ہے تو نہایت دشوار معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام جزئیات کو احاطہ کر سکے، ان کلمات کا جن کے زبان سے نکلتے ہی ایمان باقی نہیں رہتا، ایک غیر محدود سلسلہ ہے جن کو کوئی حد و حصر نہیں کر سکتا۔ اسی طرح معاملات میں وہ تدقیقیں کی گئیں کہ کوئی بیع اور کوئی عقد فقہا کے اصول کے موافق صحیح نہیں ٹھہر سکتا۔ علمائے دین کے سوا جن کی نسبت بدگمانی نہیں کی جا سکتی۔ شاید ہی کسی اُمتی کا وضو، غسل، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، بیع، شراء، نکاح، طلاق وغیرہ صحیح ہوتا ہوگا۔ امام شعرانی[1] نے میزان میں لکھا ہے کہ "دین میں جتنی آسانیاں ہیں وہ خدا کی اور رسولؐ کی طرف سے ہیں اور جتنی دشواریاں ہیں وہ علماء کی طرف سے ہیں" واقعی یہ قول نہایت صحیح ہے۔ کیونکہ ہم اپنے عہد کے علماء کا حال ایسا ہی دیکھتے ہیں۔ انہی دنوں میں ایک مولوی صاحب نے جو کہ عامل بالحدیث ہیں۔ دس مسئلوں کی نسبت یہ اشتہار دیا تھا کہ اگر ان کے ثبوت میں کوئی آیتِ قرآنی یا احادیث صحیحہ جن کی صحت میں کسی کو کلام نہ ہو، اور جس مدعا کے لیے وہ پیش کی جائیں اس کے واسطے نصِ صریح قطعی الدلالہ ہوں پیش کریگے تو فی حدیث اور فی آیت دس روپیہ انعام دوں گا۔ اس کے جواب میں ایک دوسرے مولوی صاحب نے نہایت تعجب سے یہ لکھا ہے کہ اگر احتجاج کا مدار صرف آیت اور اس حدیث صحیح پر ہو جس کی صحت میں کسی کو کلام نہ ہو، اور اثبات دعویٰ کے لیے نص صریح قطعی الدلالہ ہو تو دینِ اسلام کے بتیس حصوں میں سے اکتیس حصے باطل ہو جائیں گے اور صرف ایک بتیسواں حصہ باقی رہ جائے گا اور اس بات کو بہت عمدہ طور سے ثابت کیا ہے۔

---

[1] عبدالوہاب بن محمد رفیع الدین احمد شعرانی بڑے محدث اور مصنف تھے۔ ۹۷۳ھ میں انتقال کیا۔

مجیب صاحب کی اس تقریر سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ہمارے علمأ کے نزدیک دین کی عظمت اور بڑائی اس میں ہے کہ وہ ایک ایسا دفتر طویل ہو جو داستان امیر حمزہ اور بوستانِ خیال کی طرح سمیٹے نہ سمٹے۔ نیز ان کے نزدیک ایسی تقریر کے بطلان میں کچھ شبہ نہیں ہے جس سے دین کا اختصار لازم آئے۔ مگر اس تعمق اور تشدد میں علمأ کے ساتھ حضرات صوفیہ کو بھی شامل کرنا ضرور ہے جنھوں نے عباداتِ شاقہ اور بے انتہا اذکار و اشغال اور دائمی روزے اور سخت سے سخت ریاضتیں اختیار کر کے اور دن کو ریس دلائی اور رامت ...... کو اور بھی زیادہ بوجھل اور گرانبار کر دیا اور تحریف دین کی ایک دوسری بنیاد ڈالی۔

صحابہ نماز بھی پڑھتے تھے، روزہ بھی رکھتے تھے اور دُنیا کے سارے کام بھی سرانجام کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ کا قول تھا کہ اَحْسُبُ جِزْیَۃَ الْبَحْرَیْنِ وَاَنَا فِی الصَّلٰوۃِ وَاُجَھِّزُ الْجَیْشَ وَاَنَا فِی الصَّلٰوۃِ۔ یعنی "میں بحرین کے خراج کا حساب لگاتا ہوں اور نماز میں بھی ہوتا ہوں اور لشکر کی تیاری کرتا ہوں اور نماز میں بھی ہوتا ہوں" وہ نکاح کرتے تھے۔ بال بچوں کے لیے کمائی کر کے لاتے تھے۔ مہماتِ خلافت کو سرانجام کرتے تھے۔ خلیفۂ وقت کی اعانت میں مصروف رہتے تھے۔ لوگوں کے جھگڑے فیصلہ کرتے۔ غرض کہ دُنیا کے تمام کام جن کے بغیر دین کی شوکت ہرگز نہیں رہ سکتی، سرانجام کرتے تھے۔ اگر وہ بھی حضرات صوفیہ کی طرح خانقاہوں میں ہو بیٹھتے اور نماز روزہ اور ذکر و شغل کے سوا سارے کام چھوڑ دیتے تو آج بغداد میں پیرانِ پیر[1] کی درگاہ اور اجمیر میں خواجہ خواجگان[2] کے مزار کا کہیں نام و نشان نہ ہوتا۔

---

[1] پیران پیر حضرت خواجہ شیخ عبدالقادر جیلانی کو کہتے ہیں۔ بغداد کے قریب قصبہ جیلان میں ۲۹ شعبان ۴۷۰ھ (۱۰۷۷ء) کو پیدا ہوئے۔ بغداد میں تحصیل علم کی۔ اپنے زمانے کے مجدد۔ اعلیٰ درجہ کے صوفی۔ بے نظیر عالم۔ علم دین پر آپ نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں جن میں سے غنیۃ الطالبین فقہ میں اور بہجۃ الاسرار تصوف میں مشہور ہیں۔ بغداد میں بعمر ۹۱ سال ۵۶۱ھ (۱۱۶۵ء) میں آپ کی وفات ہوئی۔ [2] خواجۂ خواجگان حضرت معین الدین سنجری چشتی اجمیری (باقی صفحہ آئندہ پر)

شاید وہاں کوئی عظیم الشان آتشکدہ، اور یہاں کوئی عالی شان بت خانہ نظر آتا جہاں مسلمانوں کی ہوا تک نہ پہنچ سکتی۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ حجۃ البالغۃ میں لکھتے ہیں کہ عبادت میں سب سے زیادہ مضر چیز انسان کا عبادت سے اُکتا جانا ہے۔ کیونکہ پھر اس عبادت میں خشوع کی صفت باقی نہیں رہتی اور اس کی تمام مشقتیں جو وہ عبادت میں کرتا ہے عبادت کی روحانیت سے محروم رہ جاتی ہیں۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ "ہر چیز کی حرص ہوتی ہے اور ہر حرص کے بعد سستی اور ماندگی ضرور ہے۔" اسی واسطے شارع نے عبادات کی مقدار ایسے طور متعین کی ہے جیسے دوا کی مقدار مریض کے لیے، کہ نہ اس سے زیادہ ہونی چاہیئے نہ کم۔ نیز اصل مقصود تہذیب نفس ہے۔ ایسے طور پر کہ تدابیرِ حسن معیشت اور حقوق عباد فروگزاشت نہ ہونے پائیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "میں روزہ بھی رکھتا ہوں، افطار بھی کرتا ہوں، تہجد بھی پڑھتا ہوں، سوتا بھی ہوں۔ نکاح بھی کرتا ہوں، سو جس نے میرے طریقے کو چھوڑا اس کو مجھ سے علاقہ نہیں۔" نیز شریعت کا بڑا مقصد یہ ہے کہ دین کی باتوں میں دقتیں پیدا کرنے کا راستہ بند کیا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ لوگ اس کو لازم پکڑ لیں اور جو ان کے بعد پیدا ہوں اُن کو ان عبادات کی فرضیت کا یقین ہو جائے اور رفتہ رفتہ دین محرف ہو جائے۔ انھیں مصلحتوں سے آں حضرتؐ نے چاہا کہ لوگ اعمال میں میانہ روی اختیار کریں اور یہ فرمایا کہ "خُذُوا مِنَ الْاَعْمَالِ مَا تُطِیْقُوْنَ" انتہیٰ ملخصًا۔

الغرض یہ دوسرا حاشیہ جو فقہا کے تعمق اور صوفیہ کے تشدد سے دین اسلام پر چڑھا دُس

گذشتہ سے پیوستہ: بہت بڑے صوفی، عالم اور ایک باکمال بزرگ تھے۔ ۵۳۶ھ م ۱۱۴۲ء میں اصفہان میں پیدا ہوئے۔ ۵۲ سال کی عمر میں ہندوستان میں تشریف لائے اور ۴۵ برس اجمیر میں قیام فرما کر تبلیغ اسلام میں مصروف رہے ۶۳۳ھ م ۱۲۳۵ء میں وفات پائی۔ آپ کا مزار اجمیر میں زیارت گاہ عام و خاص ہے۔

نے بھی اہلِ اسلام کو سخت نقصان پہنچایا اور اُس کے بُرے نتائج اس وقت ہم آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں مسلمانوں کی دُنیوی ترقیات اس سے بالکل مسدود ہی نہیں ہوگئیں بلکہ تنزل سے سے مبدل ہوگئیں اور دین اسلام جو ایک صاف اور ہموار اور نہایت نزدیک ستہ تھا وہ ان کو ایسا پیچدار اونچا نیچا اور دور دراز نظر آیا جس کے طے کرنے میں انسان کو ادھر اُدھر دیکھنے کی مہلت نہیں مل سکتی دوسرے اُن کی تمام ہمت اور توجہ طہارت ظاہری اور احکام جسمانی کی طرف منعطف ہوگئی اور طہارت باطنی اور تہذیب روحانی جو کہ اصل مقصود تھی بالکل فراموش ہوگئی اور وہ سراسر عیسیٰ علیہ السلام کے اس قول کے مصداق ہوگئے جو انھوں نے یہودیوں کی طرف مخاطب ہوکر کہا تھا کہ "تم اپنے برتنوں کو باہر سے دھوتے ہو لیکن اندر کی ناپاکی کو دُور نہیں کرتے" یہی سبب ہے کہ جس قدر بداخلاقیاں علماء، عباد اور زہاد و مجامع میں دیکھی جاتی ہیں وہ عام مسلمانوں میں بہت کم پائی جاتی ہیں۔

تیسرا حاشیہ واعظوں کی نادانی اور صوفیوں کی سادہ لوحی یا خود غرضوں کی بدباطنی سے اس پاک دین پر چڑھا۔ انھوں نے اعمال ظاہری کی ترغیب یا کسی مذہب کی تائید یا پاتعصب کے جوش میں کسی دُنیوی غرض کے پورا کرنے کے بے شمار کڑوں اور ہزاروں حدیثیں وضع کیں اور رفتہ رفتہ یہ سراسر جعلی اور بناوٹی احادیث بھی دین کا ایک اصلی جزو قرار پاگئیں۔ اگرچہ محققین نے اُن کی تحقیقات اور چھان بین کرنے میں کوتاہی نہیں کی اور ان کی موضوعات اور مفتریات کو احادیث صحیحہ سے جہاں تک ہو سکا جُدا کیا مگر جرح و قدح صرف کتابوں ہی تک محدود رہی اور واعظوں کے رنگین فقرے جو کم سے کم ہزار برس تک وعظ کی بھری مجلسوں میں وقتاً فوقتاً مسلمانوں پر چلتے رہے وہ مشرق سے مغرب تک اور جنوب سے شمال تک وبا کی طرح پھیل گئے۔

علماء کی ایک بڑی جماعت (جیسا کہ جامع الاصول اور شرح نخبۃ الفکر وغیرہ میں تصریح کی گئی ہے) اس بات پر متفق ہوگئی تھی کہ ترغیب اور ترہیب کے لیے حدیثیں وضع کرنی یا ضعیف اور منکر حدیثوں کی روایت کرنی جائز ہے۔

اسی بنا پر بے شمار حدیثیں ترغیب کے لیے وضع کی گئیں۔ مثلاً مؤذنوں کے فضائل میں ایسا مبالغہ کیا گیا کہ ان کے مراتب سے بڑھ کر انسان کے لیے وَلَوْ کَانَ نَبِیًّا اَوْ اِمَامًا کوئی درجہ تصور میں نہیں آسکتا۔ مثلاً یہ حدیث کہ "مؤذن کے لیے ہر شے جس کو اس کی اذان کی آواز پہنچتی ہے، پتھر ہو یا درخت یا ڈھیلا یا خشک یا تر قیامت کے دن سب گواہی دیں گے اور اس مسجد کے تمام نمازیوں کے برابر اس کو ثواب ملے گا۔" یا یہ حدیث کہ "قیامت کے دن سونے کی کرسیاں لائی جائیں گی جن میں یاقوت اور موتی جڑے ہوئے ہوں گے اور مسندیں اور استبرق کے فرش پر بچھائی جائیں گی، پھر ان پر نور کے سائبان لگائے جائیں گے اور پکارا جائے گا کہ کہاں ہیں مؤذن، تاکہ ان پر آکر بیٹھیں۔" یا مثلاً مسجد کی خدمت کرنے والوں کے فضائل میں جیسے:

"جس نے مسجد میں چراغ روشن کیا، جب تک چراغ روشن رہے، اس کے لیے فرشتے اور حاملانِ عرش برابر استغفار کرتے رہتے ہیں۔"

"جس نے مسجد میں قندیل لٹکائی یا بوریا بچھایا اس پر فرشتے برابر درود بھیجتے ہیں جب تک وہ قندیل نہیں بجھتی یا وہ بوریا نہیں ٹوٹتا۔"

"جس نے خدا کے کسی گھر میں جھاڑو دی اس نے گویا چار سو حج کیے اور چار سو بردے آزاد کیے اور چار سو روزے رکھے اور چار سو جہاد کیے۔"

یا مثلاً حفظۃ القرآن کے فضائل میں جیسے یہ حدیث کہ "حافظ قرآن کی فضیلت غیر حافظ پر ایسی ہے جیسے کہ خالق کی فضیلت مخلوق پر۔" اسی طرح سینکڑوں روزے اور ہزاروں نمازیں اور بے انتہا طواف اور بے شمار صدقے وضع کیے گئے اور ان کے اجر اور ثواب کے بیان کرنے میں حد سے زیادہ مبالغہ کیا گیا۔

ترہیب و تخویف کے لیے ایسے ہی مبالغہ کے ساتھ حدیثیں وضع کی گئیں، مثلاً:

"جس نے دو نمازوں کو بغیر عذر کے جمع کیا وہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوا۔"

"مسجد کے ہمسایہ کی نماز مسجد کے سوا کہیں نہیں ہوتی۔"

"جو شخص مسجد میں دنیا کی باتیں کرتا ہے خدا اس کے تمام اعمال حسنہ کو ضائع کر دیتا ہے۔"

"جس نے بے نماز کی مدد ایک لقمہ سے کی اس نے گویا تمام نبیوں کے قتل میں اعانت کی۔"

بہت سی حدیثیں اپنے اپنے مذہب کی تائید اور نصرت کے لیے بنائی گئیں۔ مثلاً:

"جس نے نماز میں رفع یدین کیا اس کی نماز باطل ہے۔"

"جس نے رکوع میں رفع یدین کیا اس کی نماز باطل ہے۔"

"جب سورۂ کوثر نازل ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیلؑ سے پوچھا کہ نحر سے کیا مراد ہے۔ کہا یہ مراد ہے کہ جب نماز کی نیت باندھو تو پہلی تکبیر پر اور رکوع کرتے وقت اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع یدین کرو۔"

بہت سی حدیثیں تعصب یا تنفر کی وجہ سے بنائی گئیں جیسے امام شافعیؒ[1] اور امام اعظمؒ[2] کی مدح یا ذم میں یا جیسے حضرت معاویہؓ[3] بن ابی سفیانؓ کی مدح یا ذم میں مثلاً یہ حدیثیں:۔

---

[1] امام شافعی۔ اصل نام محمد بن ادریس۔ کنیت ابو عبداللہ۔ ناصر الحدیث لقب اور شافعی اپنے جد اعلیٰ شافع بن سائب کی نسبت سے مشہور ہیں۔ ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے۔ فرقہ شافعیہ کے امام بڑے مجتہد، فقیہ اور محدث تھے۔ آپ کے پیرو عرب اور ہندوستان میں بکثرت آباد ہیں۔ ۲۰۴ھ میں وفات پائی۔

[2] نعمان بن ثابت نام۔ ابو حنیفہ کنیت اور امام اعظم لقب ہے۔ کوفہ کے رہنے والے تھے اور ۸۰ھ (۷۰۰ء) میں پیدا ہوئے۔ اہل سنت والجماعت کے امام ہیں اور بہت بڑے فقیہ اور محقق شریعت تھے۔ رجب ۱۵۰ھ (۷۶۷ء) میں آپ کا انتقال ہوا۔

[3] معاویہؓ۔ خاندان بنو امیہ کے بانی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی ہیں۔ ۸ھ (۶۳۰ء) میں بموقع فتح مکہ مسلمان ہوئے۔ سیاست اور تدابیر ملکی میں اعلیٰ درجہ کا دماغ پایا تھا۔ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے زمانے میں علاقہ شام کے گورنر رہے مگر حضرت علیؓ کے بعد تمام ممالک اسلامیہ انھیں کے زیر نگیں تھے۔ ثانی

"خدا کے نزدیک تین امین ہیں۔ میں۔ جبرئیل۔ اور معاویہ۔"

"ہر اُمت کے لیے ایک فرعون ہے اور اس امت کا فرعون معاویہ ہے۔"

"ایک بار آنحضرت نے جبرئیل سے ہاتھ ملانا چاہا۔ جبرئیل نے ہاتھ ملانے سے انکار کیا۔ آپؐ نے سبب پوچھا۔ کہا۔ تم نے ایک یہودی کا ہاتھ پکڑا تھا اور جو ہاتھ کافر کے ہاتھ سے مس کرے میں اُس سے ہاتھ ملانا پسند نہیں کرتا۔"

"جو شخص یہودی یا نصرانی سے مصافحہ کرے اس کو اپنا ہاتھ دھونا اور وضو کرلینا چاہیے"

امام ابن جوزی[1] نے لکھا ہے کہ حدیثیں وضع کرنے والوں کا ایک بہت بڑا گروہ ہے جن کے راس و رئیس وہب بن وہب اور قاضی بختری وغیرہ تیرہ آدمی ہیں۔ انتہی

انھیں تیرہ آدمیوں میں سے ایک محمد ابن عکاسہ کرمانی ہے جس نے محمد بن تمیم فاریابی کی شرکت میں دس ہزار حدیثوں سے زیادہ وضع کی ہیں۔

ابن جوزی کہتے ہیں کہ جن کی حدیثوں میں وضع اور کذب وغیرہ کے آثار پائے جاتے ہیں وہ کئی قسم کے لوگ ہیں۔

پہلا گروہ۔ بعضے تارکِ دنیا ہیں جنھوں نے حدیث کی نگہداشت سے غفلت کی۔

دوسرا گروہ۔ بعضوں کی تحریریں ضائع ہوگئیں اور انھوں نے اپنی یاد کے بھروسے پر غلط روایتیں کردیں۔

تیسرا گروہ۔ بعضے ثقات بھی ہیں، جو بڑھاپے میں آ کر خرف ہو گئے

گزشتہ سے پیوستہ:۔ افریقہ کے اکثر علاقے، یونان کا کچھ حصہ، افغانستان اور سندھ آپکے زمانے میں فتح ہوئے۔ آپنے دمشق کو اپنا دارالخلافہ بنایا جو بعد میں تمام خلفائے بنی اُمیّہ کے زمانے میں اسلامی سلطنت کا پایۂ تخت رہا۔ ۶۰ھ میں وفات پائی۔

[1] ابن جوزی۔ بغداد کے بہت بڑے محدث۔ فرقۂ حنبلیہ کے زبردست عالم۔ نہایت مشہور واعظ۔ سیکڑوں کتابوں کے مصنف اور اعلیٰ درجہ کے مقرر تھے۔ عبدالرحمٰن نام تھا۔ ۵۰۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۶ جون ۱۲۰۱ء مطابق ۱۲ رمضان ۵۹۷ھ شب جمعہ کو وفات پائی۔ شیخ سعدی کے اُستاد تھے۔

چوتھا گروہ۔ بعضوں نے سہو سے غلط روایت کی، اور جب اپنی غلطی سے خبردار ہوئے تو ان کو صحیح روایت کرنے سے شرم آئی۔

پانچواں گروہ۔ بعضے زندیق اور ملحد ہیں جنھوں نے شریعت میں رخنہ اور خرابی ڈالنے کے لیے عمداً اور جان بوجھ کر حدیثیں وضع کیں۔ حماد بن زید نے کہا ہے کہ "زنادقہ نے چار ہزار حدیثیں وضع کی ہیں"۔ جس وقت ابن ابی العوجار کو وضع حدیث کے جرم میں قتل کرنے لگے تو اس نے اقرار کیا کہ "میں نے تمھارے دین میں چار ہزار حدیثیں بنائی ہیں جن میں حرام کو حلال اور حلال کو حرام ٹھیرایا ہے"۔

چھٹا گروہ۔ بعضے ایسے بھی تھے جو ثواب و اجر کی امید پر ترغیب و ترہیب کے لیے حدیثیں وضع کرتے تھے، گویا ان کے نزدیک شریعت ناقص تھی، جس کی تکمیل کی ضرورت تھی۔

ساتواں گروہ۔ بعضوں نے اپنے مذہب کی تائید میں جعلی احادیث بنائیں۔ چنانچہ اہل بدعت میں سے ایک شخص تائب ہوا تو اس نے کہا کہ حدیث کے لینے میں احتیاط کیا کرو اور دیکھا کرو کہ کس شخص سے حدیث لیتے ہو۔ ہمارا مدت تک یہ حال رہا کہ جس بات کو چاہا حدیث نبویؐ کے پیرایہ میں بیان کر دیا۔

آٹھواں گروہ۔ بعضوں نے یہ ٹھیرا لیا تھا کہ جس کسی کا کوئی عمدہ قول ہاتھ لگا اس میں اسناد اپنی طرف سے شامل کر دیجیے اور نبی تک اسناد کو پہنچا دیجیے۔

نواں گروہ۔ بعضوں نے سلاطین و ملوک کو خوش کرنے اور ان کا تقرب حاصل کرنے کے لیے یہ شیوہ اختیار کیا تھا۔

دسواں گروہ۔ بعضے قصہ گو اور واعظ تھے، جو لوگوں کو حسن بیان پر فریفتہ کرنے کے لیے حدیثیں وضع کرتے تھے اور کتب صحاح میں اس قسم کی حدیثیں نقل کی گئی ہیں۔ انتہیٰ۔

اس کے سوا اور بھی اسباب وضع و افترا کے بیان کیے ہیں۔ مَنْ شَاءَ فَلْیَرْجِعْ اِلَی الْفَوَائِدِ الْمَجْمُوْعَۃِ لِلْمُحَدِّثِ بْنِ الشَّوْکَانِیِّ۔

چوتھا حاشیہ چڑھا کہ مفسرین نے اپنی تفسیروں میں ہزاروں موضوع اور ضعیف و منکر حدیثیں بھر دیں اور یہ قابل نفریں کام انھوں نے مختلف طریقوں سے کیا۔

صحابہ، تابعین، تبع تابعین و من بعدہم کے اقوال بلا ذکر اسناد بہ حسب ضرورت اپنی اپنی تفسیروں کی تقویت کے لیے حدیث نبوی کے پیرایہ میں نقل کر دیے گئے۔

یہودیوں سے سُنے سنائے لاانتہا جھوٹے اور بے بنیاد قصے تفسیروں میں بھر دیے گئے۔

بہت سے مسائل اصول و فروع کے قرآن شریف کی عبارات و اشارات سے محض اپنی رائے اور قیاس کے موافق استنباط کئے گئے۔ نہ اس کی تائید کے لیے کوئی حدیث صحیح نقل کی اور نہ کسی صحابی یا تابعی کا قول لکھا۔

جن موجوداتِ علوی و سفلی کا ذکر قرآن شریف میں آیا ہے اُن کے حقائق کی تشریح ارسطو اور بطلیموس اور دیگر فلاسفۂ یونان کے موافق کی گئی۔

متکلمین نے مخالف فرقوں کو الزام دینے اور اپنا مدعا ثابت کرنے کے لیے صدہا آیتوں کی تفسیریں اپنی مرضی کے موافق کیں اور آیات قرآنی کو کھینچ تان کر کہیں سے کہیں لے گئے اور یہ تمام کوڑا کرکٹ اصل دین میں داخل سمجھا گیا اور وحی سماوی کی طرح واجب التسلیم خیال کیا گیا۔

"شرح جامع صغیر" میں علامہ ابن کمال سے نقل کیا گیا ہے کہ "تفسیر کی کتابیں موضوع حدیثوں سے بھری پڑی ہیں"۔

اسی طرح مفسرین کے قصص و اخبار کی نسبت ابو الامداد ابراہیم نے قضاء الوطر حاشیہ نخبۃ الفکر میں اور ملا علی قاری[1] نے شرح الشرح نخبۃ الفکر میں اور علامہ سیوطی[2] نے اتقان میں

---

[1] ملّا علی قاری۔ ملا علی بن سلطان محمد ہروی مکی۔ ایک نہایت مشہور محدث، فقیہ اور متکلم گزرے ہیں، فقہ حنفیہ کے زبردست عالم تھے، بہت سی کتابوں کے مصنف اور ابن حجر مکی اور شیخ عبداللہ سندھی کے شاگرد ہیں۔ شرح فقہ اکبر، مرقاۃ شرح مشکوٰۃ۔ موضوعات، نور القاری شرح صحیح بخاری، شرح مسلم، جمالین شرح جلالین، شرح موطا امام محمد
(باقی حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

اور علامہ ذہبیؒ[لہ] نے میزان الاعتدال میں تصریح کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً یہ تمام قصے اہلِ کتاب کے ہاں سے لیے گئے۔ اصل یہ ہے کہ فتح شام میں عبداللہ[۵۲] بن عمرو بن عاصؓ کو اہلِ کتاب کی بہت سی کتابیں یہ قدر ایک بار شتر کے ہاتھ لگی تھیں۔ سو جو باتیں ان سے بہ کثرت منقول ہیں وہ صرف اخبار اور قصے بنی اسرائیل کے اور روایات اہلِ کتاب کی ہیں اور اسی طرح بہت سی روایتیں عبداللہ[۵۳] بن سلامؓ سے بھی اسی قسم کی مروی ہیں پھر مفسرین کے دوسرے طبقے میں مجاہد[۵۴] اور تیسرے طبقے میں مقاتل[۵۵] بن سلیمان اور ان کے سوا اور لوگ

گزشتہ سے پیوستہ :- وغیرہ بیسیوں کتابوں کے مصنف ہیں ۶۷۱ھ میں وفات پائی۔

۵۱ جلال الدین سیوطی - شافعیہ کے امام۔ اعلیٰ درجہ کے مفسر، زبردست نحوی اور مصر کے رہنے والے تھے۔ تقریباً چارسو کتابیں آپ نے لکھی ہیں۔ تفسیر اتقان۔ در المنثور نصف اول تفسیر جلالین تاریخ الخلفا جمع الجوامع بیاض التفسیر حسن المحاضرہ اور طبقات المفسرین وغیرہ ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ ۸۴۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۹۱۱ھ (۱۵۰۵ء) میں وفات پائی۔

حاشیہ صفحہ ہٰذا لہ: ذہبی۔ ابوعبداللہ شمس الدین بن محمد نہایت مورخ اسماء الرجال کے ماہر اور محدث تھے ۱۲ جلدوں میں تاریخ اسلام لکھی۔ دول الاسلام، میزان الاعتدال، تذکرۃ الحفاظ وغیرہ کے مصنف ہیں۔ ۷۴۸ھ میں وفات پائی۔

۵۲ عبداللہ۔ حضرت عمرو بن عاصؓ کے صاحبزادے اور نہایت متقی اور پرہیزگار صحابی ہیں۔ ان کی وفات میں سخت اختلاف ہے ۶۳ھ، ۶۵ھ، ۶۷ھ، ۶۸ھ اور ۹۵ھ ان کا سنہ وفات لکھا ہے۔

۵۳ عبداللہ بن سلام: مدینہ کے سربرآوردہ رئیس اور یہودیوں کے زبردست فاضل اور عالم تھے۔ ۲ھ میں اسلام لائے ۴۳ھ میں مدینہ ہی میں انتقال فرمایا۔

۵۴۔ مجاہد بن جبیر۔ تابعی اور مکہ کے فقہا اور قاریوں میں سے ہیں مشہور و معروف بزرگ اور قراۃ و تفسیر کے امام تھے۔ ۱۰۲ھ میں وفات پائی۔ ۵۵ مقاتل - ابوالحسن مقاتل بن سلیمان بن البشیر (باقی صفحہ ۷۸ پر)

بے صد ہا قصّے اہلِ کتاب سے اخذ کیے ہیں۔

اس مطلب کو اگر تفصیل سے دیکھنا چاہو تو تہذیب[۵۱] الاخلاق کے ایک مضمون میں جو مولوی مہدی[۵۲] علی صاحب نے لکھا ہے دیکھو۔

متکلمین کے تفلسف اور حکیمانہ تدقیقات سے اس پاک دین پر پانچواں حاشیہ چڑھا اور وہ بھی دین کا ایک اصلی جزو قرار دیا گیا۔

خلفائے عباسیہ کے عہد میں جب مصر، شام، یونان اور قبرص[۵۳] وغیرہ سے فلسفے کی کتابیں مسلمانوں کے ہاتھ لگیں اور ان کے ترجمے عربی زبان میں شروع ہوئے اور فلاسفہ کے مختلف خیالات اور ان کی مختلف رائیں جو باری تعالیٰ کی ذات اور صفات اور عالم کی حقیقت سے علاقہ رکھتی تھیں علمائے اسلام میں شائع ہوئیں تو فلسفہ کی عجیب چیڑ اور دلفریب دلیلوں کے آگے مذہب کی عظمت آہستہ آہستہ دلوں میں کم ہونے لگی کیونکہ حکماء کے مقالات بظاہر موجہ اور مدلل دکھائی دیتے تھے اور مذہبی تعلیمات محض حسنِ عقیدت یا وجدانی شہادت سے تسلیم کی گئی تھیں۔

باقی حاشیہ ۵۰: خراسانی مشہور محدث اور مفسر ہیں۔ ۱۵۰ھ میں بصرہ میں وفات پائی۔

حاشیہ صفحہ ہذا ۵۱ تہذیب الاخلاق۔ ایک ماہوار رسالہ کا نام ہے جو سر سید مختلف اوقات میں نکالتے رہے اعلیٰ درجہ کا علمی اور مذہبی رسالہ تھا اور سر سید کے تمام بڑے بڑے رفیق اس میں نہایت اعلیٰ پایہ کے مضامین لکھا کرتے تھے۔ ان تمام مضامین کا مجموعہ تین جلدوں میں اب کتابی شکل میں شائع ہو گیا ہے اور عام طور پر ملتا ہے۔

۵۲ مہدی علی۔ نواب محسن الملک کا نام ہے جو سر سید کے بڑے گہرے اور اولین رفیقوں میں سے تھے۔ سر سید کے بعد علی گڑھ کالج کے سکریٹری رہے۔ ۹ر دسمبر ۱۸۳۷ء کو اٹاوہ میں پیدا ہوئے اور ۱۶ر اکتوبر ۱۹۰۷ء کو شملہ میں انتقال فرمایا۔

۵۳۔ قبرص۔ بحیرۂ روم کا مشہور تاریخی جزیرہ ہے۔ حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں معاویہؓ نے ۲۸ھ میں فتح کیا۔

دوسرے اہلِ نفاق کے شبہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پیدا ہو چکے تھے اور اسلام میں شک اور تردد کا بیج بو چکے تھے۔

تیسرے آپ کے مرضِ موت میں اور آپ کی وفات کے بعد کاغذ و دوات جیش اُسامہؓ، خلافت، فدک، شہادت حضرت عثمانؓ، صفین، جمل وغیرہ کے جھگڑے دین میں اختلاف ڈال چکے تھے۔

پس دین کے ہوا خواہوں نے اس بات کی ضرورت دیکھی کہ فلسفۂ یونانیہ کے مقابلہ میں ایک دوسرا فلسفہ مرتب کیا جائے جس میں مذہبی تعلیمات کی تائید فلسفی دلیلوں سے کی جائے، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، مگر رفتہ رفتہ جیسا کہ انسان کی طبیعت کا مقتضا ہے اس جدید فلسفہ میں صدہا مباحث ضرورت سے زیادہ بڑھائے گئے اور خوب دل کھول کر معرکہ آرائیاں کی گئیں۔ چونکہ یہ کام کسی جماعت یا کمیٹی نے مل کر نہیں کیا تھا بلکہ جدا جدا طبع آزمائیاں ہوئی تھیں اس لیے ضروری تھا کہ ان کی رایوں میں بے شمار اختلافات واقع ہوں۔ پس اس طرح دینِ اسلام میں بے شمار فرقے بن گئے۔ مگر علماءؒ نے کھینچ تان کر کے ان لاانتہا جماعتوں کو تہتّر فرقوں میں محدود کر دیا تاکہ حدیث ستفترق امتی ثلثۃ وسبعین فرقۃ کلہم فی النار الا واحدۃ[۱] کی سچائی میں کچھ فرق نہ آئے۔ اگرچہ ان تہتّر فرقوں میں سے معدود فرقوں کے سوا (جیسے اشاعرہ یا شیعہ یا ان کی چند شاخیں) کوئی فرقہ اب دنیا میں نہیں پایا جاتا مگر صدہا بلکہ ہزارہا کتابیں ان کے مناظروں اور مباحثوں سے بھری ہوئی اب تک موجود ہیں اور وہ تمام علمِ کلام کے نام سے مشہور ہیں۔

علمِ کلام کی ان کتابوں میں جن مطالب کی تفصیل درج ہے ان کا جاننا اور سمجھنا اور

---

[۱] یعنی "میری اُمت تہتّر فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی، وہ سب دوزخی ہوں گے سوائے ایک کے"۔ لیکن علامہ مجدالدین فیروزآبادی نے سفر السعادۃ کے خاتمہ پر لکھا ہے کہ اس بات میں کوئی حدیث ثابت نہیں ہوئی

یقین کرنا ایسا ضروری سمجھا گیا ہے کہ ان کے بغیر اسلام معتبر اور صحیح نہیں ہو سکتا مثلاً اشاعرہ کے یہاں جو آج کل "اہلِ سنت والجماعت" کے نام سے مشہور ہیں، ان باتوں کا انکار کہ صفات باریتعالیٰ نہ عین ذات ہیں نہ غیر ذات نہ لاعین نہ لاغیر، یا کہ خدا تعالیٰ اگر تمام نیک بندوں کو ہمیشہ کے لیے دوزخ میں ڈال دے اور تمام شریروں کو ہمیشہ کے لیے جنت میں بھیج دے تو اس کی طرف تفریق کی نسبت نہیں ہو سکتی" یا یہ کہ خلفاء کی فضیلت ایک دوسرے پر خلافت کی ترتیب کے موافق ہے یعنی ہر خلیفۂ سابق خلیفۂ لاحق سے افضل ہے بالکل ایسا ہی ہے جیسے نبوت یا معاد کا انکار کرنا۔ اگر کوئی شخص مثلاً رویت بصری کو محال قرار دے اور حدیث نبوی جو رویت بصری پر دلالت کرتی ہے اس کی تاویل کرے یا علی مرتضیٰؓ کو شیخین کے برابر یا اُن سے افضل سمجھے وہ فوراً جماعت اہلِ سنت سے باہر ہو جاتا ہے اور ان فرقوں میں شمار کیا جاتا ہے جن کی نسبت كُلُّهُمْ فِي النَّارِ کہا گیا ہے۔ شرح مواقف اور شرح مقاصد اور امام رازی[۱] کی اکثر مبسوط کتابیں جو علم کلام میں ہیں اور صواعق محرقہ اور صواقع کابلی اور تحفہ اور منتہی الکلام اور ازالۃ العین اور اس قسم کی ہر کتاب اور ہر رسالہ جو علم کلام میں اشاعرہ کی تائید کے لیے لکھا گیا ہو یا لکھا جائے۔ سب اول سے آخر تک واجب التسلیم سمجھے گئے ہیں، اور جو شخص اُن کے خلاف ایک لفظ بھی کہتا ہے وہ مبتدع سمجھا جاتا ہے۔

چھٹا حاشیہ۔ تقلید اور بدعات اور رسوم کا ایک طویل الذیل حاشیہ ہے جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا ہے، یہ حاشیہ اصل دین سے بھی زیادہ عزیز ہو گیا ہے۔

تقلید نے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کتب سابقہ کی طرح منسوخ کر دیا ہے۔
کتاب اللہ کے سوائے اس کے کسی کام کی چیز نہیں رہی:۔

---

[۱] امام رازی تفسیر کبیر کے مصنف، تاریخ اسلام میں زبردست اور اعلیٰ پایہ کے مصنف شمار ہوتے ہیں۔ بہت سے علوم و فنون میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ ۵۴۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۶۰۶ھ میں انتقال فرمایا۔

ذرا ذرا سے بچے اسے مکتبوں میں طوطے کی طرح پڑھیں یا
بڑے ہو کر اُس کی تلاوت محض لفظی طور پر کریں یا
ختموں اور عرسوں میں اُس کی چند آیتیں یا سورتیں مناقب کے ساتھ پڑھی جائیں
یا نئے مُردوں کی قبروں پر اُس کا ایک آدھ ختم کرایا جائے یا
رمضان کی تراویح میں اُس کا اٹکا اٹکا کر اور چھپا چھپا کر اس کا ایک ختم وہ لوگ سُنیں جو
اُس کا ایک حرف نہیں سمجھتے۔

سنت رسول اللہؐ کا بھی یہی حال ہے کہ دل تو اس کے پڑھنے پڑھانے اور سمجھنے سمجھانے والے روز بروز صفحۂ ہستی سے محو ہوتے جاتے ہیں۔ اور اگر چند نفوس متبرکہ باقی ہیں، ان کا لے دے کر یہ کام ہے کہ صحاح کے اول و آخر کے چند صفحے تبرکاً و تیمناً شاگرد کو سرسری طور پر پڑھا دے اور اس کو علم حدیث کی سند لکھ دی۔ شاگرد اور اُستاد دونوں کو اس بات کا خیال بھی نہیں آتا کہ کبھی ضرورت کے وقت ہم کو ان حدیثوں سے کام پڑے گا کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ کوئی فتویٰ اور کسی مسئلہ کا جواب اس وقت تک مقبول نہیں ہو سکتا جب تک قاضی خاں اور عالمگیری یا بحرالرائق وغیرہ کی عبارت اس میں درج نہ کی جائے گویا قرآن اور حدیث کے مخاطب صحیح تمام امت میں چند آدمی تھے جو ان کا لب لباب نکال کر کتب فقہیہ میں درج کر گئے۔ اب کتاب و سنت معاذ اللہ بالکل اس شعر کے مصداق ہیں ؎

من ز قرآں مغز را برداشتم　　استخواں پیش سگاں انداختم

رسوم و بدعات کا بھی یہی حال ہے کہ وہ بھی اسلام کی رگ و پے میں بیٹھ گئی ہیں اُن کا دین سے جُدا کرنا اور گوشت کا ناخن سے جُدا کرنا برابر ہے۔ دو پلڑی ٹوپی، بردہ دار انگرکھا، ڈھیلا یا تنگ مہری کا پاجامہ۔ نوکدار جوتی، زمین پر بیٹھ کر کھانا اور اسی قسم کی سیکڑوں باتیں مسلمانوں نے قطعاً غیر قوموں سے سیکھی ہیں۔ بیاہ شادی کی اکثر رسوم ہندوستان آکر انھوں نے تعلیم پائی ہیں مگر وہ اس قدر عزیز اور ضروری ہو گئی ہیں کہ اگر کوئی شخص ان کے خلاف کرتا یا کہتا ہے تو

وہ کرشان کا خطاب پاتا ہے۔

یہاں ہم کو رسوم و بدعات کا مفصل بیان کرنا منظور نہیں ہے بلکہ مجمل طور پر صرف یہ جتانا ہے کہ دین اسلام پر جو فضول اور لغو حواشی چڑھے ہوئے ہیں ان میں سب سے بڑا حاشیہ تقلید اور رسوم و بدعات کا ہے۔ موقع اور فرصت ہوئی تو کسی دوسرے وقت یہ بحث کسی قدر تفصیل سے لکھی جائے گی۔

یہ تمام حواشی جو ہم نے اوپر بیان کیے ان کے سوا اور بھی بہت سے حاشیے اس سیدھے سادے دین پر چڑھے ہوئے ہیں جو تھوڑا غور کرنے سے معلوم ہو سکتے ہیں پس نہایت افسوس کی بات ہے کہ ہمارے علمائے دین دوش اسلام کو اس ناگوار بوجھ سے ہلکا کرنے میں کوشش نہیں کرتے، بلکہ اس کی عظمت اور بزرگی اسی میں جانتے ہیں کہ وہ روز بروز اور بھی زیادہ بوجھل اور گرانبار ہوتا چلا جائے۔ شاید پچھلی صدیوں میں کوئی زمانہ ایسا بھی گزرا ہو جس میں اُمّت کے لیے شریعت کا دائرہ تنگ کرنا قرین مصلحت سمجھا گیا ہو اور انسان کے حق میں خدا اور رسول کی تکلیفیں ناکافی نیاں کی گئی ہوں اور اُس کی بہبودی اسی میں تصور کی گئی ہو کہ وہ کسی حالت میں اپنے آپ کو آزاد نہ سمجھے مگر ہم سچ کہتے ہیں کہ یہ زمانہ ہرگز ایسا نہیں ہے۔

آج ہم کو نہ صرف دنیوی عزت حاصل کرنے کے لیے بلکہ زیادہ تر اس لیے کہ دین محمدی کی شان و شوکت دنیا میں قائم رہے اور امت محمدیہ اپنے ہم عصروں کی نظر میں حد سے زیادہ ذلیل و حقیر نہ ہو جائے، اس قدر کام درپیش ہیں کہ خالص دین کے سوا دیگر تکلفات کا تحمل ہم میں باقی نہیں ہے۔ اسلام پر حاشیے چڑھتے چڑھتے جو صورت اس کی اب ہو گئی ہے اگر اُسی کو اسلام سمجھا جائے تو عنقریب کسی مسلمان کو ضروریات دین سے اس قدر مہلت نہ ملے گی کہ وہ نہایت ذلت و خواری سے دونوں وقت قوت لایموت بہم پہنچا کر بُری بھلی طرح اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ بھر لے چہ جائیکہ وہ دنیا میں عزت سے

رہ سکے یا دین کی کچھ شان و شوکت بڑھا سکے۔ جس عالم میں ہم کو اب اور آئندہ رہنا ہے اس میں ادنیٰ درجہ کی عزت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لیے وہ تدبیریں درکار ہیں جو پہلے شاید ملک اور سلطنت کے لیے درکار تھیں کیونکہ ترقیٔ انسان کا زمانہ اس قوم کے حق میں سخت مصیبت کا زمانہ ہوتا ہے جو اُس زمانہ کا ساتھ دے۔ بلکہ اس کے برخلاف اپنے لیے ایک دوسرا راستہ اختیار کرے۔

ہم کو دین کی شان و شوکت قائم رکھنے کے لیے بھی ضرور ہے کہ صرف خالص اسلام کی حمایت کریں اور اس کو حشو و زواید سے پاک کر کے تمام عالم کو دکھا دیں کہ صرف اسلام ہی دنیا میں ایسا دین ہے جو انسان کی خوشی اور آزادی کو ترقی دینے والا ہے۔

یورپ کے بڑے بڑے محققوں نے جو اسلام کی نسبت نہایت عمدہ عمدہ رائیں لکھی ہیں اُس سے ان کی کمال تحقیق اور تنقیح معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ انھوں نے جیسا کہ اُن کی تصنیفات سے ظاہر ہے اُس سے سارے مجموعہ کو اسلام نہیں سمجھا جس پر اب اسلام کا اطلاق کیا جاتا ہے بلکہ انھوں نے اپنی نہایت گہری نگاہ سے اس تمام کوڑے کرکٹ کو دور کر کے ٹھیٹ اسلام کا کھوج لگایا ہے اور صرف اسی پر اپنی اپنی رائیں لکھی ہیں۔ اگر وہ اُس تمام مجموعہ کو جس کو ہمارے بھائی مسلمان اسلام سمجھتے ہیں، ٹھیٹ اسلام جان کر اُسی پر رائے لکھ بیٹھتے تو ان کی راستی اور انصاف ہرگز ایسی رائیں لکھنے کی اجازت نہ دیتا۔ جو مسلمان اس زمانے کے موافق تعلیم پا رہے ہیں یا آئندہ پائیں گے وہ جب ہی اسلام پر ثابت قدم رہ سکتے ہیں کہ اس تمام مجموعہ کو اسلام نہ سمجھیں۔ اگر بدنصیبی سے انھوں نے اسی کو دین اسلام سمجھا تو عیاذاً باللہ اُن غریبوں کی نوبت الحاد اور ارتداد تک پہنچ جائے گی اور اُس کا مظلمہ اُن مولویوں اور عالموں کی گردن پر ہوگا جو اسی مہیب اور ڈراونی اور وحشت انگیز صورت پر اسلام کا رہنا پسند کرتے ہیں۔

ہم جو دنیا کے تمام ادیان و ملل میں سے صرف دین اسلام ہی کو واجب التسلیم سمجھتے

ہیں اور اس کے سوا اور دینوں کو ایسا نہیں جانتے، اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ صرف اسلام ہی خدا کا بھیجا ہوا دین ہے اور باقی ایسے نہیں ہیں، کیونکہ کلام الٰہی میں وارد ہوا ہے کہ اِنۡ مِّنۡ اُمَّۃٍ اِلَّا خَلَا فِیۡہَا نَذِیۡرٌ یعنی کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس میں کوئی نبی نہ گزرا ہو، اور یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ مِنۡہُمۡ مَّنۡ لَّمۡ نَقۡصُصۡ عَلَیۡکَ۔ یعنی ہم نے بعض انبیاء کا حال تجھ پر (اے نبی آخرالزمان) ظاہر نہیں کیا۔

پس معلوم ہوا کہ ہم اسلام کو اس وجہ سے جو اوپر مذکور ہوئی اور دینوں پر ترجیح نہیں دیتے، بلکہ اس سبب سے دیتے ہیں کہ جس وقت دینِ اسلام کا ظہور ہوا اُس وقت ادیانِ سابقہ میں سے کوئی دین اپنی اصلیت پر باقی نہیں رہا تھا۔ انسان کی افراط و تفریط سے حق و باطل مل جل کر ایک ہو گئے تھے، شرک و بدعت نے توحید اور سننِ راشدہ کو دبا لیا تھا اور خود غرض عالموں کی تحریفات اور مقلد جاہلوں کی جہالت اور متعصب دین داروں کے غلو سے تمام شریعتوں کے موضوع بدل گئے تھے۔

نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے آن کر حق کو باطل سے جدا کیا اور جو کھوٹ اور ملاوٹ اگلی شریعتوں میں مل گیا تھا اس کو دور کر کے ایک خالص کُندن نکالا، اور اسی کا نام اسلام رکھا۔

اب اگر اسلام بھی شرائعِ سابقہ کی طرح اپنی اصلیت پر باقی نہ رہے، تو ہم کس مُنہ سے کہہ سکتے ہیں کہ:

"ہمارا دین حق ہے اور باقی ادیان
ایسے نہیں ہیں۔" فقط

▲

۷ - بدگمانی

(از رسالہ تہذیب الاخلاق بابت ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) صفحہ ۳۱)

بدگمانی انسان کی ایک ایسی بدخصلت ہے جس سے اکثر خود بدگمانی کرنے والے کو نیز اُس شخص کو جس پر وہ بدگمانی کرتا ہے، تھوڑا یا بہت نقصان ضرور پہنچتا ہے اسی واسطے کلام الٰہی میں ارشاد ہے کہ یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا کَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ۔ یعنی "اے دینداروں بہت گمانوں سے بچو بے شک بعضے گمان گناہ ہیں۔"

بدگمانی کرنے کی عادت اکثر نکمی تعلیم اور ناقص سوسائٹی سے انسان کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً ایک سچا مسلمان محض انصاف کی رو سے عیسائی پادریوں کے اخلاق کی تعریف تمہارے سامنے کرتا ہے۔ اب اگر تم سدا سے ایسی صحبتوں میں رہے ہو جہاں غیر مذہب کے آدمیوں کا نام ہمیشہ حقارت سے لیا جاتا ہے تو تم کو غالباً یہ گمان ہوگا کہ یہ شخص عیسائی مذہب کی طرف میلان رکھتا ہے یا درپردہ عیسائی ہے۔

یا مثلاً ایک شخص شیعی اپنے ہم مذہبوں سے کہتا ہے کہ آئمہ علیہم السّلام نے تبرا کرنے سے منع کیا ہے۔ اب اگر وہ لوگ ہمیشہ سے خود بھی تبرا کرتے رہے ہیں اور اپنے مجتہدوں سے بھی سنتے رہے ہیں تو ضرور اس کو شیعوں کا مخالف اور سنیوں کا طرفدار خیال کریں گے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی دوسرے شخص کو اپنے نفس پر قیاس کر کے اُس سے بدگمان ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک شخص اپنے ملک یا قوم کی بھلائی میں بے غرضانہ کوشش کرتا ہے مگر اُس ملک یا اس قوم کے وہ آدمی جو خود غرضی میں ڈوبے ہوئے ہیں اس کی کوشش کو بھی خود غرضی ہی پر محمول کرتے ہیں۔

یا مثلاً ایک شخص اہل یورپ کو جو کہ حاکم وقت ہیں سچا اور راست باز خوش معاملہ سمجھ کر

اُن سے زیادہ میل جول رکھتا ہے مگر وہ لوگ ان سے اس حیثیت سے نہیں ملتے تو وہ اُس کو بھی اپنی طرح ایک خوشامدی گوں گیرا اور گماشتہ سمجھتے ہیں۔

بعض اوقات ناواقفیت اور بے علمی سے بھی سخت بدگمانی پیدا ہوتی ہے مثلاً ایک شخص انگریزی طریقے پر کھانے پینے کو اس لیے پسند کرتا ہے کہ اس کے تجربے میں وہ طریقہ صحت کے واسطے نہایت مفید ثابت ہوا ہے مگر جن لوگوں کو اس طریقہ کا تجربہ نہیں ہوا، وہ اس شخص کی نسبت طرح طرح کی بدگمانیاں کرتے ہیں۔

یا مثلاً ایک دانا گورنمنٹ جو مختلف قوم و مذہب کی رعایا پر حکمراں ہے اپنے مدارس میں کسی خاص مذہب کی تعلیم کو جاری نہیں رکھتی مگر جو لوگ اس گورنمنٹ کے دانشمندانہ اصول سے ناواقف ہیں، وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ گورنمنٹ ہمارے مذہب کو نیست و نابود کرنا چاہتی ہے۔

کبھی بدگمانی کا سبب یہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں کے اخلاق و عادات قوم کے عام اخلاق و عادات کے برخلاف ہوتے ہیں ان کی نسبت سوءِ ظن پیدا ہوتا ہے مثلاً ایک قوم میں حد سے زیادہ بناوٹ، تکلف، ساختگی اور ظاہر داری کا دستور ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس قوم میں روکھا پھیکا، بے تکلف، سادہ مزاج اور رکھا پایا جائے گا وہ ضرور ایک متکبر، مغرور، بدمزاج اور راکل کھرا تصور کیا جائے گا۔

یا مثلاً ایک خاندان کے آدمی اکثر مسرف، فضول خرچ، لہو و لعب میں زندگی بسر کرنے والے اور نمائش پر مرنے والے ہیں۔ اب اگر ان میں کوئی شخص اس روش کے خلاف پایا جائے گا تو گو وہ کیسا ہی فیاض، الغرض بامروت اور کنبہ پرور، مگر کفایت شعار اور منتظم ہو خاندان کے تمام آدمی اس کو خسیس، دنی الطبع، کنکک اور مکھی چوس خیال کریں گے۔

بعضے لوگ اس دھوکے میں کہ ہمارا ذہن دُور دُور پہنچتا ہے اور ہم لوگوں کے دل کی بات سمجھ لیتے ہیں، اکثر بدگمانیاں کیا کرتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص گورنمنٹ کے کسی قانون یا کسی پالیسی کو رعایا کے حق میں مُضر سمجھ کر اُس پر آزادانہ اعتراض یا نکتہ چینی کرتا ہے مگر وہ

"دل کی بات سمجھنے والے لوگ" یہ کہتے ہیں کہ چونکہ یہ شخص گورنمنٹ کو آزادی پسند جانتا ہے لہٰذا اس پردہ میں گورنمنٹ پر اپنی لیاقت اور دانشمندی ظاہر کرنی چاہتا ہے۔

یا مثلاً ایک شخص مذہب اور حکمت میں اس لئے تطبیق کرتا ہے کہ جب قوم میں حکمت شائع ہو جائے تو قوم کے تعلیمیافتہ نوجوان مذہب کو عقل کے خلاف سمجھ کر اس سے تجاوز نہ کریں، مگر وہ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ شخص گورنمنٹ کے ایما سے یا گورنمنٹ کے خوش کرنے کے لئے لوگوں کو لامذہب اور ملحد بنانا چاہتا ہے تاکہ سلطنت کو مذہبی مخالفت اور تعصبات کا کھٹکا نہ رہے۔ اکثر بدگمانی کا سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی ایک برائی یا ایک غلطی کی وجہ سے جو کہ بشریت کا خاصہ ہے انسان کی تمام خوبیوں پر خاک ڈال دی جاتی ہے اور اس کی کسی بات پر نیک گمان نہیں کیا جاتا۔ مثلاً ایک بچا راستباز اور دیانتدار آدمی کسی معاملے میں غلطی سے کوئی ایسی بات کر بیٹھا جو راستی کے خلاف معلوم ہوتی ہے تو اس کے بعد اسے وہ کسی معاملے میں راستباز نہیں سمجھا جاتا۔ یا مثلاً ایک لائق اور دانشمند آدمی سے کوئی ایسی لغزش ہو گئی جو عقل کے خلاف معلوم ہوتی ہے تو پھر اس کی رائے پر اعتماد نہیں کیا جاتا۔

بعضے لوگ بات کا محل اور موقع نہ سمجھنے سے بدگمان ہو جاتے ہیں مثلاً ایک شخص سچی محبت اور بے ریا عشق کے جوش میں حضور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی صرف محمد کبھی صرف ابوالقاسم کبھی آمنہ کا اکلوتا بیٹا اور کبھی بنی اسد کی بکریاں چرانے والا اپنی بے ساختہ تحریروں میں لکھ جاتا ہے اور تعظیم کے رسمی اور عرفی الفاظ نہیں لکھتا تو وہ لوگ جو حسن بیان اور لطف تحریر کی کیفیت سے واقف نہیں اور تعظیم کو انہیں رسمی اور عرفی الفاظ میں منحصر جانتے ہیں ضرور خیال کریں گے کہ اس شخص کے دل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ عظمت نہیں ہے۔

یا مثلاً اسلام کا ایک ظریف ریفارمر دوسرے ریفارمر کو اپنی پرائیوٹ تحریر میں لکھتا ہے کہ:۔

"میں نے یہاں بہتیرے جال ڈالے مگر کوئی پنچھی دام میں نہ آیا"

تو سادہ لوح مسلمان یا زاہد خشک اگر وہ خط دیکھ پائیں گے تو ان کو اس بات کا پختہ یقین ہو جائے گا کہ ان لوگوں نے اسلام کے برخلاف سازش کر رکھی ہے ...... اور یہ مسلمانوں کو مرتد کرنا چاہتے ہیں۔ مگر ایک سمجھدار آدمی یہ کہہ کر خاموش ہو جائیگا کہ ایسی ظرافت ریفارمر کی شان سے بعید ہے۔

ابلہانہ حزم و احتیاط بھی اکثر بدگمانی کا باعث ہوتی ہے۔ مثلاً ایک خوش معاملہ

اور دانا گورنمنٹ ملکی معاملات کی صفائی کے لیے ہمسایہ ملک میں اپنا مشن بھیجنا چاہتی ہے مگر اُس ملک کے ارکان سلطنت یہ سمجھ کر کہ مبادا اس مشن کے آنے سے ہماری حکومت یا اقتدار میں کچھ فرق آجائے مشن کو اپنے ملک میں نہیں آنے دیتے۔

یا مثلاً ایک ہائی اسکول یا کالج سے اکثر طالب علم لائق، نیک چلن اور صاحب علم ہو کر نکلتے ہیں مگر ایک وہمی مزاج رئیس اس خیال سے کہ مبادا میری اولاد وہاں جاکر غیر جنس لڑکوں کی صحبت میں آوارہ ہو جائے اپنی اولاد کو وہاں نہیں بھیجتا۔

یہ تمام اسباب بدگمانی کے جو لکھے گئے سرسری نظر میں سب ایک دوسرے سے جدا معلوم ہوتے ہیں، مگر غور کرنے کے بعد ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سب ایک عام سبب سے پیدا ہوتے ہیں جس کو بدگمانی کا اصل اصول سمجھنا چاہیے۔ جس بدبخت قوم کا اخلاقی قوام بگڑ جاتا ہے اور اس کے تمام فرقوں میں ناراستی اور بے دیانتی شامل ہو جاتی ہے تو اس قوم کے خاص و عام کو مجبوراً نہ صرف اپنی قوم سے بلکہ ساری دنیا سے بدگمان ہونا پڑتا ہے۔

جب لوگ متواتر دوستوں سے بے وفائی اور بھائی بندوں سے دغا اور بے مہری دیکھتے ہیں اور خود بھی اُن کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ برتتے ہیں تو ان کو تمام جہان میں کوئی صادق دوست نظر نہیں آتا۔ جب وہ علماء کی بددیانتی اور مشائخوں کا مکرو فریب اور زاہدوں کی ریاکاری اور عابدوں کی جو فروشی اور گندم نمائی دیکھتے ہیں تو ان کو ساری دنیا مکروزور سے بھری ہوئی معلوم ہوتی ہے اور فرشتہ بھی ان کو نیک گمان نہیں ہوتا۔ وہ نہ صرف غیروں سے بلکہ خود اپنے سے بھی بدگمان ہو جاتے ہیں جس طرح وہ سب کو جھوٹا اور مکار خود غرض سمجھتے ہیں۔ اسی طرح وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ لوگ ہم کو جھوٹا اور مکار اور خود غرض سمجھتے ہیں اور اسی لیے وہ کوئی وعدہ بغیر تاکید شدید کے زبان سے نہیں نکالتے اور کوئی روایت بغیر سوگند اور قسم کے نہیں بیان نہیں کرتے اور

کوئی بات بغیر سند اور شہادت کے نہیں کہتے۔ خواہ مخاطب کی طرف سے درخواست ہو یا نہ ہو۔ گویا وہ یہ جتاتے ہیں کہ ہماری کوئی بات اعتبار کے قابل نہیں ہے ان کو جا بجا خوشامد اور تملق کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ہماری خیرخواہی اور دوستی پر بغیر ایسی باتوں کے یقین نہیں آسکتا۔ تم نے اکثر نمود اور شیخی کرنے والوں کو دیکھا ہوگا کہ ایک آدھ جھوٹا سچا گواہ اُن کے ساتھ ہر وقت لگا رہتا ہے۔ جب وہ کوئی واقعہ بیان کرتے ہیں تو بات بات پر اس گواہ کا حوالہ دیتے جاتے ہیں کہ "یہ بھی وہاں موجود تھے" ان سے پوچھئے" گویا وہ اپنے کو ایسا جھوٹا سمجھتے ہیں کہ اُن کی کوئی بات بغیر شہادت کے قابل تسلیم نہیں۔

تم نے بعضے مصنفوں کو دیکھا ہوگا کہ وہ حد سے زیادہ بدیہی اور مسلم الثبوت دعوے پر بھی کسی کا قول سنداً نقل کرتے ہیں تو اس مصنف کا نام، کتاب، باب اور فصل کا پتہ، صفحہ اور سطر کا شمار، سنہ طباعت، مقام طبع، مطبع کا نام اور سوائے اس کے اور بھی پتے مفصل لکھتے ہیں۔ حالانکہ ان دعووں کے تسلیم کرنے میں جن کی تائید میں وہ مفصل سندیں لکھتے ہیں کسی کو بھی کلام نہیں ہوتا، مگر ان کو اپنی بے اعتباری کا ایسا سخت یقین ہوتا ہے کہ اگر ان کی کتاب ضروری مقدار سے دس گنی زیادہ ہو جائے تو بھی وہ اس تفصیل سے باز نہیں آسکتے۔

یہ اور ایسی بیشمار مثالیں اس بات کی ہیں کہ جب کسی قوم کے عام اخلاق بگڑ جاتے ہیں تو اس قوم کے لوگ نہ صرف اوروں سے بلکہ اپنے نفس سے بھی بدگمان ہو جاتے ہیں۔

ہم اپنے ملک میں اور خاص کر اپنی قوم میں بدگمانی کا حال ایسا ہی دیکھتے ہیں۔ گاہک سچے دوکانداروں کو بھی سچا نہیں جانتے کیونکہ انھوں نے بڑے بڑے نیک سخنوں سے دھوکے کھائے ہیں۔ دنیادار آپس میں ایک دوسرے کو خائن اور بددیانت سمجھتے ہیں کیونکہ انھوں نے بڑے بڑے دینداروں کو ایسا ہی پایا ہے۔ اگر کوئی دیانت دار کمیٹی قوم کی بہبودی اور اصلاح کے لیے کھڑی ہوتی ہے تو قوم کی طرف سے بجائے اعانت و امداد کے اس کی مخالفت اور مزاحمت ہوتی ہے کیونکہ قوم کے سرگروہوں کی متواتر خیانتوں نے کسی کو اعتبار و اعتماد کے لائق نہیں چھوڑا۔

ایک شخص کی بدگمانی سے جو مُضر نتیجے پیدا ہوتے ہیں وہ اکثر ایک یا چند آدمیوں سے زیادہ کو نقصان نہیں پہنچاتے۔ لیکن جب کسی ملک یا قوم کی طبیعتوں میں بدگمانی کا بیج بویا جاتا ہے تو اُس سے تمام ملک یا تمام قوم کو مضرت پہنچتی ہے۔ عام بدگمانی سے اکثر ایسا ہوا ہے کہ فوج اپنے بادشاہ سے منحرف اور رعایا باغی ہو گئی ہے اور اس کے بُرے ثمر سے فوج اور رعایا دونوں کو سالہا سال تک بھگتنے پڑے ہیں۔

افسوس ہے اور نہایت افسوس ہے کہ ہماری قوم میں بھی یہی عام بدگمانی پھیلی ہوئی ہے جس کے سبب سے اس کو طرح طرح کے نقصان اُٹھانے پڑے ہیں اور اُٹھانے پڑیں گے۔

ابتدا میں وہ گورنمنٹ سے بدگمان تھے اور ان کو یہ خیال تھا کہ "سرکار ہم کو عیسائی بنانا چاہتی ہے۔ پادری لوگ جو جابجا تبلیغ عیسائیت کرتے پھرتے ہیں، یہ سرکار ہی کی طرف سے اس کام پر مامور ہیں اور انگریزی مدارس بھی اسی لیے قائم کئے گئے ہیں کہ ہم لوگ رفتہ رفتہ اپنے دین سے بے خبر ہو کر آخر کو دین عیسوی اختیار کر لیں۔" اس بیہودہ اور باطل خیال سے جو بیشمار نقصان انھوں نے اُٹھائے ہیں ان کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ اگر یہ پوچھا جائے کہ :-

کیوں سرکاری دفتر مسلمانوں سے خالی ہیں؟

کیوں تجارت اور صنعت کی فہرست میں مسلمانوں کا نام نہیں پایا جاتا؟

کیوں اُن کی ناداری اور افلاس روز بروز بڑھتا جاتا ہے؟

کیوں اُن کے خاندان برابر مٹتے جا رہے ہیں؟

کیوں ان کی اولاد میں بدخصلتیں سب سے زیادہ پائی جاتی ہیں؟

کیوں ان کے رئیس اور امیر نالائق اور کندۂ ناتراش ہوتے ہیں؟

تو شاید ان سب سوالات کا جواب یہی ہوگا کہ "اُن کی بدگمانی ہے"۔

اب چند سال سے قوم کی ایک خیر خواہ جماعت نے قوم کی تعلیم و تربیت کا سامان مہیا کرنے پر کمر باندھی ہے اور علی گڑھ میں ایک ایسا قومی مدرسہ قائم کیا ہے جس کی نظیر ایشیا کی تاریخ میں نہیں

پائی جاتی ۔ اُس نے قوم کی بدگمانی رفع کرنے میں بھی حتی الامکان کوشش کی ہے اور کوئی عقیدہ اُن کی دلجمعی اور اطمینان کا فروگذاشت نہیں کیا مگر قوم کی بدگمانی بدستور چلی جاتی ہے وہ برابر آنکھوں سے دیکھتے اور کانوں سے سنتے ہیں کہ

ہر سال اس مدرسہ میں طالب علموں کی ایک معتد بہ مقدار توقع سے زیادہ کامیاب ہوتی ہے (حالانکہ اس کے قیام کو کچھ بھی زمانہ نہیں گزرا)

وہاں تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت میں بھی بہت زیادہ اہتمام کیا جاتا ہے جس سے مسلمانوں کی اولاد کے واسطے ہمیشہ کے لیے اخلاق کی جڑ قائم ہوتی ہے۔

وہاں طالبعلموں کی حفظ صحت کا خیال بھی جو کہ نہایت ضروری چیز ہے حد سے زیادہ کیا جاتا ہے۔

ان کو مذہبی قواعد کا بھی کمال قدغن کے ساتھ پابند کیا جاتا ہے۔

اُن کو دُنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔

غرض تعلیم و تربیت کا سامان وہاں اس قدر مہیا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اولاد کے لیے اس سے بڑھ کر ہرگز نہیں ہو سکتا۔ لیکن باوجود ان سب باتوں کے بہت سے بُرائی سے بہت سے عناد سے اور سب سے زیادہ بدگمانی سے اس چشمۂ فیض سے محروم ہیں اور اس سے قوم کی طرف سے ایسی سخت مایوسی ہوتی ہے جس کا تدارک ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ بھوکے کو کھانا اور پیاسے کو پانی میسر نہ آنے سے بھی سخت مایوسی ہوتی ہے۔ لیکن یہ اس مایوسی سے بہت کم ہے کہ کھانا اور پانی موجود ہے لیکن بیمار نہ کھانا کھا سکے نہ پانی پی سکے۔ ایسا بیمار کوئی دم کا مہمان ہوتا ہے نہ طبیب اس کے کام آسکتا ہے نہ تیمار دار اس کی مدد کر سکتا ہے۔

ہم نہیں کہتے کہ ہمارے مسلمان بھائی اس باب میں کسی کے کہنے سننے پر التفات کریں بلکہ اُن کو چاہیے کہ انصاف اور بے تعصبی سے مدرسۃ العلوم کا حال دیکھیں اور سمجھیں کہ جو کچھ ہم اُس کی نسبت کہتے ہیں وہ صحیح ہے یا غلط؟

آفتاب آمد دلیل آفتاب ۔ گر دلیلے بایدت زو رُو متاب

۸۔ تدبیر

(از رسالہ تہذیب الاخلاق ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) صفحہ ۱۶۹)

بہت سے خیالات ہیں جو حقیقت میں مذہب سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے بلکہ مذہب کے سوا اور مختلف اسباب سے انسان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔

مثلاً یہ خیال کہ زمین ساکن ہے اور آسمان اس کے گرد پھرتے ہیں، حقیقت میں مذہب اسلام سے علاقہ نہیں رکھتا بلکہ یونانی فلسفہ سے جو علمائے اسلام کے خیالات پر چھا گیا تھا پیدا ہوا ہے لیکن غلطی سے وہ ایک ایسی ضروری بات سمجھی گئی ہے کہ اس کے انکار سے گویا قرآن اور حدیث کا انکار لازم آتا ہے۔

اسی طرح یہ خیال کہ "آدمی کی تدبیر سے کچھ نہیں ہو سکتا" ایک ایسا خیال ہے جو مذہب کے سوا اور مختلف اسباب سے انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے مگر غلطی سے ایک مذہبی خیال سمجھا جاتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ جو خیالات ملکی یا تمدنی یا تعلیمی خاصیتوں سے انسان کے دل پر مستولی ہو جاتے ہیں وہ ان کو کسی ایسی زبردست دستاویز سے تقویت دینی چاہتا ہے جس کے آگے چون و چرا کی گنجائش نہ ہو اور وہ دستاویز مذہب کی گہری سیاہی سے لکھی جائے جبھی اس پر اعتقاد کی نظریں پڑ سکتی ہیں۔

ہم اس آرٹیکل میں بیان کرنا چاہتے ہیں کہ:

حصول مقاصد کے لیے تدبیر اور سعی اور کوشش کرنی انسان کا ایک ضروری فرض ہے۔

اسلام نے تدبیر کا ضروری اور مفید ہونا بتایا ہے نہ غیر ضروری اور نہ غیر مفید ہونا۔

وہ کیا اسباب ہیں جن سے تدبیر کی وقعت انسان کے دل سے جاتی رہتی ہے۔؟

کوئی شخص اس بات کا انکار نہیں کر سکتا کہ خدا تعالیٰ نے ہر ذی روح کی جبلت میں

یہ خاصیت رکھی ہے کہ وہ نفع حاصل کرنے یا ضرر کے دفع کرنے کا بالطبع ارادہ کرتا ہے اور جہاں تک اس کی دسترس ہوتی ہے اس غرض کے لیے کوشش کرتا ہے، بھوک میں کھانے کی اور پیاس میں پانی کی جستجو کرتا ہے۔ گھوڑے کی فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ شیر سے بھاگتا ہے، چوہے کی خلقت میں یہ بات رکھی گئی ہے کہ وہ بلّی سے ڈرتا ہے۔ یہی کوشش جب انسان میں پائی جاتی ہے تو اس کا نام "تدبیر" رکھا جاتا ہے۔

تدبیر کے معنی لغت میں "انجام کار پر نظر کرنا" ہیں، عرف عام میں "مطلوب کے لیے قدرتی اسباب کی جستجو کرنے اور اُن کے ذریعے سے اُس مطلوب کو بہم پہنچانے میں کوشش کرنے کو "تدبیر" کہتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ایسی کوشش تمام حیوانات میں سے صرف انسان ہی میں، جو کہ ذی روح ہونے کے علاوہ عقل بھی رکھتا ہے، پائی جا سکتی ہے۔ پس جس طرح دفع مضرت اور جلبِ منفعت کے لیے کوشش کرنا، اور حیوانات کا قدرتی خاصہ ہے، اسی طرح تدبیر کرنا انسان کا قدرتی خاصہ ہے۔

جو لوگ تدبیر کو زبان سے محض بیکار اور لا حاصل بتاتے ہیں اور دل سے بھی ایسا ہی یقین کرتے ہیں، وہ بھی تدبیر کرنے سے باز نہیں رہ سکتے۔ روزمرّہ کے خرچ کے لیے اکٹھی جنس خرید رکھتے ہیں، تاکہ ہر روز فکر نہ کرنی پڑے۔ پرانی جڑاول کو گرمی اور برسات میں حفاظت اور احتیاط سے رکھتے ہیں تاکہ آئندہ موسم سرما میں کام آئے۔ مکانوں کی مرمت کرتے ہیں تاکہ وہ گرنے سے محفوظ رہیں۔ چھتوں پر مٹی ڈالتے ہیں تاکہ برسات میں چھتیں نہ ٹپکیں۔ روپیہ پیسہ بغیر حفاظت کے نہیں رکھتے۔ اکیلے مکان کو کھلا نہیں چھوڑتے۔ مویشی کو مقید رکھتے ہیں، اولاد کو نامقدور بُری صحبت سے روکتے ہیں۔ غرض کہ ان تمام مقاصد کے لیے جن کے اسباب نہایت ظاہر اور بدیہی ہیں، ہمیشہ تدبیر کرتے ہیں اور اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ "تدبیر کرنا انسانی فطرت کا مقتضا" ہے۔ اور یہ سبق اس کو قدرت ہی نے سکھایا ہے۔

ظاہر ہے کہ قدرت کا کوئی عطیہ بیکار نہیں ہوتا۔ پس ضرور ہے کہ تدبیر بھی انسان کے حق میں بیکار اور غیر مفید نہ ہو۔ جیسا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے پرندوں کے حق

میں ارشاد فرمایا ہے کہ تغدو خماصاً وتروح بطاناً" یعنی "جانور صبح کو بھوکے نکلتے ہیں اور شام کو سیر ہو کر آتے ہیں" مطلب یہ ہے کہ اپنی کوشش ہی سے کامیاب ہوتے ہیں۔" اور فرمایا کہ الاسواق موائد اللہ فمن اتاہا فقد اصاب منہا۔ یعنی "بازار خدا کی نعمتوں کے خوان ہیں جو وہاں آئے گا ان سے بہرہ مند ہوگا" مطلب یہ ہے کہ تجارت میں دوڑ دھوپ کرنے سے ضرور کامیابی ہوتی ہے۔

ان دونوں حدیثوں سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ قدرتی خاصیت جس کا نام تدبیر ہے انسان کی طبیعت میں بیکار نہیں پیدا کی گئی اور انسان کی کامیابی کا سیدھا راستہ تدبیر کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔

ہماری قوم میں یہ خیال کثرت سے پھیلا ہوا ہے کہ آدمی کی تدبیر سے کچھ نہیں ہو سکتا بلکہ نفع یا ضرر جو کچھ پہنچنے والا ہوتا ہے، وہ ضرور پہنچتا ہے، خواہ تدبیر کی جائے اور خواہ نہ کی جائے۔ اور وہ اس کو دین اسلام کا ایک ضروری عقیدہ خیال کرتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے، اگرچہ وہ سرسری اور معمولی اغراض کے لیے ہمیشہ تدبیریں کرتے ہیں مگر جب کوئی ایسا کام پیش آتا ہے جو آسانی سے حل نہیں ہو سکتا یا جس کے وسائل اور اسباب کسی قدر دقیق ہوتے ہیں تو وہ تقدیر اور توکل کا حرف زبان پر لاتے ہیں۔

جو بے علم ہیں وہ پیشانی پر انگلی ٹیک کر یہ مصرع پڑھ دیتے ہیں ع

جو کہ پیشانی میں لکھی ہے وہ پیش آنی ہے

اور پڑھے لکھے آیتوں اور حدیثوں سے استدلال کر کے کبھی اپنی مجبوری اور کبھی اپنے توکل کا اظہار کرتے ہیں۔

کوئی یہ آیت پڑھتا ہے وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ یعنی خدا پر بھروسہ کرنا کافی ہے۔

کوئی یہ حدیث پڑھتا ہے جف القلم بما هو كائن۔ یعنی جو کچھ ہونے والا تھا، وہ قلم تقدیر پر لکھ چکا۔

کہیں یہ آیت پیش کی جاتی ہے وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ یعنی جس کو تُو چاہے عزّت دے اور جس کو تُو چاہے ذلّت دے۔

اور کہیں یہ حدیث کہ ما شاء اللہ کان وما لم یشاء لم یکن یعنی جو خدا نے چاہا وہ ہو گیا اور جو اُس نے نہ چاہا وہ نہ ہوا۔

اور کہیں یہ آیت پڑھی جاتی ہے کہ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا یعنی کوئی جاندار زمین پر ایسا نہیں جس کا رزق خدا کے ذمہ نہ ہو۔

غرض اسی قسم کی اور بہت سی آیتیں اور حدیثیں پیش کی جاتی ہیں جو تین باتوں میں سے کسی ایک نہ ایک پر دلالت کرتی ہیں۔

ایک یہ کہ خدا پر توکل کرنا کافی اور ضروری ہے اور ہر ذی حیات کا رزق اس کے ذمہ ہے۔

دوسرے یہ کہ ازل سے ابد تک جو کچھ ہونے والا تھا ہو چکا۔

تیسرے یہ کہ جو خدا چاہتا ہے وہ ہوتا ہے اور جو بندہ چاہتا ہے وہ نہیں ہوتا۔

ان مذکورہ بالا تینوں باتوں سے تدبیر کا لاحاصل اور بیکار ہونا لازم نہیں آتا۔

خدا پر توکّل کرنا (جیسا کہ ہم آگے مفصل بیان کریں گے) اس لیے کافی اور ضروری ہے کہ بغیر توکل کے کسی تدبیر پر اقدام کرنے کی جرأت انسان سے نہیں ہو سکتی، اور خدا تعالیٰ جو ذی روح کے رزق کا متکفل ہوا ہے اُس کے یہ معنی ہیں کہ تمام عالم کی پرورش کے لیے جو چیزیں ضروری اور لابدی ہیں، اُن کا روئے زمین پر پیدا کرنا اُس کے ذمہ ہے نہ یہ کہ بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے حلق میں اُتار دینا اُس کے ذمہ ہے۔

دوسری بات بھی تدبیر کے منافی نہیں، بلکہ مؤید ہے کیونکہ ازل سے ابد تک جو کچھ ہونے والا تھا وہ یہی تھا کہ ہر شئے اپنے اسباب و علل کے ساتھ وابستہ ہو۔ جب مینہ برسے تو سماں ہو اور جب مینہ نہ برسے تو کال پڑے۔ جب تخم ریزی کی جائے تو غلہ پیدا ہو اور جب غذا کھائی جائے تو جسم میں خون کی مقدار بڑھے۔

تیسری بات سے بھی تدبیر کا بیکار ہونا نہیں سمجھا جاتا۔ کیونکہ خدا تعالیٰ نے اپنے پاک کلام میں جابجا اپنے مدبّرِ عالم اور مسبب الاسباب اور علۃ العلل ہونے کی وجہ سے اسباب کی تاثیرات اور افعال کو اپنی طرف منسوب کیا ہے جیسے وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی یعنی جب تو نے پھینکا تو تو نے نہیں پھینکا بلکہ خدا نے پھینکا تھا اور ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَہٗ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ یعنی آیا تم بوتے ہو اس کو یا ہم بوتے ہیں۔

جس قدر ہم کو اس بات کا یقین ہے کہ عالم موجود ہے اسی قدر ہم کو اس بات کا بھی یقین ہے کہ ہم سب کام اپنے اختیار سے کرتے ہیں اور جیسا ہم کو پہلے یقین میں ایک نہایت ضعیف احتمال اس بات کا رہتا ہے کہ شاید یہ تمام نمائش عالم خواب کی سی نمائش ہو، ویسا ہی ایک نہایت ضعیف احتمال اس بات کا رہتا ہے کہ شاید ہمارے یہ سب اعمال و حرکات ایسے ہوں جیسے قطب نما کی سوئی کی حرکت، لیکن ایسے ضعیف احتمالات سے یقین زائل نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا ہے دع ما یریبك الی ما یریبك یعنی شک میں ڈالنے والی بات کو اس بات کے مقابل میں چھوڑ دو جو شک میں نہ ڈالے۔ پس اس میں شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ جس طرح عالم کا موجود ہونا یقینی ہے اسی طرح ہمارے افعال کا اختیاری ہونا یقینی ہے اگر ہم اپنے افعال میں ایسے ہی مجبور ہوں جیسے اور جمادات مجبور ہیں تو تمام تکلیفات شرعیہ اور سزا و جزا باطل ہو جائے اور جن معنوں میں نیکی، بدی۔ مدح۔ ذم۔ لیاقت، نالائقی، انصاف، بے انصافی۔ دانائی۔ نادانی۔ فرض جوابدہی۔ قصور اور بے قصوری وغیرہ الفاظ، مذہب اور اخلاق اور قانون میں استعمال کیے جاتے ہیں وہ سب غلط ٹھیر جائیں۔ پس جہاں کہیں قرآن و حدیث میں ایسے الفاظ وارد ہوئے ہیں جن میں بندوں کے کام خدا کی طرف نسبت کیے گئے ہیں وہاں ان الفاظ کی اسناد اپنی حقیقت پر نہیں ہے اور یہ بات ان آیات و احادیث پر نظر کرنے سے بالکل صاف ہو جاتی ہے جن میں بندوں کے اقبال و ادبار و راحت و تکلیف وغیرہ کو انھیں کے افعال کا ثمرہ بتایا ہے،

جیسا کہ آگے چل کر ذکر کیا جائے گا۔

ہمارے نزدیک یہ خیال کہ انسان کی تدبیر سے کچھ نہیں ہو سکتا اور اس کو ایک مذہبی عقیدہ جاننا تدبیر اور توکل کے غلط معنی سمجھنے سے پیدا ہوا ہے۔ تقدیر کے ایسے معنی سمجھے گئے ہیں جن سے انسان کا مجبور ہونا اور اسباب کا معطل اور بیکار ہونا لازم آتا ہے شارع (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تقدیر کے ایسے معنی نہیں بتائے جن سے نہ انسان کا مجبور ہونا اور نہ اسباب کا معطل ہونا لازم آتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ "حجۃ البالغہ" میں لکھتے ہیں کہ تقدیر اور اسباب کی سببیت میں کچھ منافات نہیں ہے۔ کیونکہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کیا دوا اور رقیہ تقدیر الٰہی کو ہٹا دیتے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ وہ خود تقدیر الٰہی سے باہر نہیں ہیں (یعنی دوا وغیرہ میں جو تاثیر ہے وہ بھی خدا ہی کی پیدا کی ہوئی ہے)

پھر شاہ صاحب نے اسی مطلب پر حضرت عمرؓ کے اس قول سے استدلال کیا جو سرغ کے قصے میں اُن سے منقول ہے۔ سرغ وادیٔ تبوک میں ایک بستی کا نام تھا۔ وبائے شام کے قصے میں عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ جب عمر فاروقؓ سرغ میں پہنچے اور وبائے شام کا حال سنا تو وہاں سے اُلٹے پھر جانے کا حکم دیا۔ عبیداللہ بن الجراحؓ نے کہا "کیا تقدیر الٰہی سے بھاگتے ہو؟" عمر فاروقؓ نے کہا نعم نفر من قدر اللہ الی قدر اللہ یعنی "ہاں ہم تقدیر الٰہی کی طرف بھاگتے ہیں" اور پھر یہ تمثیل بیان کی کہ "دیکھو اگر تمہارے پاس اونٹ ہوں اور تم ایک وادی میں پہنچو جس کی ایک جانب سرسبز ہو اور دوسری جانب چٹ پڑ ہو تو چاہو تم سرسبز زمین میں اپنے اونٹ چراؤ اور چاہو چٹ پڑ زمین میں۔ دونوں صورتوں میں تقدیر الٰہی سے باہر نہیں ہو سکتے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مسبب الاسباب نے جو مختلف اسباب میں مختلف تاثیریں رکھی ہیں اسی کا نام تقدیر الٰہی ہے۔ مرض کی حالت میں پرہیز اور دوا نہ کرنے سے مرض کا طول پکڑنا بھی تقدیر الٰہی ہے اور پرہیز اور دوا کرنے سے اس کا زائل ہو جانا یہ بھی تقدیر الٰہی ہے۔ وبا کے مقامات

سے بھاگ کر موت سے بچنا بھی تقدیر الٰہی ہے، اور وبا کے مقامات میں جا کر مرنا یہ بھی تقدیر الٰہی ہے۔ گلہ کو سرسبز زمین میں چھوڑ کر اس کو چالسے سے سیراب کرنا بھی تقدیر الٰہی ہے اور بٹ پڑ زمین پر چھوڑ کر اس کو بھوکا مارنا یہ بھی تقدیر الٰہی ہے۔

اس مطلب کی تائید کے لیے چند آیتیں قرآن مجید کی بھی یہاں نقل کرنی مناسب معلوم ہوتی ہیں:

(۱) اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ (رعد) یعنی خدا اُس قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ آپ اپنی حالت نہ بدلیں۔

(۲) ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ لَمْ یَکُ مُغَیِّرًا نِّعْمَۃً اَنْعَمَھَا عَلٰی قَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ (انفال) یعنی یہ اس سبب سے ہے کہ خدا تعالیٰ جو نعمت کسی قوم کو دیتا ہے اس کو نہیں بدلتا جب تک وہ قوم خود اپنی حالت نہیں بدلتی۔

(۳) مَا اَصَابَکُمْ مِّنْ مُّصِیْبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ (شوریٰ) یعنی جو مصیبت تم کو پہنچتی ہے وہ تمھارے ہی کرتوت کا نتیجہ ہوتی ہے۔

(۴) فَمَا کَانَ اللّٰہُ لِیَظْلِمَھُمْ وَلٰکِنْ کَانُوْا اَنْفُسَھُمْ یَظْلِمُوْنَ (روم) یعنی خدا کی شان سے نہ تھا کہ اُن پر ظلم کرے بلکہ وہ آپ اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے۔

(۵) ذٰلِکَ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْکُمْ وَاَنَّ اللّٰہَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ (انفال) یعنی یہ تمھارے ہی کرتوت کی سزا ہے اور خدا بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔

(۶) مَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ (کہف) یعنی جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے ایمان نہ لائے

(۷) لَھَا مَا کَسَبَتْ وَعَلَیْھَا مَا اکْتَسَبَتْ (بقرہ) یعنی اس کے لیے مفید ہے جو وہ نیکی کرے اور اس کے لیے مضر ہے جو وہ بُرائی کرے۔

اسی مضمون کی اور بہت سی آیتیں اور حدیثیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ایسے کام جن کا نتیجہ اچھا ہے اور ایسے کام جن کا نتیجہ بُرا ہے دونوں طرح کے کام کرنے کا اختیار انسان کو دیا گیا ہے اور جو تکلیف یا راحت یا اقبال یا ادبار اُس کو پہنچتا ہے وہ سب اسی کام کے نتیجے ہوتے ہیں

پس معلوم ہوا کہ شارع نے تقدیر کے وہ معنی نہیں بتائے جو ہماری قوم کے عام خیالات میں سمائے ہوئے ہیں، یعنی یہ کہ جس کو نفع یا ضرر پہنچنے والا ہے، وہ ضرور پہنچے گا خواہ تدبیر کی جائے یا نہ کی جائے۔

دوسری غلطی توکل کے معنی سمجھنے میں ہوئی ہے۔ توکل کے صحیح معنی "اپنے کو عاجز سمجھنے" اور "خدا پر بھروسہ کرنے" کے ہیں۔

مگر غلطی سے توکل ایسا بھروسہ کرنے کا نام رکھا گیا ہے کہ جس میں تدبیر اور کوشش کا بالکل لگاؤ نہ ہو اور انسان مثل جمادات کے بے حس و حرکت ہو کر بیٹھ رہے۔ گویا تدبیر اور توکل میں منافات سمجھی گئی ہے۔

لیکن شریعت سے توکل کے ایسے معنی معلوم ہوتے ہیں جو ہرگز تدبیر کے منافی نہیں اور تدبیر کے ایسے معنی معلوم ہوتے ہیں جو ہرگز توکل کے منافی نہیں، جس طرح توکل کرنے کی تاکید کی گئی ہے، اسی طرح تدبیر کرنے کی تاکید کی گئی ہے اور جس طرح توکل کرنے والوں کی تعریف کی گئی ہے، اسی طرح تدبیر کرنے والوں کو بھی تعریف کی گئی ہے

اس مقام پر معلوم ہوتا ہے کہ چند آیتیں اور حدیثیں اور اقوالِ سلف جن میں کوشش اور تدبیر کرنے کی اجازت یا تاکید یا تعریف کی گئی ہو، نقل کیے جائیں:

(۱) لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِنْ رَبِّكُمْ (بقرہ) یعنی تم پر (اے حاجیو) کچھ الزام نہیں ہے۔ اگر تم سفر حج میں خدا کے رزق کی تلاش کرو (یعنی تجارت وغیرہ کے ذریعے سے معاش بھی پیدا کرو اور حج بھی کر آؤ تو کچھ مضائقہ نہیں ہے۔)

(۲) وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا (النباء) یعنی ہم نے (تمھارے لیے) دن کمائی کرنے کا وقت بنایا۔

(۳) وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ (الحجر) یعنی ہم نے (تمھارے لیے) زمین پر معاش حاصل کرنے کے اسباب پیدا کیے۔

(۴) فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ ... وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللهِ (الجمعۃ) یعنی پھیل جاؤ زمین پر اور خدا کا رزق تلاش کرو۔

(۵) عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَرْضٰى وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (مزمل) یعنی خدا نے جان لیا ہے کہ بعضے ہوں گے تم میں سے بیمار اور لوگ ہوں گے جو سفر کریں گے۔ زمین پر خدا کے رزق کی تلاش میں (یعنی وہ بھی بیماروں کی طرح رعایت کے قابل ہوں گے)۔

اس طرح اور بہت سی آئتیں ہیں جن سے طلب معاش کے لیے کوشش اور تدبیر کرنے کی اجازت اور ترغیب پائی جاتی ہے۔

اخبار و آثار جو اس باب میں وارد ہیں، ان میں سے چند اس مقام پر "احیاء العلوم" سے نقل کرتے ہیں۔

(۱) قال رسول اللّٰہ (صلی اللہ علیہ وسلم) من الذنوب ذنوب لا یکفرھا الا الھم فی طلب المعیشۃ۔ یعنی بعض گناہ ایسے ہیں کہ طلب معاش میں کوشش کرنے ہی سے پاک ہوتے ہیں۔

(۲) التاجر الصدوق یحشر یوم القیامۃ مع الصدیقین والشہداء یعنی سچا سوداگر قیامت کے دن صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ محشور ہوگا۔

(۳) من طلب الدنیا حلالا تعففا عن المسئلۃ وسعیا علی عیالہ وتعطفا علی جارہ لقی اللہ ووجھہ کالقمر لیلۃ البدر یعنی جو شخص دنیا کو وجہ حلال سے اس لیے ڈھونڈتا ہے کہ سوال کرنے سے بچے اور اپنے بچوں کی خبر لے اور ہمسایہ کے ساتھ ہمدردی کرے تو خدا سے ایسی حالت میں ملے گا کہ اس کا منہ چودھویں رات کے چاند کی مانند چمکتا ہوگا۔

(۴) کان رسول اللہ (صلعم) جالسا مع اصحابہ ذات یوم فنظروا الی شاب ذی جلد وقوۃ وقد بکر یسعی فقالوا ویح ھذا لو کان شبابہ وجلدہ فی سبیل اللہ فقال (صلعم) لا تقولوا ھذا فانہ ان کان یسعی علی نفسہ لیکف عن المسئلۃ ویغنیھا عن الناس فھو فی سبیل اللہ وان کان یسعی علی ابوین ضعیفین او ذریۃ ضعاف لیغنیھم ویکفیھم فھو فی سبیل اللہ

یعنی ایک روز آنحضرت صلعم صحابہؓ کے ساتھ بیٹھے تھے، انھوں نے ایک چست اور قوی جوان کو دیکھا کہ علی الصباح معاش کی تلاش میں نکلا تھا، بولے کیا خوب ہوتا اگر اس کی قوت اور چستی

خدا کی راہ میں صرف ہوئی۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایسا نہ کہو کیونکہ اگر وہ اپنے لیے سعی کرتا ہے تاکہ مانگنے سے بچے اور لوگوں کا محتاج نہ ہو تو وہ خدا ہی کی راہ میں ہے۔ اور اگر وہ اپنے ضعیف ماں باپ یا بال بچوں کے لیے کوشش کرتا ہے تاکہ ان کو مستغنی کرے اور اُن کے کام آئے تو بھی وہ خدا ہی کی راہ میں ہے۔

(۵) ان اللہ یحب العبید یتخذ المھنۃ یستغنی بھا عن الناس یعنی خدا تعالیٰ اُسی بندہ کو دوست رکھتا ہے جو نوکری اس لیے اختیار کرے کہ لوگوں کا محتاج نہ ہو۔

(۶) ان اللہ یحب المومن المحترف یعنی خدا تعالیٰ پیشہ ور مسلمانوں کو دوست رکھتا ہے

(۷) روی ان عیسیٰ رای رجلا قال تصنع قال اتعبد قال من یعولک قال اخی قال اخوک اعبد منک یعنی روایت ہے کہ حضرت عیسیٰ نے ایک شخص کو دیکھا، کہا تُو کیا کرتا ہے؟ کہا۔ عبادت! کہا۔ تیری خبر گیری کون کرتا ہے؟ کہا میرا بھائی۔ کہا۔ تیرا بھائی تجھ سے بڑا عبادت کرنیوالا ہے۔

(۱) کان زید بن سلمۃ یغرس فی ارضہ فقال لہ عمر رضی اللہ اصبت استغنی عن الناس یکن اصون لدینک واکرم لک علیھم کما قال صاحبکم احیحۃ ؎ :

ان الکریم علی الاخوان ذو المال

یعنی زید بن سلمہ اپنی زمین پر پیڑ لگا رہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے کہا ایسا ہی چاہیے۔ اگر تُو لوگوں سے بے غرض رہے گا تو تیرا دین زیادہ محفوظ رہے گا اور تیری عزت ان میں زیادہ ہوگی۔ جیسا کہ تمھارے دوست احیحہ شاعرہ کا قول ہے کہ (ع) "بھائیوں میں دولت مندہی معزز ہوتا ہے"

(۲) قال عمرؓ ما من موضع یاتی الموت فیہ احب الی من موضع اتسوق فیہ لاھلی ابیع واشتری یعنی عمر فاروق کہا کرتے تھے کہ میں موت کے آنے کی جگہ اس جگہ سے بہتر نہیں سمجھتا جہاں اپنے کنبے کے لیے بازار میں لین دین کر رہا ہوں۔

ان تمام آیتوں اور حدیثوں اور اقوال سلف سے صاف ظاہر ہے کہ طلب معاش میں کوشش اور تدبیر کرنی انسان کا ایک ضروری فرض ہے۔ پس اگر تدبیر اور توکل میں منافات

ہوتی ہے تو طلبِ معاش میں کوشش کرنے کی اجازت اور ترغیب اور تعریف نہ ہوتی۔ امام غزالی احیاء العلوم میں لکھتے ہیں کہ:۔

"بعض اوقات ایسا خیال کیا جاتا ہے کہ ہاتھ پاؤں سے کسب کرنے اور دل سے تدبیر کرنے کو ترک کرنا اس کا نام توکل ہے۔ یہ جاہلوں کا خیال ہے۔ کیونکہ کسب اور تدبیر کو ترک کرنا شریعت میں حرام ہے اور جبکہ شریعت نے توکل کرنے والوں کی تعریف کی ہے تو یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ دینی فضیلت، یعنی توکل ممنوعاتِ شرعیہ (یعنی ترک کسب و ترک تدبیر) سے حاصل ہو سکے۔"

اس کے سوا بیماری کی حالت میں دوا اور پرہیز وغیرہ سے اُس کے دفعیہ کی تدبیر کرنی بھی بے شمار روایتوں سے ثابت ہے چنانچہ بعض محدثین نے خاص اسی قسم کی حدیثیں جمع کی ہیں اور اس مجموعہ کا نام طب نبوی رکھا ہے۔

احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ آپؐ نے اکثر صحابہ کو دوا اور پرہیز کی تاکید فرمائی۔ سعد[1] بن معاذ کی فصد خود آنحضرتؐ نے لی اور سعدؓ[2] بن زرارہؓ کے بدن پر داغ دیا۔ علی مرتضیٰ کی آنکھیں دکھتی تھیں، آپؐ نے کھجوریں کھانے کو منع کیا۔ اور صہیبؓ[3] کو آنکھیں دکھنے میں خرما کھانے کا پرہیز بتایا۔ خود آنحضرتؐ

---

[1] سعد بن معاذؓ جلیل القدر صحابی اور مدینہ کے رؤسا میں سے تھے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سید الانصار کا خطاب دیا تھا۔ بدر و اُحد کی جنگوں میں شریک رہے۔ غزوۂ خندق میں ایسا زخم لگا کہ اُس سے جانبر نہ ہو سکے اور ایک مہینہ بعد ذیقعدہ ۵ھ میں صرف ۳۷ برس کی عمر میں وفات پائی۔

[2] سعدؓ بن زرارہ بن عدس بن عبید انصار مدینہ میں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں قبیلۂ خزرج سے تعلق رکھتے تھے۔

[3] صہیبؓ بن سنان رومی۔ عبداللہ بن جدعان کے آزاد کردہ غلام اور اولین صحابیوں میں سے ہیں۔ ۷۰ سال کی عمر میں ۳۸ھ میں بمقام مدینہ انتقال فرمایا۔

صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ رات کو سرمہ اور ہر مہینے میں ایک بار پچھنے لگاتے تھے اور ہر سال مسہل لیتے تھے۔ بچھو وغیرہ کے کاٹنے کا بارہا آپؐ نے علاج کیا۔ داد اور پھنسی پھوڑے کے لیے حنا کا استعمال فرماتے تھے۔ اسی طرح کی اور بہت سی روایتیں لکھی ہیں اور ان لوگوں کا قول رد کیا جو علاج معالجہ ترک کرنے کو افضل بتاتے ہیں اور آخر میں یہ لکھا ہے کہ جو لوگ ترک تداوی کو شرعاً توکل قرار دیتے ہیں ان کو چاہیے کہ بھوک میں کھانا نہ کھانے اور پیاس میں پانی نہ پینے اور سردی میں کپڑا نہ پہننے کو بھی شرط توکل قرار دیں حالاں کہ وہ ایسا ہرگز نہیں کہہ سکتے"۔

توکل کی حقیقت جو ہمارے خیال ناقص میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اگرچہ انسان کی کامیابی کا سیدھا رستہ جو فطرت الٰہی نے اس کو بتایا ہے تدبیر کے سوا اور کوئی نہیں ہے لیکن تدبیر کا کامیاب ہونا ایسے ذریعوں پر موقوف ہے جو قطعاً انسان کی طاقت سے باہر ہیں۔

اول تو انسان کی تدبیر میں بعض اوقات غلطی بھی ہو جاتی ہے یعنی حصول مقاصد کے لیے جو واقعی اسباب اور علل ہیں وہاں تک اس کا ذہن نہیں پہنچتا اور اس سبب سے ناکام رہتا ہے۔ مثلاً طبیب نے مرض کے اسباب و علامات سمجھنے میں غلطی کی اور اس سبب سے اس کا علاج مرض کے موافق نہ پڑا۔

بعض اوقات تدبیر کے ناقص رہ جانے سے بھی مطلب حاصل نہیں ہوتا۔ مثلاً طبیب نے اسباب و علامات تو صحیح سمجھے، مگر جو دوا اس مرض کے لیے نافع تھی، وہ بہم نہ پہنچی۔

اگر بالفرض تدبیر میں کوئی غلطی یا نقصان واقع نہیں ہوا اور مطلب بھی حسب دل خواہ حاصل ہو گیا تو بھی غور کرنا چاہیے کہ جن وسائل سے مطلب حاصل ہوا ہے ان میں کتنے ایسے ہیں جو انسان کی قدرت سے باہر ہیں۔

مثلاً جو تدبیر کہ انسان اپنی بقائے حیات کے لیے ہر روز دو وقت کرتا ہے یعنی روٹی۔ دال۔ سالن وغیرہ جو دونوں وقت پکا کر کھاتا ہے اگر اس میں سے صرف روٹی کے لیے اناج پیدا ہونے اور آٹا پیس کر تیار کرنے کے وسائل پر نظر کی جائے تو بے انتہا وسیلوں کے

ایسے مختلف سلسلے معلوم ہوں جن میں سے ہر ایک کا مرتب کرنا اُس کی طاقت سے باہر ہے مثلاً اگر کسان کی ان تمام ترتیب وار کوششوں سے جو اس نے فصل کے تیار کرنے میں کی ہیں اور مینھ کے پانی اور دن کی حرارت اور رات کی برودت اور مختلف ہواؤں کے تموج اور دیگر قدرتی اسباب سے جن کے سبب غلہ تیار ہوا قطع نظر کی جائے اور ان آلات سے بھی قطع نظر کی جائے جو کھیتی کے کام میں آئے ہیں اور جن کے بننے میں بڑھئی اور لوہار اور کاریگروں کی ضرورت پڑی ہے اور جن کے لیے بہت سے مزدوروں نے لوہا کانوں سے اور لکڑی جنگل سے بہم پہنچائی ہے۔ اگر صرف یہ دیکھا جائے کہ غلہ تیار ہو کر اور اُس کا آنا پس کر انسان تک کیونکر پہنچتا ہے تو بھی ایک بڑا سلسلہ نظر آئے گا جو اس کے احاطۂ قدرت سے باہر ہے۔ کیونکہ غلہ سب جگہ پیدا نہیں ہوتا، بلکہ ایک جگہ سے دوسری جگہ بھر کر لے جاتا ہے اور اس غرض کے لیے بیوپاری دریا اور جنگل قطع کرتے ہیں اور باوجودیکہ کبھی ڈوب جانے کی وجہ سے اور کبھی لُٹ جانے کے سبب سے اور کبھی بعض دیگر اسباب سے ان کو سخت نقصان پہنچتے ہیں تو بھی مسبب الاسباب نے اُن کے دل پر منفعت کی اُمید کو ایسا مسلط کیا ہے کہ وہ اپنی کوشش سے باز نہیں آتے اور انسان کے مدنی الطبع ہونے کی وجہ سے خاص خاص ملکوں کی پیداوار تمام دنیا کی پرورش کرتی ہے، پھر جن جہازوں میں یا جن چھکڑوں میں غلہ لد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتا ہے وہ بھی خودبخود تیار نہیں ہوتے بلکہ بےشمار آدمیوں کی صنعت سے تیار ہوتے ہیں پھر ان بیوپاریوں سے دوکاندار لوگ خرید کر ہر ایک شہر کے کوچے کوچے میں پھیل جاتے ہیں اور اس کو پسنہاریوں سے پسواتے ہیں اور جن آلات سے غلہ پستا ہے یا جا بجا منتشر ہوتا ہے اُن کی تیاری بھی ایک جم غفیر کی محنت پر موقوف ہے۔

غرض کہ ادنیٰ سے ادنیٰ مقصد کے لیے انسان کو وہ اسباب درکار ہیں جو اُس کی قدرت کے احاطہ سے باہر ہیں مگر مدبر السمٰوات والارض نے نظام عالم کا مدار ایسے محکم اور مضبوط قانون پر رکھا ہے جو اُس کی عاجز مخلوق کی تمام ضرورتوں کو حاوی ہے اور کبھی اپنے دائمی اقتضا سے تجاوز نہیں کرتا۔ اسی واسطے انبیاء علیہم السلام نے جو کہ دنیا میں خاص خدائے واحد کی پرستش اور توحید اور عظمت و جلال پھیلانے کے لیے بھیجے گئے تھے، بندوں

کو ایسے قاعدے تعلیم فرمائے ہیں کہ وہ کسی حالت میں اس بڑے بازیگر کو جو پردے میں بیٹھا اس ڈوری تیلی کو نچا رہا ہے، پر کبھی سامنے نہیں آتا، پر بھولنے نہ پائیں۔

صبر و شکر، رضا و تسلیم، خوف و رجا، توبہ و استغفار، عبادت و صدقہ، ذکر اور دعا اور ان کے سوا دیگر مقاماتِ یقین جو انبیاؑ نے تعلیم کئے ہیں وہ سب اپنے اپنے موقع پر اسی غرض کے لیے تعلیم کیے ہیں۔

اسی طرح توکل کی بھی جا بجا تاکید کی گئی ہے یعنی یہ سکھایا گیا ہے کہ انسان کو اپنی تدبیر پر مغرور نہ ہونا چاہیے، بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ اگر قدرتی تائیدیں نہ ہوں گی اور وہ تمام اسباب جو مسبب الاسباب نے ہماری کامیابی کے لیے مقدر کئے ہیں مساعدت نہ کریں گے تو ہماری کامیابی غیر ممکن ہے لیکن یہ سمجھنا کہ یہ خدا پر توکل کر کے بے حس و حرکت بیٹھ جانے سے مطلب حاصل ہو سکتا ہے سخت غلطی ہے۔

چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ نے اس غلطی کو صاف ظاہر کر دیا ہے اور یہ کہا ہے کہ لا یقعد احدکم عن طلب الرزق ویقول اللھم ارزقنی فقد علمتم ان السماء لا تمطر ذھبا ولا فضۃ (احیاء العلوم) یعنی تم میں سے کسی کو نہیں چاہیے کہ تلاش معاش سے بیٹھ رہے اور یہ پڑھا کرے اللھم ارزقنی (بار خدا مجھ کو رزق دے) کیوں کہ تم جانتے ہو کہ آسمان سے سونا چاندی نہیں برستا۔

قیل لاحمد ما تقول فیمن جلس فی بیتہ او مسجدہ وقال لا اعمل شیئاً حتی یاتینی رزقی فقال احمد ھذا رجل جھل العلم اما سمع قول النبی صلعم ان اللہ جعل رزقی تحت ظل رمحی وقولہ من حین ذکر الطیر فقال تغدو خماصاً وتروح بطاناً فذکر انھا تغدو فی الطلب للرزق (احیاء العلوم) یعنی امام احمد بن حنبل[1] سے جب لوگوں نے پوچھا کہ آپ اس شخص کے حق میں کیا کہتے ہیں جو اپنے گھر یا مسجد میں بیٹھا ہے اور کہے کہ میں کچھ نہ کروں گا جب تک کہ رزق میرے پاس آپ سے نہ آئے تو انھوں نے یہ جواب دیا کہ ایسا شخص علم دین سے جاہل ہے، کیا اس نے نبی صلعم سے نہیں سنا کہ خدا نے میرا رزق میرے نیزہ

---

[1] امام احمد بن حنبل۔ حنبلی فرقہ کے امام اور حدیث و فقہ کے بڑے عالم تھے۔ ۱۶۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۴۱ھ میں وفات پائی۔

کے سایہ تلے مقرر کیا اور یہ قول بھی نہیں سنا کہ پرندے صبح کو بھوکے نکلتے ہیں اور شام کو سیر ہو کر آتے ہیں۔ یعنی وہ رزق کی تلاش میں نکلتے ہیں۔

توکل کی تعلیم میں اس روحانی تسکین کے علاوہ جو اوپر ذکر کی گئی ایک دنیوی مصلحت بھی مضمر ہے۔ یعنی آدمی اپنی عاجزی اور درماندگی پر اور کامیابی کی بے انتہا مشکلات پر نظر کر کے اکثر اوقات تدبیر کرنے سے جی چھوڑ دیتا ہے اور اپنی کوشش کو ان بے انتہا مشکلات کے مقابلے میں ناچیز سمجھ کر ہاتھ پاؤں نہیں ہلاتا۔ اسی واسطے خدا پر بھروسہ کرنے کی تاکید کی گئی ہے، تاکہ انسان پر مایوسی اور جبن طاری نہ ہونے پائے اور وہ اپنے اڑے وقتوں میں مسبب الاسباب اور رب الارباب پر بھروسا کر کے کوشش کے لیے فوراً اٹھ کھڑا ہو جائے۔ اسی لیے کلام الٰہی میں ارشاد ہوا ہے کہ وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ یعنی خدا پر بھروسہ کرنا ہی کامیابی کے لیے کافی ہے۔ کیونکہ اس پر بھروسا کرنے کے بعد کوئی مشکل مشکل نہیں رہتی اور کوشش و تدبیر کرنے کا حوصلہ جو کہ کامیابی کا اصلی سبب ہے خود بخود پیدا ہو جاتا ہے اور اسی لیے یہ بھی ارشاد ہوا کہ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ یعنی جب تو کسی کام کا ارادہ کرے تو خدا پر بھروسا کر۔ اس سے معلوم ہوا کہ توکل کرنے کا حکم اس لیے نہیں دیا گیا کہ تدبیر و کوشش کرنی نہ پڑے بلکہ اس لیے دیا گیا کہ تدبیر اور کوشش کرنے کی جرأت اور حوصلہ زیادہ ہو۔

غالباً ہمارا اوپر کا بیان اس مطلب کے لیے کافی ثبوت ہوگا کہ عقل اور شرع دونوں کی رو سے کامیابی کا اصل ذریعہ تدبیر کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔

ابھی ہم کو یہ بیان کرنا باقی ہے کہ جب عقل اور تدبیر دونوں سے تدبیر کی ضرورت معلوم ہوتی ہے تو کیا سبب ہے کہ ہماری قوم میں یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ انسان کی تدبیر سے کچھ نہیں ہوتا۔

کبھی وہ بعض اشخاص کو بغیر سعی و تدبیر کے کامیاب ہوتے دیکھتا ہے۔ نہایت مفلس آدمی تھا اس کو اتفاقاً دفعتاً کوئی ایسا دفینہ مل گیا جس سے اس کا افلاس جاتا رہا۔ ایک شخص مدت سے کسی مہلک مرض میں گرفتار رہتا اور علاج معالجہ نہ کرتا تھا دفعتاً اس کا مرض خود بخود

زائل ہو گیا۔

کبھی وہ بعض لوگوں کو باوجود تدبیر اور کوشش کے ناکام پاتا ہے۔ مثلاً ایک دائم المریض ہمیشہ علاج معالجہ کرتا ہے مگر کبھی درست نہیں رہتا۔ یا ایک شخص نے بارہا کھیتی کی اور ہمیشہ نقصان اٹھایا۔ پس دونوں صورتوں سے وہ نتیجہ نہیں نکالتا ہے کہ تدبیر کچھ چیز نہیں۔ لیکن حقیقت میں ان دونوں صورتوں سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا۔ بلکہ یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بعض کامیابی بغیر تدبیر کے بھی ہوتی ہے اور بعض تدبیریں غلط یا بے محل بھی ہوتی ہیں۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک رستہ قزاقوں اور درندوں سے بے خطر ہے اور دوسرے رستہ میں قزاقوں اور درندوں کا خطرہ ہے لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس بے خطر رستہ میں بعض مسافروں کو گزند پہنچی ہے اور اس خطرناک رستہ سے بعض مسافر بامن و امان گزر گئے ہیں، لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ پہلا رستہ خطرناک اور دوسرا بے خطر ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ لوگ بعض شخصوں کو (جیسے واعظ، مولوی، زاہد اور صوفی وغیرہم) دیکھتے ہیں کہ وہ نوکری، حرفہ، تجارت، زراعت اور ظاہری حیلوں میں سے کوئی حیلہ معاش کا نہیں رکھتے، مگر ان کے سب کام نہایت عمدہ طور سے چلتے ہیں اور ان کی حالت اکثر دوڑ دھوپ کرنے والوں سے بہتر ہے۔ پس ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اگر معاش کا مدار حیلہ و تدبیر پر ہوتا تو یہ لوگ جو محض توکل کے سہارے پر بیٹھے ہیں اور کوئی حیلہ نہیں کرتے کس طرح فارغ البال رہ سکتے تھے۔ لیکن ایسا سمجھنا بڑی موٹی غلطی ہے۔ یہ بزرگوار محض توکل کے سہارے پر نہیں بیٹھے، بلکہ انھوں نے دقائق حیل میں سے ایک ایسا حیلہ اختیار کیا ہے جو ظاہر بینوں کی نگاہ میں توکل معلوم ہوتا ہے۔ محنت کا حق و فائدہ دو طرح ہوتا ہے معین اور غیر معین۔ معین ایسا ہے جیسے کہ ڈاکٹر کی فیس، جو اس کے ہر پھیرے میں بیمار کو دینی پڑتی ہے یا جیسے پادری کی تنخواہ جو مشن سے اس کے لیے مقرر ہے۔ اور غیر معین ایسا ہے، جیسے ہندوستانی طبیب کا نذرانہ کہ کسی بیمار سے ایک روپیہ، کسی سے دو روپیہ، کبھی

سے اور زیادہ وصول ہوتا ہے اور کسی سے کچھ نہیں ملتا۔ پس جو لوگ اپنی قوم میں وعظ یا درس یا تلقین وغیرہ کرتے ہیں اور اس خدمت کی کوئی اجرت وغیرہ مقرر نہیں کرتے وہ گویا جیبیوں کی طرح قوم میں غیر معین نذرانہ کے مستحق بنتے ہیں اور حق یہ ہے کہ اگر وہ راستی، دیانت اور آزادی سے یہ کام کریں تو ان کا استحقاق تسلیم کے قابل ہے۔ لیکن افسوس ہو کہ جس قوم میں نہ دولت ہو، نہ علم ہو، نہ اہل علم نہ اہل اللہ کی کچھ عظمت ہو وہاں معاش کا مدار ایسی غیر معین آمدنی پر رکھنے میں راست بازی قائم نہیں رہ سکتی۔ احیاء العلوم میں کسی بزرگ کا یہ قول لکھا ہے کہ "سب بندے خدا کے رزق سے متمتع ہوتے ہیں۔ مگر بعضے ذلت کے ساتھ جیسے سائل اور بعضے مشقت اور انتظار کے بعد، جیسے تاجر اور بعضے بے وقعتی کے ساتھ جیسے پیشہ ور بعضے عزت کے ساتھ، جیسے صوفی" یعنی ان لوگوں کے سوا جو خدا پر تکیہ کیے خانقاہوں اور مسجدوں میں بیٹھے ہیں اور کوئی عزت سے روٹی نہیں کھاتا۔ شاید مسلمانوں کے عروج کے زمانہ میں ایسا ہی ہو، مگر زمانہ حال میں ہم بالکل اس کے برخلاف دیکھتے ہیں۔ اب ان لوگوں کے سوا جو مشقت سے معاش حاصل کرسکتے ہیں۔ اور کوئی عزت سے روٹی نہیں کھاتا۔ اور اگر انصاف سے دیکھو تو ہر زمانے میں یہی لوگ اصل عزت کے مستحق ہونے چاہئیں۔ کیونکہ اگر دنیا سے یہ گروہ مفقود ہو جائے اور سب خدا پر توکل کر کے خانقاہوں اور مسجدوں میں بیٹھ رہیں تو ساری دنیا کا چند روز میں خاتمہ ہو جائے۔

ایک اور سبب تدبیر کے بیکار اور لاحاصل سمجھنے کا یہ ہوتا ہے کہ جس قوم میں زمانے کے موافق علوم و فنون کی تعلیم نہیں ہوتی اور ان کا تجربہ اور واقفیت محدود ہوتی ہے، ان کی تدبیریں اکثر غلط یا غیر مفید ہوتی ہیں اور اس سبب سے جب کہ وہ پے در پے ناکامیاں دیکھتے ہیں تو لاچار ہو کر تدبیر کو محض ہیچ و پوچ جاننے لگتے ہیں۔ مثلاً جو شخص نوکری کی لیاقت نہیں رکھتا وہ نوکری تلاش کرتا ہے، یا جو تجارت کے اصول سے واقف نہیں، وہ تجارت کر بیٹھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگ شاذ و نادر ہی کامیاب ہو سکتے ہیں پس جب وہ متواتر ناکامیاں دیکھتے ہیں تو تدبیر سے ان کا جی چھوٹ جاتا ہے۔

کامیابی کے ذرائع

اصل یہ ہے کہ کامیابی کے لیے تین شرطیں نہایت ضروری ہیں:
(۱) محنت (۲) علم (۳) ہمت

اگر ان میں سے ایک شرط بھی نہ پائی جائے گی تو کام حسب لخواہ سرانجام نہ ہوگا مثلاً ایک شخص نہ تو پیمائش کے اصول سے واقف ہے اور نہ پیمائش میں مشاق دوسرا شخص پیمائش کے اصول تو جانتا ہے مگر اس نے کبھی پیمائش نہیں کی تیسرا شخص پیمائش کے اصول بھی جانتا ہے اور اس میں مشاق بھی ہے۔ اب ان تینوں شخصوں نے تین مختلف رقبوں کی پیمائش شروع کی۔

پہلا شخص کسی طرح صحیح پیمائش نہیں کر سکتا۔

دوسرا شخص بہت دیر میں نہایت دقت سے تھوڑے رقبہ کی پیمائش کر سکتا ہے۔

تیسرا شخص نہایت آسانی سے تھوڑے عرصے میں دوسرے شخص سے دس گنے رقبے کی صحیح پیمائش کر سکتا ہے۔

پھر جس قدر علم اور ہنر زیادہ ہوگا اسی قدر کامیابی زیادہ ہوگی۔ مثلاً چوتھا شخص اگر پلین ٹیبل یا پریزمٹک کے ذریعہ سے پیمائش کرے گا تو تیسرے شخص سے بھی زیادہ صحیح اور جلد پیمائش ہوگی۔

ہماری قوم چونکہ معاش کے ان علوم و فنون سے بالکل بے بہرہ ہے جو اس زمانے میں درکار ہیں، اس لیے جب وہ کسی کام میں ہاتھ ڈالتے ہیں تو ان کا ہاتھ ہمیشہ اوچھا پڑتا ہے، اور آخر کو تھک کر وہ یہ کہہ اٹھتے ہیں کہ "تدبیر سے کچھ نہیں ہو سکتا"

یہ تمام اسباب جو اوپر بیان کیے گئے سب بمنزلہ فروعات کے ہیں اور ان سب کا اصل اصول ایشیا کی تعلیم اور اس کی سوسائٹی ہے جس کا ذاتی خلاصہ یہ ہے کہ وہم کو غالب اور عقل کو مغلوب کرتی ہے۔ ایشیا کا ہر متنفس ہوش سنبھالتے ہی چاروں طرف ایسی آوازیں سنتا ہے جو اس کی ہمت کو پست اور حوصلہ کو تنگ کرنا چاہتی ہیں اور رفتہ رفتہ وہم کو اس کی طبیعت پر ایسا مسلط کر دیتی ہیں کہ جن قویٰ کی بابت وہ اشرف المخلوقات قرار پایا ہے، وہ بالکل مضمحل ہو جاتی ہیں۔

اگرچہ ایشیا کی تمام قوموں میں اوہام کا غلبہ اور عقل کی مغلوبیت برابر پائی جاتی ہے لیکن چونکہ مجھ کو خاص مسلمانوں کی حالت سے بحث ہے اس لئے میں خاص کر انھیں کا ذکر کرتا ہوں۔ مثلاً اولاد جو ماں باپ کی بے پروائی یا نالیاقتی یا فرطِ محبت کے سبب نالائق ہو جاتی ہے تو اس کا الزام ہمیشہ تقدیر کے ذمہ لگایا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ تقدیر کے بگڑے کو کوئی سنوار نہیں سکتا۔ جنون، خفقان، بخار، سرسام اور اکثر بیماریوں کے علاج سیانوں اور عاملوں سے کرائے جاتے ہیں۔

اگر کسی کو کوئی ناگہانی صدمہ پہنچ جائے تو اکثر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کو کسی بُرے کام کی سزا ملی ہے اگر اس بُرے کام کو اس صدمے سے کچھ علاقہ ہو یا نہ ہو۔ مثلاً گھوڑے سے اس لیے گر پڑا کہ سادات کی بے ادبی کی تھی۔ مجنوں اس سبب سے ہو گیا کہ خلفاء پر تبرا کیا کرتا تھا خارج اس سے گرا کہ مسجد میں ناپاک چلا گیا تھا۔ لنگڑا اس وجہ سے ہو گیا کہ شہید صاحب کی قبر پر جوتیوں سمیت چڑھ گیا تھا۔

جس شخص نے اپنی محنت سے دولت کمائی ہے یا باپ دادا کی میراث اس کو پہنچی ہے یا جو شخص صاحب اولاد ہے یا جس کی اولاد سعادت مند ہے اس پر خدا کی ایک خاص اور غیر معتاد عنایت سمجھتے ہیں جس کا نام اقبال ہے اور جو شخص ایسا نہیں ہوتا اس کو خدا کے ایک خاص اور غیر معتاد غصہ میں گرفتار جانتے ہیں جس کا نام ادبار ہے۔

مکان اور مویشی اور عورتیں مبارک یا نحس سمجھی جاتی ہیں۔ دیوان حافظ اور دیگر کتابوں میں فالیں دیکھی جاتی ہیں۔ جانوروں اور اور چیزوں سے اچھے یا بُرے شگون لئے جاتے ہیں جن، بھوت اور پریاں وغیرہ مانی جاتی ہیں۔ مزاروں سے مرادیں مانگی جاتی ہیں اور نذریں چڑھائی جاتی ہیں۔

عربی، فارسی اور اردو جو کہ مسلمانوں کی زبانیں ہیں ان تینوں زبانوں کا لٹریچر اسی قسم کے اوہام اور خیالات سے بھرا ہوا ہے جس وقت سے بچہ مکتب میں بیٹھتا ہے برابر یہی

تعلیم پاتا ہے، گھر میں چھوٹے بڑے سے یہی سبق پڑھتا ہے، باہر ہمجولیوں سے یہی آوازیں سنتا ہے۔ اسی طرح بیشمار اور ہزار در ہزار اوہام باطلہ ہیں جنھوں نے چاروں طرف سے ان کو جکڑ بند کر رکھا ہے۔

شاید یہاں یہ خیال پیدا ہو کہ یہ خیالات مسلمانوں میں مذہب کے سبب سے پھیلے ہیں مگر ادنیٰ غور کے بعد یہ شبہ رفع ہو سکتا ہے۔ سوپر نیچرل (خلاف عقل و قیاس) باتیں جن سے یہ خیالات اور اوہام ترقی کر سکتے ہیں جس قدر بائیبل سے مفہوم ہوتی ہیں ان کا عشر عشیر بھی قرآن مجید میں نہیں پایا جاتا۔ بلکہ بعضوں کو اس بات کا یقین ہے کہ **"قرآن مجید میں ایک بات بھی فطرت الٰہی کے خلاف نہیں ہے۔"**

حالانکہ بائیبل کی ماننے والی قومیں یعنی اہل یورپ میں ان خیالات و اوہام کا کہیں نام بھی نہیں، یورپ کے کروڑوں آدمی جو بائیبل کے ایک ایک حرف کو الہامی مانتے ہیں۔ ان میں سے ایک بھی ایسا نہ ہوگا جو اہل ایشیا یا اہل اسلام کی مانند اوہام میں گرفتار ہو۔ اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایشیا میں بالخاص کر اسلام میں اوہام کا غلبہ اور عقل کی مغلوبیت مذہب سے ہرگز پیدا نہیں ہوئی، بلکہ ایسے اسباب سے پیدا ہوئی ہے جو ایشیا میں پائے جاتے ہیں اور یورپ میں نہیں پائے جاتے۔

ہنری ٹامس بکل[1] نے اپنی "تاریخ تمدن" میں نہایت عمدگی سے یہ بات ثابت کی ہے کہ جن ملکوں میں نیچرل فنامنا یعنی قدرتی ظہور نہایت تعجب خیز اور دہشت انگیز ہوتے ہیں، وہاں خواہ مخواہ وہم غالب

---

[1] ہنری ٹامس بکل - ۲۴ر نومبر ۱۸۲۱ء کو بمقام لی واقع کنٹ (انگلستان)، ایک دولتمند تاجر کے ہاں پیدا ہوا۔ اُس نے ساری عمر تحصیل علم اور خدمت علم میں گزار دی! انہماک یہ ہے کہ اس شوق میں ساری عمر شادی بھی نہیں کی۔ بکل کو دُنیائے علم میں خاص شہرت اس کی تصنیف "ہسٹری آف سویلیزیشن" کی وجہ سے حاصل ہے۔ اس کتاب کا اُردو ترجمہ "تاریخ تمدن" کے نام سے عرصہ ہوا کہ انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن کی جانب سے دو جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔ بکل نے ۱۸۶۲ء میں بمقام دمشق انتقال کیا جہاں وہ بیماری کی وجہ سے برغرض تبدیل آب و ہوا گیا ہوا تھا

اور عقل مغلوب ہو جاتی ہے اور جب تک بذریعہ تعلیم یا دیگر اسباب کے وہم کو مغلوب اور عقل کو غالب نہیں کیا جاتا وہ ممالک اسی حالت میں گرفتار رہتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے:۔

"ایشیا، افریقہ اور امریکہ میں بہ نسبت یورپ کے بیرونی دنیا نہایت عظیم الشان ہے، صرف پہاڑ اور قدرتی سرحدوں کا جو ہمیشہ قائم اور ثابت رہتی ہیں یہ ذکر نہیں ہے بلکہ اتفاقی تنا مناکا بھی یہی حال ہے۔ مثلاً زلزلہ، طوفان۔ وبا وغیرہ جو کہ ان ملکوں میں بہ نسبت یورپ کے بہت زیادہ ہوتے ہیں اور بہت نقصان پہنچاتے ہیں، وہ خطرے جو بار بار ظہور کرتے ہیں ان سے بھی وہی نتیجے پیدا ہوتے ہیں جو قدرت کے دائمی مظاہر سے ظاہر ہوتے ہیں کیونکہ دونوں حالتوں میں وہم اور تصورات زیادہ ہوتے ہیں۔ گرم ملکوں میں بہ نسبت اور جگہ کے اس قسم کے واقعات بہت ہوتے ہیں اور اسی سبب سے گرم ملکوں میں وہم غالب رہتا ہے۔ مثلاً زلزلہ جو کہ بڑا اور عجیب واقعہ ہے اور جس کا ظہور ہمیشہ دفعتاً ہوتا ہے اور جس میں جانیں بھی بہت ہلاک ہوتی ہیں، ملک پیرو میں اکثر واقع ہوتا ہے اور ہر مرتبہ کے زلزلہ میں عموماً دہشت اور خوف بڑھ جاتا ہے پس جب کہ دل ہمیشہ خائف و ترساں رہتا ہے اور انسان ایسے ایسے حوادث دیکھتا ہے کہ جن سے بچ سکتا ہے نہ جن کو سمجھ سکتا ہے تو اس اپنی مجبوری اور عاجزی کا یقین ہو جاتا ہے اور وہم حد سے زیادہ بڑھ جاتا ہے اور عقل پر غالب ہو کر انسان کے دل میں بے اصل خیالات پیدا کر دیتا ہے۔ ایشیا کی شائستگی کا مرکز یعنی ہندوستان بھی نیچرل تنا مناسے خوف لاتا ہے۔ علاوہ ان خطروں کے جو گرم آب و ہوا میں وقتاً فوقتاً ہوتے رہتے ہیں ایشیا میں ایسے بڑے بڑے پہاڑ ہیں جو آسمان کو چھوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، اور جن کی اطراف سے ایسے بڑے بڑے دریا نکلتے ہیں جن کی دھار کسی ہنر سے پھر نہیں سکتی اور جن پر آج تک کوئی پل نہیں بندھا۔ علاوہ ازیں ناقابل گذر جنگل بھی ہیں اور ایسے جن کی حد نہیں ہے پھر ان کے غیر متناہی ویرانے ہیں، جن سے انسان کو یہ نصیحت ہوتی ہے کہ ہم

نہایت کمزور ہیں اور نیچر کے زور کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں خشکی کے دونوں طرف بڑے بڑے سمندر ہیں جن میں ہمیشہ طوفان آتے رہتے ہیں اور ان سے ایسا نقصان ہوتا ہے کہ دنیا یورپ میں جانتے بھی نہیں۔ اور ایسا دفعتاً زور شور سے ہوتا ہے کہ اس کی گزند سے بچنا غیر ممکن ہے۔ ایشیا کے وہ حصے جہاں اعلیٰ درجے کی شائستگی ہوئی (جیسے ہندوستان) یورپ کے نہایت شائستہ حصوں کی نسبت متعدد طبیعی اسباب کی وجہ سے ناتندرست ہیں بڑی بڑی بائیں جو مختلف اوقات میں یورپ میں آئیں وہ سب مشرق سے آئیں جو گویا ان کی قدرتی پیدائش کی جگہ ہے اور جہاں وہ نہایت مہلک ہوتی ہیں۔ جتنی سخت بیماریاں اب تک یورپ میں موجود ہیں منجملہ ان کے شاذ و نادر ہی کوئی بیماری وہاں کی ہوگی اور سب سے بڑی بیماریاں سنہ عیسوی کی پہلی صدی میں (اور اس کے بعد) گرم ملکوں سے آئیں۔ برخلاف اس کے یورپ میں نیچرل فنامنا نے وہم کو محدود اور سمجھ کو دلیر کیا اور انسان کو اپنی قوتوں پر بھروسا ہوا۔ علم کی ترقی میں آسانی اور دلیری ہوئی تحقیقات کے شوق نے ترقی پائی اور علم کی طرف رغبت پیدا ہوئی جس پر تمام آئندہ ترقیاں موقوف ہیں۔ یورپ کی شائستگی کا مرکز یعنی یونان جو کہ مثل ہندوستان کے جزیرہ نما ہے، اس کی بالکل ہندوستان کے برخلاف ہے جیسے ہند میں ہر شے بڑی اور خوفناک ہے، ویسے ہی یونان میں ہر شے چھوٹی اور کمزور ہے خود یونان ایک بہت چھوٹا سا ملک ہے اور ایک سکڑے سمندر میں واقع ہے۔ جہاں سے بکمال آسانی گزر ہوسکتا ہے، آب و ہوا یہاں کی نہایت صحت بخش تھی، زمین پر زلزلے بہت کم آتے تھے، طوفان اور بگولے سے ضرر بہت کم پہنچتا تھا، وحشی اور موذی جانور بھی شمار میں کم تھے۔ یونان کے اونچے سے اونچے پہاڑ ہمالہ کے ایک تہائی سے بھی کم بلند ہیں۔ دریاؤں کا یہ حال ہے کہ شمالی اور جنوبی یونان میں چند

چشموں کے سوا کچھ نہیں ملتا اور وہ بھی پایاب ہیں اور گرمی میں خشک ہو جاتے ہیں پس ان دونوں ملکوں کی موجودات کے اختلاف کے سبب خیالات میں بھی اختلاف پیدا ہوا۔ کیوں کہ جس قدر خیالات ہوتے ہیں وہ کچھ تو خود دل کی پیداوار ہوتے ہیں اور کچھ دنیا کی بیرونی صورت کو دیکھنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ ہندوستان جن چیزوں سے گھرا ہوا ہے ان سے خوف اور دہشت پیدا ہوئی اور یونان میں انہیں سے اطمینان حاصل ہوا وہاں انسان کا دل خائف ہوا، اور یہاں انہیں باتوں سے ہمت اور دلیری پیدا ہوئی۔ ہندوستان میں ہر قسم کی دقتیں ایسی بیشمار اور ایسی خوفناک اور بظاہر اس قدر سمجھ سے باہر درپیش آئیں کہ زندگی کی ہر ایک مشکل بات کا سبب بہ مجبوری ایسا قرار دینا پڑا کہ انسان کی قدرت سے باہر ہو۔ جب کسی بات کا سبب سمجھ میں نہ آیا، فوراً وہم اور تصور نے اپنا عمل کیا اور آخر وہم کا غلبہ ایسا خطرناک ہوگیا کہ سمجھ مغلوب ہوگئی اور اعتدال جاتا رہا۔ یونان میں چونکہ نیچر خوفناک اور بہت چھپی ہوئی نہ تھی اس سبب سے وہاں انسان کے دل پر خوف کم غالب ہوا، اور لوگ خیال پرست کم ہوئے طبعی اسباب کے دریافت کرنے پر توجہ ہوئی اور علم طبعی ایک چیز قرار پایا اور انسان کو رفتہ رفتہ اپنی قوت اور اقتدار کا علم ہوتا گیا اور وہ ایسی دلیری سے واقعات کی تحقیقات کرنے لگا کہ اس قسم کی جرأت ان ملکوں میں ہرگز نہیں ہو سکتی، جہاں آزادی نیچر کے دباؤ سے مظلوم ہو رہی ہے اور جہاں ایسے واقعات پیدا ہوتے رہتے ہیں جو سمجھ میں نہیں آسکتے۔" انتہیٰ ملخصاً۔

اس کے بعد ٹامس بکل نے ہندوستان اور یونان کا مقابلہ لٹریچر اور مصوری وغیرہ میں کیا ہے جس سے نہایت واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ ایشیا میں اوہام کا غلبہ مذہب کے سبب سے نہیں، بلکہ قدرت کے خوفناک ظہوروں کے سبب سے انسان کے دل میں پیدا ہوا ہے، اور خاص کر ان دو ملکوں کا مقابلہ اس لیے کیا ہے کہ ایشیا اور یورپ کے مرکز یہی

دونوں ملک قرار دیے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جیسے خیالات مرکز میں پیدا ہوں گے وہی محیط تک پھیلیں گے اور یہی سبب ہے کہ ایشیا کے تمام ملکوں میں جہاں ۷۰ کروڑ ۵ لاکھ آدمی آباد ہیں، تقریباً ایک ہی سے خیالات اور ایک ہی سے اوہام طبیعتوں پر چھائے ہوئے ہیں۔

ان تمام اسباب کے سوا جو اوپر ذکر کیے گئے اور بھی اسباب ہیں جو انسان کے دل میں اپنی مجبوری کا خیال پیدا کرتے ہیں اور اس کو بڑے بڑے کاموں میں اقدام نہیں کرنے دیتے۔ لیکن ہم خیال کرتے ہیں کہ اس قدر بیان بھی اصل مدعا کے ذہن نشین کرنے کے لیے کافی ہوگا۔ جن قوموں نے تدبیر اور کوشش کی ہے وہ جلدی یا دیر میں ضرور کامیاب ہوئی ہیں اور ایسی ایسی مشکلوں پر غالب آئی ہیں جن کے حل ہونے سے یہ قول ان کے ہاں ضرب المثل ہوگیا کہ (NOTHING IS IMPOSSIBLE) (یعنی کوئی چیز ناممکن نہیں) پس جب تک ہماری قوم کے دل میں بھی ایسے خیالات پیدا نہ ہوں گے تب تک اُمید نہیں ہوسکتی کہ ترقی اور تمدن کی فہرست میں ہمارا نام درج ہو سکے اور خلافت رحمانی کا ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ بھی ہمارے ہاتھ آئے۔ فقط۔

۹۔ مزاح

(از رسالہ تہذیب الاخلاق۔ ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) صفحہ ۲۵۸)

مزاح، جس کو غلطی سے مذاق کہنے لگے ہیں، انسان کی ایک جبلی خاصیت ہے جو کم و بیش تمام افراد میں پائی جاتی ہے۔

مزاح کو عربی، فارسی اور اردو میں تین مختلف القاب دیئے گئے ہیں یعنی

۱۔ مطایبہ
۲۔ خوش منشی
۳۔ خوش طبعی

یہ تینوں لقب اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ مزاح کا موضوع "خوشی" کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے۔ روزانہ محنت و مشقت جو ہر انسان کا فرض ہے، اس کے بعد ہر شخص ایسے مشغلے ڈھونڈتا ہے جن سے تھوڑی دیر دل بہلے اور دن بھر کی کوفت رفع ہو اور ایسے اوقات میں کوئی مشغلہ مزاح سے بہتر نہیں ہے۔

ہم اپنی زبان میں مزاح کا ترجمہ ہنسی، چہل، دل لگی، ٹھٹول وغیرہ کر سکتے تھے، مگر افسوس ہے کہ اب ہماری زبان میں یہ الفاظ صرف مزاح کے مترادف نہیں رہے بلکہ چھچھورپن، تھہڑپن، مسخرگی، فحش و دشنام، بے حیائی، دھول دھپّا، جوتی پیزار بھی شامل ہیں۔

مزاح جب تک مجلس کا دل خوش کرنے کے (نہ کہ کسی کا دل دکھانے کے) لیے کیا جائے ایک ٹھنڈی ہوا کا جھونکا یا ایک سہانی خوشبو کی لپٹ ہے جس سے تمام پژمردہ دل باغ باغ ہو جاتے ہیں، ایسا مزاح فلاسفہ و حکما، بلکہ اولیا رحمہ و انبیا نے بھی کیا ہے۔ اس سے مرے ہوئے دل زندہ ہوتے ہیں اور تھوڑی دیر کے لیے تمام پژمردہ کرنے والے غم غلط ہو جاتے ہیں۔ اس سے جودت طبع اور ذہن کو تیزی ہوتی ہے اور مزاح کرنے والا سب کی نظروں میں محبوب اور مقبول ہو جاتا ہے۔

برخلاف اس کے جب وہ اس حد سے بڑھنے لگتا ہے تو دمبدم ہولناک ہوتا جاتا ہے اور آخر اس سے بجائے محبت کے دشمنی اور بجائے دشمنی کے غم پیدا ہوتا ہے۔ وہ اخلاق کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے لوہے کو زنگ یا لکڑی کو گھن۔ مزاح کرنے والا ایسا بے دید ہو جاتا ہے کہ غیروں کو ہنسانے کے لیے اپنے عزیز دوست کا خاکہ اُڑانے لگتا ہے۔ وہ ایسا بیباک ہو جاتا ہے کہ خدا اور رسول پر بھی اس کی ایک آدھ پھبتی ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ وہ ایسا کذاب ہو جاتا ہے کہ بُری خبریں جن کو سُن کر خاص یا عام لوگوں کو رنج ہو نہایت خوشی سے اُڑاتا ہے۔ وہ ایسا بے غیرت ہو جاتا ہے کہ اس کو سخت سے سخت گالی بھی ناگوار نہیں گزرتی۔ وہ ایسا مفسد ہو جاتا ہے کہ باتوں باتوں میں لڑائی کرا دینی اس کے نزدیک ایک کھیل اور معمولی بات ہوتی ہے۔ غرض تمام دنیا کے عیب مزاح کی زیادتی سے انسان میں پیدا ہو جاتے ہیں۔

مزاح کے بڑھنے کے مختلف اسباب ہوتے ہیں مگر ہم یہاں وہ خاص سبب بیان کرنا چاہتے ہیں جس کی وجہ سے مزاح کسی خاص قوم میں رفتہ رفتہ تمسخر اور استہزا بلکہ فحش و دشنام کے درجہ کو پہنچ کر انسانی خصلت سے ایک قومی خصلت بن جاتا ہے اور اس قدر عام ہو جاتا ہے کہ اس کی بُرائی اور عیب نظروں سے ساقط ہو جاتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ آج ہنسی اور چہل میں جو امتیاز ہماری قوم کو حاصل ہے وہ تمام ہندوستان میں کسی قوم کو حاصل نہیں ہے۔

جتنے ضلع جگت بولنے والے اور پھبتیاں کہنے والے پیدا ہوتے ہیں اسی قوم میں پیدا ہوتے ہیں۔

جتنی گالیاں ایک مسلمان شریف زادہ کو یاد ہوتی ہیں کسی کو نہیں ہوتیں۔

تمام ہندوستان میں جتنے پنچ اخبار ہیں اُن کے ایڈیٹر و پرائٹر (مالک) اور کارسپانڈنٹ (نامہ نگار) اسی قوم کے زندہ دل ہیں۔

ہندوستانی امیروں اور امیرزادوں کی مجلس میں جتنے مسخرے اور رونقِ محفل پاؤگے اسی قوم کے پاؤگے۔

واعظوں میں جتنے لطیفہ گو اور بذلہ سنج دیکھوگے اسی قوم کے پاؤگے۔

فحش اور بے حیائی کی کتابوں میں ایک بھی ایسی کوئی جس کا مصنف مسلمان نہ ہوگا۔
مناظرہ کی کتابیں اسی قوم کے عالموں کی ایسی نکلیں کی جن میں ستم ظریفی کا پورا پورا حق ادا کیا گیا ہو۔
شاعروں میں کوئی ہاجی، ہزل گو، ریختی گو اور گندہ دہن ایسا نہ ہوگا جو قوم کا مسلمان نہ ہو۔

داستان کہنے والوں میں صرف ایک شخص ایسا سنا گیا ہے جو اصل میں قوم کا مسلمان نہ تھا لیکن آخر اس کو بھی مسلمان ہونا پڑا۔

الغرض اس قوم کی فصاحت۔ ذہانت اور فضیلت جس قدر مزاح میں صرف ہوتی ہے ویسی کسی اور کام میں نہیں ہوتی۔

یہاں تعجب کے ساتھ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کمینہ خصلت اسی قوم کے حصے میں کیوں آئی ہے؟ شاید اس کا جواب یہ دیا جائے کہ تنزل کے زمانے میں ہر ایک قوم کے فضائل رذائل کے ساتھ بدل جاتے ہیں اور تمام کمینہ خصلتیں اور سفلہ عادتیں خاص و عام میں خواہ مخواہ پیدا ہو جاتی ہیں۔ لیکن غور کرنے کے بعد یہ جواب ناکافی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ ابھی یہ بات غیر منفصل ہے کہ قومی تنزل اخلاق کے بگڑنے کا باعث ہوتا ہے یا اخلاق کا بگڑنا قومی تنزل کا باعث ہوتا ہے۔ پس وہی سوال اب بھی باقی رہتا ہے۔

البتہ ایک اور جواب ہمارے خیال میں آتا ہے جو غور کے قابل ہے۔ ادنیٰ توجہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مزاح کو جس قدر تعلق زبان ــــ اور الفاظ سے ہے ایسا اور کسی چیز سے نہیں۔ خاص خاص صورتوں کے سوا ہنسی اور چہل الفاظ ہی کے پیرائے میں کی جاتی ہے۔

اُس زمانے میں جب کہ انسان کی اخلاقی تعلیم طفولیت کی حالت میں تھی اور اس کی منھ زوری اور بدلگامی کا چنداں انسداد نہ ہوا تھا، ضرور ہے کہ مزاح اور ظرافت نے ان قوموں میں زیادہ رواج پایا ہوگا جن کی زبان میں اس کی زیادہ قابلیت تھی۔

جہاں تک ہم کو معلوم ہے کہہ سکتے ہیں کہ جاہلیت کے زمانے میں عرب کی زبان اس وقت کی تمام زبانوں کی نسبت اس بات کی زیادہ قابلیت رکھتی تھی۔ اس میں ایسے الفاظ کثرت

سے تھے جو دو معنی رکھتے ہوں اور دونوں ایک دوسرے کی ضد ہوں جیسے مولیٰ کہ آقا اور غلام دونوں کو کہتے ہیں

اس میں ایسے الفاظ بھی بکثرت تھے جو بہت سے مختلف معنوں کے لیے وضع کیے گئے ہوں جیسے عین کہ آنکھ، چشمہ، ذات اور سونے کو کہتے ہیں۔

اس میں مترادف الفاظ بھی بے شمار تھے۔ یعنی ایک ایک معنی کے لیے کئی کئی لفظ مستعمل ہوتے تھے جیسے اسد، لیث، غضنفر وغیرہ

اس وقت عرب میں شاعری کا زور بھی اس قدر تھا کہ دُنیا کی کسی زبان میں نہ تھا اور اس سبب سے مجاز، کنایہ اور استعارہ کا وہاں سب جگہ سے زیادہ برتاؤ تھا۔

یہ تمام باتیں جو اوپر بیان کی گئی ہیں ایسی ہیں جو اہلِ زبان کو مزاح کی طرف خود بخود مائل کرتی ہیں کیونکہ مزاح میں زیادہ تر ایسے ہی لفظوں کا استعمال ہوتا ہے۔

مزاح میں جو خوشی متکلم اور مخاطب کو حاصل ہوتی ہے وہ ایک طبعی بات ہے پس اگر اس کی مزاحمت نہ کی جائے تو ضرور رفتہ رفتہ وہ حدِ اعتدال سے متجاوز ہو جاتا ہے اور تمسخر و استہزا بلکہ فحش و دشنام تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔

عرب کا بھی ایسا ہی حال ہوا جس وقت خدا تعالیٰ نے خاتم النبیینؐ کو مبعوث فرمایا۔ اس وقت یہ ذمیم خصلت ان میں حد سے زیادہ پھیلی ہوئی تھی انکے یہاں سب و شتم و قذف کا کچھ عیب نہ تھا، اُن کے مرد، مردوں اور عورتیں عورتوں سے تمسخر و استہزا کرتے تھے دو ایک دوسرے کو بُرے ناموں اور بُرے القاب سے یاد کرتے تھے۔ ان کے اشعار میں ہجو اور فحش کثرت سے ہوتا تھا۔ چنانچہ بہت سی حدیثیں صحاح میں ایسی موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مزاح، تمسخر، استہزا، سب، لعن، قذف، فحش، بذاءت، لمز اور تنابز بالالقاب ان کے ہاں شدت سے رائج تھا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک تعلیم سے جیسے کہ آگے ذکر کیا جائے گا، چند روز میں یہ تمام برائیاں نیست و نابود ہو گئیں اور صرف اس قدر مزاح باقی رہ گیا . . . . جو سوسائٹی کے لیے باعث زینت ہے۔

خلافت راشدہ کے زمانے میں بھی یہی حال رہا بلکہ جو لوگ صاحب ہیبت و وقار تھے وہ اس پسندیدہ مزاح کو بھی پسند نہ کرتے تھے۔ چنانچہ ایک بار حضرت عمر فاروقؓ کے سامنے چند صحابہ کے نام لیے گئے جو اس وقت خلافت کے لائق سمجھے جاتے تھے، انھوں نے ہر ایک کی نسبت کچھ کچھ اعتراض کئے اور حضرت علیؓ کے نام پر یہ کہا کہ ھو رجل کثیر الدعابۃ یعنی ان کے مزاج میں مزاح بہت ہے۔ جب خلافت راشدہ کا زمانہ گذر گیا اور جب اسلام میں شخصی سلطنت کی بنیاد پڑی .... اور وہ وقت آیا جس کی نسبت مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے ثم یصیر ملکا عضوضاً کہا تھا تو جب تمام طبقات انام کو ایک خاص شخص کی مرضی اور رائے کا تابع ہونا پڑا فقیہوں نے خلفأ کے جذبات نفسانی پورے کرنے کے لئے شرعی حیلے تراشنے شروع کئے۔ شعرا کو فاسق و فاجر بادشاہوں کی مدح میں قصائد عزا انشا کرنے پڑے۔ مشیر اور ندیم بجائے مشورہ اور صلاح نیک کے لطائف و مضحکات سے اُن کے دل لبھانے لگے۔ چونکہ مزاح اور ظرافت عرب کے خمیر میں تھی۔ گو وہ نبی برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے ایک مدت تک اس کو بھولے رہے، لیکن جب زمانے کی حالت خود اس کی محرک ہوئی تو پھر اپنی اصلی خاصیت پر آ گئے، تاہم بنی اُمیہ کے عہد میں بہ سبب قرب عہد رسالت کے مزاح اور ظرافت محدود رہی۔

بنی عباسیہ کے زمانے میں مزاح نے خوب رونق پائی۔ بذلہ سنج مصاحبوں کی جماعت بھی سامان عیش و نشاط کا ایک جزو اعظم قرار پائی۔ لبغیران کے شبستان خلافت سونا سمجھا جاتا تھا۔ سفر اور حضر میں مصاحب اور ندیم خلیفہ کے ہمراہ رہتے تھے۔ پھر جس قدر ان کی فتوحات بڑھتی گئیں یہ رنگ بھی ان کے ساتھ پھیلتا گیا، مگر امویہ اور عباسیہ کے اخیر زمانے تک ظاہرا فحش اور ہزل نے مسلمانوں میں چنداں رواج نہ پایا۔

البتہ ایران میں جا کر بعض اسباب ایسے جمع ہوئے کہ مزاح حد اعتدال سے بہت بڑھ گیا۔ چنانچہ سعدی[1] شیرازی کے مطائبات اور انوری دشتغانی[2] کے اہاجی و ہزلیات اور سب سے

---

[1] شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی۔ اعلیٰ پایہ کے شاعر مدرسہ نظامیہ بغداد کے طالبعلم ابن جوزی کے شاگرد (باقی اگلے صفحہ پر)

زیادہ فارسی مصطلحات کی کتابیں اس کی گواہ ہیں۔ وہاں ہنسی اور چہل اس درجہ کو پہنچ گئی تھی کہ اصحابِ فضیلت اس کی مشق بہم پہنچاتے تھے تاکہ اس کے ذریعے سے تقربِ سلطانی حاصل کریں۔ وہاں فحش اور ہزل کا نام "مطائبہ" رکھا گیا۔ چنانچہ "مطائبات سعدی" مشہور ہیں۔ وہاں لفظ ظرافت جس کے معنی عربی میں زیرکی اور دانائی کے ہیں، ہنسی اور چہل کے معنی میں مستعمل ہونے لگا تھا (جیسا کہ آج ہندوستان میں بھی مستعمل ہے) یعنی وہی لوگ بڑے لائق وفائق سمجھے جاتے تھے جو ہنسی اور چہل میں کمال رکھتے تھے۔ یہی رنگ "پٹھانیہ" کے عہد میں فارسی زبان کے ساتھ ایران سے ہندوستان میں آیا۔

اگرچہ اسلام کی سلطنت شخصیہ میں بھی بہت سے بادشاہ جن کو مہمات سے فرصت کم ملی، یا جن کے مزاج میں قدرتی ہیبت اور وقار تھا، نہایت سنجیدہ گزرے ہیں جن کے دربار میں کسی کو بیہودہ گوئی کی مجال نہ تھی، مگر اکثر ان کے برخلاف تھے، خصوصاً وہ جن کا ملک کئی کئی پشت سے خارجی حملوں سے محفوظ تھا اور نہایت اطمینان کے ساتھ عیش و عشرت

بقیہ نوٹ صفحہ ۱۱۹ سے آگے

اور شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے مرید تھے، اپنی آنکھوں سے بڑے بڑے انقلابات دیکھے اور ان سے بے انتہا متاثر ہوئے۔ بغداد انھیں کے سامنے تباہ ہوا۔ عمر کا بڑا حصہ ایشیا اور افریقہ کی سیاحت میں گذرا۔ پا پیادہ ۱۴ مرتبہ حج کئے۔ فارسی غزل کے پیغمبر اور یورپ میں مشرق کے شیکسپیر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ گلستاں بوستاں کی تصنیف نے ان کے نام کو غیر فانی بنا دیا ہے، جن کے سیکڑوں ترجمے دنیا کی مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ ۶۰۶ھ (۱۱۷۵ء) میں پیدا ہوئے اور ۶۹۱ھ (۱۲۹۳ء) میں وفات پائی۔

۲؎ شفائی۔ شمس الدین حسین ابن حکیم ملا شفائی، اصفہان کا رہنے والا تھا۔ تھوڑی عمر میں بہت سے علوم حاصل کر لیے اور فلسفے میں خاص دستگاہ رکھتا تھا۔ مدت تک طبابت کرتا رہا چنانچہ اس کی قرابادین اب تک مشہور ہے۔ شاہ عباس کی بہت تعظیم کرتا تھا۔ ہجو گوئی اس کی طبیعت پر زیادہ غالب تھی لیکن آخر عمر میں اس لغو گوئی سے توبہ کر لی تھی۔ اس کی وفات ماہ رمضان ۱۰۳۷ھ میں واقع ہوئی۔ اس کی تصنیفات میں سے مثنوی دیدۂ بیدار، نمکدان حقیقت، مہر و محبت اور ایک دیوان موجود ہے۔

میں زندگی بسر کرتے تھے۔

انسانی نسلوں کی قدیم سے یہ خاصیت رہی ہے کہ جن کو دولت یا سلطنت وراثتاً بغیر سعی و کوشش کے ہاتھ لگی ہے اور بغیر کسی مزاحمت کے وہ اپنی حالت پر چھوڑ دیئے گئے ہیں انھوں نے کبھی اس عطیۂ غیبی کی کچھ قدر نہیں کی۔ وہ اس کی نگہداشت اور محافظت سے غافل ہو کر عیش و عشرت میں ایسے منہمک ہوئے کہ دنیا و مافیہا کو فراموش کر دیا جب وہ عیش کرتے کرتے تھک جاتے ہیں تو اس میں کوئی نئی اختراع کرنی چاہتے ہیں اور جب اس نئی اختراع سے بھی طبیعت سیر ہو جاتی ہے تو اسے اور آگے بڑھانا چاہتے اب ان کی حالت چوپاؤں اور جانوروں سے بھی بدتر ہو جاتی ہے اور ان کے تمام فضائل مبدل بہ رذائل ہو جاتے ہیں۔

ان کی جرأت بے حیائی ہو جاتی ہے۔ ان کی سخاوت اسراف ہو جاتی ہے تو ملک کے خاص و عام کو وہی روپ بھرنا پڑتا ہے جو ان کے درخور مزاج ہو۔ خصوصاً وہ فرقہ جو مذہب و ملت کی رو سے بادشاہ کا ہم قوم ہوتا ہے اور جس کو بہ نسبت اور قوموں کے تقرب اور حضوری کا زیادہ موقع ملتا ہے یا زیادہ اُمید ہوتی ہے اس کو دربارداری اور مصاحبت کی وہ تمام لیاقتیں پورے اور اکمل طور پر حاصل کرنی پڑتی ہیں جو بادشاہ کے نزدیک لیاقتیں سمجھی جاتی ہیں۔

اگر بادشاہ کو گانے بجانے کا شوق ہے تو ہزاروں بھلے مانس گانا بجانا سیکھتے ہیں۔

اگر اس کی طبیعت حُسن پرستی اور ہوا و ہوس کی طرف مائل ہے تو ہزاروں اہلِ علم غزل، واسوخت اور مثنوی لکھنے میں کمال بہم پہنچاتے ہیں۔

اگر وہ خود پسند اور خوشامد پسند ہے تو شعرا کو بھانڈ بننا پڑتا ہے اور قصیدہ گوئی میں ید طولیٰ حاصل کرتے ہیں۔

اگر اس کو ہنسی اور چہل سے رغبت ہے تو ہزاروں سنجیدہ اور متین آدمی مسخرہ پن اختیار کرتے ہیں۔

یہی حال "خاندانِ چغتائیہ" کے آخری دور میں ہوا۔

لہ خاندانِ چغتائیہ۔ اس خاندان نے ماوراء النہر کاشغر، بلخ، بدخشاں، غزنی (باقی اگلے صفحہ پر)

ہنسی اور ٹھٹھول کی چشم بد دور اد پر ہی سے بنیاد جمتی چلی آتی تھی، یہاں تک کہ عالمگیر[۱] جیسے روکھے اور متشرع بادشاہ کے دربار میں بھی نعمت[۲] خاں جیسا ظریف اور بذلہ سنج موجود تھا مگر محمد شاہ[۳] کے عہد میں ظرافت یہاں تک بڑھی کہ منجر بہ تمسخر و استہزا ہوگئی۔ بادشاہ ملک کا انتظام اوروں پر چھوڑ کر آپ ہمہ تن عیش و عشرت میں مشغول ہوگیا اور اس کو ناچ رنگ شراب کباب کے سوا کوئی شغل نہ رہا۔ تمام اعیان سلطنت بادشاہ عہد کی طبیعت کا میلان دیکھ کر اسی رنگ میں رنگے گئے۔ امیروں میں باہم نوک جھونک ہونے لگی۔ مردوں میں نواب امیر[۴] خاں

بقیہ نوٹ ص ۱۲۲ سے آگے

وغیرہ پر ۱۲۲۷ھ (۱۲۲۷ء) سے ۱۳۷۰ھ (۱۳۷۰ء) تک ۱۴۷ سال حکومت کی۔ اس خاندان کا بانی چنگیز خاں کا بیٹا چغتائی تھا۔

[۱] محی الدین اورنگ زیب عالمگیر ہندوستان کے زبردست شہنشاہوں میں سے تھا۔ سلطنت مغلیہ کو جتنا عروج اس کے وقت میں ہوا، اتنا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا اور اس کے بعد تو انحطاط شروع ہوگیا۔ نہایت ذہین و بیدار، متشرع، سخت محنتی، جفاکش، منتظم، منصف مزاج، عادل اور بارعب شہنشاہ تھا۔ ۱۰۶۸ھ (۱۶۵۷ء) میں تخت دہلی پر متمکن ہوا، اور ۱۱۱۸ھ (۱۷۰۷ء) میں انتقال کیا۔

[۲] نعمت خاں - مرزا محمد نام، عالی تخلص اور نعمت خاں خطاب تھا۔ شیراز سے آکر عالمگیر کا داروغہ مطبخ اور صرف خاص کا دیوان مقرر ہوا۔ ۱۱۲۰ھ (۱۷۰۸ء) میں وفات پائی۔ وقائع نعمت خانِ عالی اس کی مشہور کتاب ہے۔

[۳] محمد شاہ خاندان مغلیہ کے دورِ انحطاط کے بدقسمت بادشاہوں میں تھا۔ اسی کے عہد میں نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا۔ ۱۷۱۹ء میں تخت پر بیٹھا اور ۱۷۴۸ء میں مرگیا۔

[۴] امیر خاں - عمدۃ الملک خطاب تھا اور محمد شاہ کے خاص الخاص مقربین میں سے تھا۔ الٰہ آباد کا صوبہ دار مقرر کیا گیا، مگر تھوڑے عرصے کے بعد واپس بلا لیا گیا، کیونکہ بادشاہ اس کو اپنے سے جدا کرنا پسند نہ کرتا تھا۔ نہایت حاضر جواب اور بیباک تھا۔ اس کی بے باکی آخر رنگ لائی۔ جب بادشاہ کے حضور میں بے باکی اور گستاخی سے پیش آنے لگا تو ایک روز ناخوش ہوکر بادشاہ نے ایک شخص کو اشارہ کیا اور اس نے ۲۶ دسمبر ۱۷۴۶ء کو ایک خنجر سے اس کا کام تمام کردیا۔

اور عورتوں میں نور بائی[1] ایک ایک پر پھبتیاں کہتے تھے۔ یہاں تک کہ برہان الملک[2] اور آصف جاہ[3] جیسے سنجیدہ آدمیوں پر بھی ان کے وار چلتے تھے اور ان کو بھی کبھی کبھی اپنی وضع کے خلاف جواب دینا پڑتا تھا۔

یہ رنگ رفتہ رفتہ خاص و عام میں پھیل گیا اور تمام امرا کی مجلسوں میں مسخرہ پن ہونے لگا اور اس طرح محمد شاہ رنگیلے کی بدولت تمسخر اور استہزا اعلیٰ سے ادنیٰ تک تمام طبقوں میں پھیل گیا۔ پھر جب نواب سعادت علی خاں کے ساتھ دہلی کی زبان لکھنؤ میں گئی تو زبان کے ساتھ ہی ساتھ یہ رنگ بھی وہاں پہنچا اور لکھنؤ میں اس نے اور بھی ترقی پائی۔ وہاں کے اکثر کارفرما ایسے ہوئے جو تعیش و کامرانی میں محمد شاہ پر بھی سبقت لے گئے۔ ان کے ہاں بھی مسخرہ پن کا بازار خوب گرم رہا۔ یہاں تک نواب سعادت علی خاں ثانی[4] جیسے مدبر اور ہوشمند کو بھی سید انشاء اللہ خاں[5] بغیر چین نہ آتا تھا۔

---

[1] نور بائی۔ دربار محمد شاہ کی مشہور طوائف . . . . . . نادر شاہ اس کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا، مگر قسمت تھی کہ بچ گئی۔

[2] برہان الملک۔ اصلی نام محمد امین عرف سعادت خاں تھا۔ خراسان کے تاجروں میں سے تھا۔ محمد شاہ کے زمانے میں ہندوستان آیا اور اودھ کی صوبے داری پر فائز ہوا۔ ۱۷۳۹ء مطابق (۱۱۵۲ھ) میں وفات پائی۔ اودھ کے نواب اسی کی اولاد میں سے تھے۔

[3] آصف جاہ۔ فرمانروایان حیدرآباد کے مورث اعلیٰ اور دربار مغلیہ کے زبردست امرا میں سے تھے محمد شاہ کے وقت میں حیدرآباد کے صوبے دار مقرر ہوئے ۳۰ برس تک نہایت کامیابی کے ساتھ صوبہ دکن میں حکومت کی۔ ۱۱۶۱ھ (۱۷۴۸ء) میں وفات پائی۔

[4] سعادت علی خاں ثانی وزیر علی بن آصف الدولہ کے بعد ۲۱ جنوری ۱۷۹۸ء کو اودھ کے تخت پر بیٹھا۔ ۱۷ برس حکومت کرنے کے بعد ۱۱ جنوری ۱۸۱۴ء کو فوت ہو گیا۔

[5] سید انشاء اللہ خاں، میر ماشاء اللہ خاں کے بیٹے اعلیٰ درجہ کے ظریف الطبع شاعر تھے 'دریائے لطافت' ان کی مشہور کتاب ہے بمقام لکھنؤ ۱۲۳۲ھ (۱۸۱۷ء) میں وفات پائی۔

چونکہ مزاج اور زبان جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے لازم و ملزوم ہیں اور ظاہر ہے کہ دہلی اور لکھنؤ کو زبان اُردو کے لحاظ سے تمام ہندوستان پر ترجیح حاصل ہے اس لیے یہ دونوں شہر ہنسی اور چہل کے لحاظ سے بھی اور شہروں سے بالاتر رہے ہیں۔

ان تمام خرابیوں پر بھی جب تک مسلمانوں میں تھوڑی بہت تعلیم و تربیت رہی تب تک تمسخر و استہزا نے ایک حدِ معین سے تجاوز نہیں کیا اور شرفا اور خواص کی مجالس میں زیادہ تر بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی ہی پر قناعت رہی، مگر جب تک نکبت اور ادبار کی گھٹا چاروں طرف چھا گئی اور بے علمی اور جہالت کا بازار گرم ہوا تو شریف زادوں کو وہ صحبتیں ملنے لگیں جہاں گالی گلوچ، دھول دھپا اور جوتی پیزار ہی کا نام دل لگی تھا۔ رفتہ رفتہ یہ لچپن اور بیہیائی ادنیٰ سے اعلیٰ تک تمام خاندانوں میں وبائے عام کی طرح پھیل گئی اور اُس کی بُرائی کا خیال کم ہوتے ہوتے تقریباً تمام قوم کے دل سے بالکل جاتا رہا۔ پہلے ساری مجلس میں ایک آدھ بذلہ سنج ہوتا تھا کیونکہ اس وقت بذلہ سنجی کے لیے ذہانت اور جودتِ طبع کے علاوہ کسی قدر علم و فضل بھی درکار تھا۔ چنانچہ محمد شاہ کے دربار میں صرف نواب امیر خاں ہی ایک ایسا شخص تھا جو اس خدمت سے عہدہ برآ ہوتا تھا

مگر اب ہر مجلس میں ایک کثیر مجمع ظریفوں کا ہوتا ہے۔ کیونکہ اب بات بات میں محل بے محل فحش اور ہزل بکنا ہی داخلِ ظرافت سمجھا جاتا ہے اور اعلیٰ درجے کی ظرافت چند باتوں پر منحصر ہے مثلاً:

کوئی ایسا فحش بکنا جو حضارِ مجلس نے پہلے کم سنا ہو۔ فحش کی بھری ہوئی واہی تباہی نقلیں بیان کرنی۔ کوئی ایسا لفظ بولنا جس کے سننے سے شرم آئے، کوئی ایسی حرکت کرنی جسے دیکھ کر ہنسی آئے۔ کسی دوست کے جھوٹے سچے عیب ظاہر کرنے، کوئی ایسی بات کہنی جس سے مجلس میں بیٹھے ہوئے آدمیوں سے کسی ایک کا دل دُکھے اور باقی سب . . . . لوگ ہنسیں۔ کسی نئے آدمی پر جس سے شناسائی نہ ہو پھبتی کہنی، کسی کی صورت دیکھ کر خواہی نخواہی قہقہہ لگانا، کسی مقدس آدمی کو جس کا نام ہمیشہ تعظیم سے لیا جاتا ہو گالی سے یاد کرنا، کوئی ایسی خبر اُڑانی جسے سن کر سب کو رنج ہو، کوئی ایسی عجیب روایت کرنی جو عادتاً . . . . محال ہو۔ غرض ہنسنے ہنسانے دل دُکھانے یا بے حیائی کا نام "ظرافت" رکھا گیا ہے چونکہ غریب اور

محنتی آدمیوں کو دو چار گھڑی ہنسنے بولنے کی مہلت بہت کم ملتی ہے۔ اس سبب سے فحش و دشنام اور بیہودہ باتیں زیادہ تر آسودہ اور مرفہ الحال لوگوں میں سنی اور دیکھی جاتی ہیں۔

اس ذمیم خصلت کی بدولت اردو زبان نے جو کہ خاص مسلمانوں کی زبان کہلاتی جاتی ہے، بہت کچھ وسعت پیدا کر لی ہے۔ غالباً دنیا میں کوئی زبان ایسی نہ ہوگی جس میں ہماری زبان کی برابر گالیاں، فحش اور بے شرمی کے الفاظ اور محاورات بھرے ہوں۔

ایک فاضل انگریز نے انھیں دنوں میں اردو زبان کی ایک ڈکشنری انگریزی میں لکھی ہے جس پر انگریزی اخبار نویسوں نے یہ اعتراض کیا تھا کہ اس ڈکشنری کو فوربس اور شیکسپیئر پر اس کے سوا کوئی ترجیح نہیں ہے کہ اس میں ہزاروں گالیاں اور فحش محاورے ایسے ہیں جو ان میں نہیں ہیں۔ لیکن مصنف نے ایک مختصر جواب دے کر سب کو ساکت کر دیا۔ اس نے کہا:

"فوربس اور شیکسپیئر صرف لغاتِ اردو کی ڈکشنریاں ہیں اور ہماری کتاب لغاتِ اردو کے سوا ہندوستانیوں کی طبیعت کا بھی آئینہ ہے جس میں انکے اخلاق اور جذبات نہایت عمدہ طور پر نظر آتے ہیں۔"

اگرچہ مصنف نے اس مقام پر "ہندوستانیوں" کا عام لفظ لکھا ہے مگر حقیقت میں اس کتاب سے زیادہ مسلمانوں ہی کے اخلاق ظاہر ہوتے ہیں۔ کیونکہ جہاں تک ہم کو معلوم ہے اس میں فحش اور بے حیائی کے وہی الفاظ ہیں جو مسلمانوں کی بول چال سے مخصوص ہیں اور خاص انہیں کی سوسائٹی میں وضع ہوئے۔

افسوس ہے کہ یہ ذمیم خصلت اب اس درجہ کو پہنچ گئی ہے کہ واعظ جو اپنی مجلس وعظ کو گرم کرنا چاہے اس کو ضرور ہے کہ آیتوں اور حدیثوں کے ضمن میں کچھ تمسخر کی چاشنی بھی دیتا رہے۔

اخبار کا مالک جو اپنے پرچے کو رونق دینی چاہے اس کے سوا چارہ کار نہیں کہ اپنے اخبار کو "پنچ" بنائے۔

مصنف جو کوئی کتاب لکھ کر اس کے حقِ تصنیف سے فائدہ اٹھانا چاہے اس کا فرض ہے کہ اپنی کتاب کی بنیاد ہنسی اور ٹھٹھول پر رکھے۔

شاعر جو مشاعرہ کو گرم کرنا چاہے اس کی تدبیر یہی ہے کہ فحش اور ہزل سے اس کی غزل کا کوئی مصرعہ خالی نہ ہو۔

اہلِ مناظرہ کی بڑی فتحیابی یہ ہے کہ ان کی تحریر میں اعتراض اور جواب کی جگہ فریقِ مخالف پر نری پھبتیاں اور آوازے توازے ہوں۔

دُنیا کی تمام قوموں کی تفریق مذہب و ملّت کے لحاظ سے کی گئی ہے۔ جیسے ہندو مسلمان پارسی۔ یہودی اور عیسائی، پس جو اچھی یا بُری خصلت کسی خاص قوم کے ساتھ مخصوص ہو جاتی ہے اُس سے یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ اس قوم کی مذہبی تعلیم کا مقتضا یہی ہوگا۔ اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ جو قوم خوش نصیبی سے کسی نیک خصلت میں ضرب المثل ہو جاتی ہے، وہ نہ صرف اپنی قوم کو، بلکہ اپنے مذہب کو بھی نیک نام کرتی ہے اور جو قوم بدنصیبی سے کسی بُری خصلت میں انگشت نما ہو جاتی ہے وہ نہ صرف اپنی قوم کو، بلکہ اپنے مذہب کو بھی بدنام کرتی ہے۔

اسلام نے انسان کی تہذیب اور اصلاح میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اس نے مزاح کو صرف وہیں تک جائز رکھا ہے جس سے خوشی حاصل ہو اور اخلاق پر بُرا اثر نہ پڑتا ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "میں بھی مزاح کرتا ہوں مگر کوئی بات بے جا نہیں کہتا۔" آپؐ خود بھی کبھی کبھی مزاح فرماتے تھے اور اگر کوئی دوسرا شخص کوئی لطیف مزاح کرتا تھا تو مسکرا کر خاموش ہو جاتے تھے لیکن ہر وقت یا بہت مزاح کرنے کو ناپسند کرتے تھے اور تمسخر اور استہزا کی سخت ممانعت کرتے تھے۔ یعنی کسی کی حقارت یا پردہ دری کرنی جس پر لوگ ہنسیں یا کسی کی نقل اُتارنی یا کوئی اور ایسی بات کرنی جس سے دوسرا شخص ذلیل ہو اور فحش اور سب و لعن کو نہایت مبغوض سمجھتے تھے، یہاں تک کہ بتوں کو بھی سب کرنے سے منع فرماتے تھے۔ ایک بار چند آدمی کفار کے اُن مقتولوں کو جو بدر میں مارے گئے تھے بُرائی سے یاد کر رہے تھے۔ آپ سُن کر ناراض ہوئے اور ان کو سخت ممانعت کی۔ آپؐ نے فرمایا کہ طعن کرنے والا لعنت کرنے والا فحش بکنے والا اور بیہودہ گو مومن نہیں ہے۔

آپؐ کی ممانعت کا طریقہ ایسا موثر تھا کہ جس کو ایک مرتبہ نصیحت کی وہ ساری عمر کے لیے اُس بُرائی سے باز آ گیا۔ کتبِ احادیث میں اکثر مثالیں ایسے لوگوں کی موجود ہیں جنھوں نے صرف آپؐ کی ایک بار کی ممانعت پر تمام عمر فحش وغیرہ زبان سے نہیں نکالا۔ مثلاً ایک مرتبہ آپؐ نے فرمایا کہ اُپنے ماں باپ کو گالی دینا گناہِ عظیم ہے" لوگوں نے عرض کیا کہ "حضرتؐ ایسا کون ہوگا جو

اپنے ماں باپ کو گالیاں دیتا ہوگا" فرمایا جو شخص کسی کو ماں باپ کی گالی دے کر اس سے اپنے ماں باپ کو گالیاں دلواتا ہے حقیقت میں وہی ان کو گالیاں دینے والا ہے۔"

اسلام کی یہ تعلیم عرب میں اس قدر پھیلی کہ فحش اور بے شرمی کی باتیں وہاں سے گویا بالکل مفقود ہو گئیں۔ قرآن میں ایسی چیزوں کے بیان میں جن کے نام لینے سے نفرت یا شرم آتی ہے مجاز اور کنایہ برتا گیا۔ مثلاً جائے ضرور کے لیے غائط کا لفظ بولا گیا ہے جس کے معنی گڑھے یا نشیب کی زمین کے ہیں، یہاں عرب حاجت ضروری کے لیے جایا کرتے تھے یا مثلاً ہم بستری کے لیے ملامست، مَس اور اتیان وغیرہ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جن کے معنی چھونے یا آنے وغیرہ کے ہیں۔

عرب کے لیے جو کہ لطف زبان اور استعارہ و کنایہ پر جان دیتے تھے، یہ ایک نہایت عمدہ تعلیم تھی۔ چنانچہ اسی بنا پر اُن کے یہاں صدہا استعارے ایسے لفظوں کی جگہ مستعمل ہونے لگے، جیسے وقاع کے لیے لمس، مسیس، مَس، دخول، صحبت وغیرہ اور بول و براز کے لیے قضائے حاجت، التوضؤ، تبرز وغیرہ۔ اور عورتوں کے لیے فی الحجرہ، من وراء الستر، ام الاولاد وغیرہ۔ اس قسم کی تہذیب عرب میں ایسی پھیلی تھی کہ جتنا بدن کپڑوں سے اکثر ڈھکا رہتا ہے اس کا نام لینا خلاف شرم حیا سمجھا جاتا تھا۔

ایک بار خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کی بغل میں کچھ نکلا تھا۔ لوگ اُن کی عیادت کو گئے اور پوچھا "من این خرج"۔ خلیفہ نے جواب میں صاف طور پر بغل کا نام نہ لیا، بلکہ یہ کہا "خرج من باطن الید"۔

مزاح و ظرافت بھی عرب میں خلفائے امویہ کے عہد تک بہت کم رہی، لوگ اس وقت اپنی اولاد کو مزاح سے بھی ایسا ہی منع کرتے تھے جیسے اور برائیوں سے۔

بہر حال اسلام نے اس باب میں ہدایات وارشاد کا پورا پورا حق ادا کر دیا تھا اور ایک ایسی قوم سے جن کی سرشت میں ظرافت اور مزاح پیدا کیا گیا تھا، اس کو گویا بالکل نیست و نابود کر دیا تھا لیکن بدنصیبی سے وقتاً فوقتاً ایسے اسباب جمع ہوئے کہ یہ خصلت مسلمانوں میں بڑھتے بڑھتے انتہا کے درجے کو پہنچ گئی اور جس قوم کو نبی برحق نے اس سے ہمیشہ کے لیے پاک کرنا چاہا تھا وہ داغ بدنامی بن کر ہمیشہ کے لیے ان کی پیشانی پر لکھی گئی اور پورا ہوا وہ جو کلام الٰہی میں ارشاد ہوا تھا کہ اِنَّکَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ۔ یعنی اے نبی تو اپنے پیاروں کو ہدایت نہیں کر سکتا، بلکہ خدا جس کو چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔

یورپ کی قوموں نے جس طرح اور تمام اخلاقی برائیوں کی اصلاح کی ہے۔ اسی طرح انھوں نے اس برائی کو بھی مٹایا ہے۔ اُن کے ہاں فحش اور ہزل اس طرح مفقود ہوا ہے کہ لغت کی کتابوں میں اس کا پتہ نہیں لگتا۔ انھوں نے مشرقی کتابوں کے ترجمے جو اپنی زبانوں میں کئے ہیں، ان میں جہاں فحش اور ہزل کا موقع آگیا، وہاں اس مطلب کو ایسے لطیف پیرایہ میں ڈھال کر لکھا ہے جس میں فحش باقی نہ رہے اور مدعا بخوبی ادا ہو جائے۔ ان کی مجلسوں میں یا ان کی تحریروں میں اگر مزاح کی باتیں ہوتی ہیں تو اس قدر لطیف اور دقیق ہوتی ہیں کہ ہم لوگ اس کو مشکل سے مزاح کہہ سکتے ہیں۔ جنگ روم و روس کے آغاز میں ایک نہایت لطیف مطائبہ وزیر ہند اور اُن کی لیڈی کا کسی اخبار میں نقل کیا گیا تھا اُس کو سن کر ہمارے ایک مسلمان دوست نہایت متعجب ہوئے اور فرمانے لگے کہ اس میں کون سی بات ظرافت کی ہے۔

اُن کی ہنسی اور چہل کا سب سے بڑا مجموعہ پنچ اخبار ہوتے ہیں جن میں وہ حد سے زیادہ ظرافت خرچ کرتے ہیں۔ مگر ان کی ظرافت ہمیشہ کسی نہ کسی غرض پر مبنی ہوتی ہے۔ نری ظرافت ہی نہیں ہوتی۔ مثلاً کسی قانون کی اصلاح ہو، گورنمنٹ کی کوئی غلط پالیسی بدل جائے، کسی باب میں قوم کو غیرت دلائی جائے۔

ایسی ظرافت ہمارے نزدیک عین حکمت ہے اور ہماری قوم کے بعض ریفارمر جو کبھی کبھی مزاح کے پیرایہ میں کوئی مضمون لکھتے ہیں گو یا وہ بالفعل ناعاقبت اندیشوں کو ناگوار گزرتے ہیں۔ لیکن بہت جلد وہ زمانہ آنے والا ہے کہ ان کی تعظیم کی جائے گی اور اُن کے دلدوز فقرے اور دل شکن طعنے شفیق اُستاد کی زدوکوب سے زیادہ قدر کے لائق سمجھے جائیں گے۔

۱۰۔ مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ

(از علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ بابت ۱۸۷۹ء صفحہ ۱۲۳۶)

ان دنوں حُسنِ اتفاق سے ہم کو علی گڑھ جانے کا موقع ملا ہم خوش قسمتی سے وہاں ایسی جگہ ٹھیرے تھے جہاں سے مدرستہ العلوم کا احاطہ بہت قریب تھا اور یہ پہلا ہی موقع مدرستہ العلوم کو دیکھنے کا ملا تھا۔

اگرچہ تعطیل کے سبب مدرسہ بند تھا اور بیماری کی وجہ سے طلبا کی حاضری بھی کم تھی مگر جس قدر مدرسہ کی حالت ہماری آنکھوں کے سامنے تھی، اُس سے جو اثر ہمارے دل پر پیدا ہوا ہے اس کو ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ ہم بڑے بڑے مقدس واعظوں کی مجالس وعظ میں حاضر ہوئے ہیں۔ ہم نے اونچے اونچے ممبروں پر نہایت فصیح و بلیغ خطبے بھی سنے ہیں۔ ہم حال و قال کی مجلسوں میں شریک ہوئے ہیں۔ ہم نے پیرانِ طریقت کے گرد مریدوں اور طالب علموں کے حلقے بھی دیکھے ہیں اور ان کے دل ہلا دینے والے نعرے بھی سنے ہیں۔ مگر ہم سچ کہتے ہیں کہ جو قومی مسرت اور اسلامی حمیت اس مدرسہ کو دیکھ کر خود بخود جوش میں آتی ہے، وہ کسی دوسری جگہ آج تک نہیں دیکھی گئی۔ بلاتشبیہ جو شعر نظیری نیشاپوری[1] نے بیت اللہ کی زیارت کے وقت پڑھا تھا وہ اس مدرسہ کو دیکھ کر ہمیں یاد آیا اور بہت دیر تک ہم اس کو اپنے دل ہی دل میں پڑھ کر گنگناتے رہے ؎

این کعبہ را بنا نہ باطل نہادہ اند صد معنی و جمال دریں گل نہادہ اند

اس کالج کی ادھوری بنویں، اُس کے اسکول کے نامرتب کمرے، اس کے بورڈنگ ہوس کے ناتمام سین، اُس کے احاطہ کی چند سنگین جالیاں جو قوم کی بے پروائی کی وجہ سے اب تک نامکمل

---

[1] نظیری کا نام محمد حسین تھا۔ فارسی کا مسلم الثبوت شاعر گزرا ہے۔ اکبر کے زمانے میں نیشاپور سے ہندوستان آیا اور عبدالرحیم خان خاناں کے ہاں ملازم ہوا۔ بمقام احمدآباد ۱۰۲۲ھ (۱۶۱۳ء) میں انتقال کیا۔

نظر آتی ہیں، ہمارے دل میں تاج گنج کے روضہ اور اکبر[1] کے مقبرے سے زیادہ عظمت و شوکت رکھتی ہیں کیونکہ ان سے قوم کو کچھ نہ کچھ اُس وقت فائدہ پہنچنے کی امید تھی اور نہ اب ہے اور نہ اُن سب کی بنیاد محض قوم کی بہبودی اور عزت کی امید پہ رکھی گئی تھی۔

اس کے چمن اور کیاریوں کے خاکے اور ان کی روشوں کی حد بندی، اس کی سڑکوں کی داغ بیل اُس کے گرد چھوٹے چھوٹے پودوں کی باڑ، اس کی اونچی نیچی زمین اور گھانس اور اس کی مٹی ہم کو لاہور کے شالا مار باغ[2] اور لکھنؤ کے قیصر باغ[3] سے زیادہ دل کش اور دلکشا معلوم ہوتی ہے، کیونکہ وہ باغات صرف ایک ایک شخص کے دل کے ارمان نکالنے کے لیے بنائے گئے تھے اور یہ مدرسہ اس لیے بنایا جا رہا ہے کہ تمام قوم کے ارمان اس سے نکلیں۔ اگرچہ اس کے مکانات کی تعمیر میں ابھی بہت کچھ باقی ہے لیکن جس قدر کام ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے اُس سے ہم کو کامیابی کا نہایت پختہ یقین ہوتا ہے۔

جس طرح قادر ذوالجلال نے بنی نوعِ انسان پر نئی دنیا ظاہر کرنے کے لیے اور اپنی قدرت کے بے انتہا خزانے کھولنے کے لیے جنیوا[4] میں کلمبس[5] کو پیدا کیا تھا اور اپنی پرزور دلیلوں اور زبردست حجتوں سے ملکہ ہسپانیہ کے تمام دربار پر غالب آیا تھا اسی طرح اُس

---

[1] مقبرہ اکبر یہ مقبرہ آگرے سے چار پانچ میل کے فاصلہ پر ضلع سکندرہ میں بنا ہوا ہے۔ مقبرہ کی دو منزلہ عمارت سنگ سُرخ کی بنی ہوئی ہے جس میں جابجا سنگ مرمر اور سنگ موسیٰ بھی استعمال کیا گیا ہے۔

[2] شالا مار باغ ـ لاہور سے مشرق کی طرف تین میل پر موضع باغبان پورہ کے قریب ہے۔ دُور دُور سے لوگ دیکھنے آتے ہیں اور لطف اُٹھاتے ہیں۔ باغ میں نہر کی موجودگی نے اس کی خوبصورتی اور دلفریبی کو دوبالا کر دیا ہے۔ اسے ۱۸۰۔۱ ایکڑ زمین پر شاہجہاں نے سنہ ۱۰۴۲ھ (۱۶۳۲ء) میں تعمیر کرایا تھا۔ خوبصورتی نفاست اور دل کشی کے لحاظ سے قابل دید ہے۔

[3] قیصر باغ ـ لکھنؤ کا قدیم عالی شان اور خوبصورت باغ ہے۔ اگرچہ شاہی زمانے میں نہایت عروج پر تھا مگر اب بھی خاصا پُر رونق ہے۔ وسط میں عالی شان سفید بارہ دری اور فصیل کے ساتھ ساتھ تین طرف بڑی بڑی دو منزل کی عمارتیں بنی ہوئی ہیں۔ (باقی آئندہ صفحہ پر)

نے ہماری بہبودی کے لیے ہندوستان میں ایک اولوالعزم اور عالی ہمت آدمی پیدا کیا ہے جو باوجود قوم کی سخت مخالفتوں اور مزاحمتوں کے آج تک اپنے ارادہ پر ثابت قدم ہے۔

ہم مدرستہ العلوم کے اس وسیع میدان میں عین دھوپ کے وقت ایک پیر مرد سفید ریش، نورانی صورت اور عالی دماغ آدمی کو باوجود کبرسن اور فربہی مفرط کے نہایت ذوق و شوق اور امنگ کے ساتھ دو دو گھنٹے پیادہ پا پھرتے دیکھ آئے ہیں اور اس کے سوا ہم نے رات اور دن اس اسی دھن میں سرگرم پایا ہے اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ خدا کو اس شخص سے یہ عظیم الشان کام لینا ہے۔ رئیسوں اور تعلق داروں کی بے پروائی اس کے ارادوں کو روک سکتی ہے اور نہ زید و عمر کی مخالفت اس کی ہمت کو توڑ سکتی ہے۔

خدا نے اپنا کام لینے کے لیے اس کو کچھ یار و مددگار بھی دیے ہیں جن میں سے بعض نے اپنا گھر بار چھوڑ کر علی گڑھ ہی میں بود و باش اختیار کر لی[لہ] ہے اور اکثر اپنے اپنے مقام پر دل و جان سے اعانت و امداد میں سرگرم ہیں۔

اگرچہ قوم کی پست ہمتی کے سبب ابھی کوئی مسجد اصل نقشے کے مطابق تیار نہیں ہوئی۔ لیکن عارضی طور پر چند روز کے لیے ایک خوبصورت پختہ چبوترہ نماز پڑھنے کے لیے بنا لیا گیا ہے۔ ہم نے بھی طالب علموں اور مدرسوں کے ساتھ ایک جماعت کی نماز وہاں پڑھی۔ اتفاق اور ہمدردی اور قومی محبت کے انوار و برکات جو کہ جمعہ و جماعت کے خاص مقاصد ہیں۔ اگر سچ پوچھیے تو ہم نے اسی چبوترہ اور اسی نماز میں دیکھے ہیں اور اسلام کی آئندہ شوکت کا اگر پتہ لگتا ہے تو ایسے ہی اجتماع سے لگتا ہے۔

بقیہ نوٹ ص ۱۳۱ سے آگے

۴۹ جنیوا (GENVA) اٹلی کا مشہور و معروف بندرگاہ ہے۔

۵۰ کلمبس (COLUMBUS) امریکہ کا ایک دریافت کنندہ اور یورپ کا ایک مشہور سیاح ہے ۱۴۳۶ء میں پیدا ہوا اور ۱۵۰۶ء میں انتقال کیا۔

لہ یہ اشارہ نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین کی طرف ہے جو اس زمانے میں محض طلبا کی نگرانی کے لیے بورڈنگ ہوس میں سکونت رکھتے تھے۔ (حالی)

ہم نے حیدرآباد اور مدراس کے کم صغیر سن لڑکے بھی یہاں پائے اور ان کو اس قدر خوش و خرم، مطمئن اور فارغ البال دیکھا کہ شاید اپنے پیارے ماں باپ کے پہلو میں بھی اس قدر خوش حال نہ ہوں گے۔

وہی اولوالعزم پیر مرد جس وقت اُن کے سر پر ماں باپ سے بھی زیادہ شفقت بھرا ہاتھ پھیرتا ہے اور ان کو چمکارتا ہے تو ان کے دل باغ باغ ہو جاتے ہیں، اور وہ اپنے کنبے اور اپنے دیس کو بالکل بھول جاتے ہیں۔

ہم نے جس نفاست اور صفائی اور تمیز کے ساتھ یہاں کے طالب علموں کو بورڈنگ ہاؤس میں رہتے دیکھا اور جس لطافت کے ساتھ ان کا دسترخوان چُنا ہوا پایا اور جس خاموشی، وقار اور متانت کے ساتھ ان کے کھانے کا طریقہ سُنا ہے ہم کو اُمید نہیں ہے کہ ہندوستانی امرا اور رؤسا اور علماء کی اولاد کو اس طرح رہنا اور کھانا پینا نصیب ہو سکے۔

یہاں کے طالب علموں نے کرکٹ میں بھی نہایت ترقی کی ہے اور علی گڑھ کے تمام جلیل القدر انگریز اور ان کی معزز لیڈیاں کرکٹ میں ان کے ساتھ شریک ہوتی ہیں اور سب اُن کے ساتھ مربیانہ اور دوستانہ برتاؤ برتتے ہیں۔

طالب علموں کے چال چلن اور ضبط اوقات اور لباس و طعام اور نماز پنجگانہ و دیگر امور کی نگرانی کے لیے نہایت دیانت دار مدبر اور ذی علم لوگ مقرر ہیں اور تعلیم سے زیادہ اُن کی تربیت میں کوشش اور اہتمام کیا جاتا ہے۔

الغرض ہندوستان میں جہاں تک ہم کو معلوم ہے کوئی عام تدبیر مسلمانوں کی عام دینی اور دُنیوی بہبودی کی اس وقت سے جبکہ مہلب[1] اور محمدؒ بن قاسم نے اس ملک میں قدم رکھا آج تک

---

[1] مہلب - حضرت معاویہؓ کے زمانے میں عبدالرحمٰن بن سمرہ والیِ سیستان کی فوج کا ایک نامور سردار تھا۔ یہ پہلا شخص ہے جس نے ۴۴ھ میں افغانستان کے مہیب پہاڑوں اور دشوار گزار اور سخت پیچیدہ گھاٹیوں کو عبور کر کے ہندوستان پر حملہ کیا اور ایک ہی تاخت میں کابل سے ملتان تک کے علاقہ کو آن کی آن میں فتح کر لیا بعد ازاں لاہور پر فوج کشی کر کے جملہ حملہ آوران کو شکست دی (بقیہ اگلے صفحہ پر)

نہیں کی گئی ۔

افسوس ہے کہ اس اندھی اور بے تمیز دُنیا میں ایسے عجیب و غریب کاموں کی قدر کبھی وقت پر نہیں ہوتی ۔ بلکہ ہمیشہ اُس وقت ہوتی ہے جب جواں مرد زمانے کی سختیاں جھیلتے جھیلتے اور یگانوں اور بیگانوں کے طعنے سنتے سنتے آخر ہو گئے ہیں ۔ سچ یہ ہے کہ باغ دنیا کی پود کبھی سرسبز نہ ہوتی ۔ اگر شہیدوں کے خون سے اس میں آبپاشی نہ کی جاتی اور ہر شخص اپنی محنت کا ثمرہ اور اپنی کوشش کی قدردانی اپنی زندگی میں چاہتا تو یہ کھیتی کبھی پروان نہ چڑھتی ۔

اے خدا! تو نے جن لوگوں کو بنی نوع کی بھلائی کے لئے پیدا کیا ہے ان کی عمر میں برکت دے اور اُن کی سعی کو مشکور کر، اور ان کی ہمت اور استقلال کو آخر تک قائم رکھ ۔ آمین

بقیہ نوٹ ص ۱۳۳

۲۷ محمد بن قاسم ثقفی ۔ اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان کے زمانے میں ولایت فارس کا گورنر اور حجاج بن یوسف ثقفی گورنر عراق کا ابن عم نیز داماد تھا ۔ بہت بڑا شجاع اور اعلیٰ درجے کا سپہ سالار تھا ۔ خلیفہ کی اجازت اور حجاج کے حکم سے ۹۳ھ میں جب کہ اس کی عمر صرف پندرہ سال کی تھی سندھ پر حملہ کیا اور اپنی عدیم النظیر شجاعت سے تھوڑے ہی عرصے میں تمام سندھ کو فتح کر کے مسلمانوں کی حکومت کی بنیاد ڈال دی ۔ ابھی اس کی فتوحات کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ خلیفہ نے وفات پائی اور اس کا بیٹا سلیمان مسند آرائے خلافت ہوا جس کو حجاج اور اس کے خاندان سے سخت دشمنی تھی ۔ اس نے عنان سلطنت ہاتھ میں لیتے ہی سب سے پہلے محمد بن قاسم پر جو حجاج کا داماد تھا، ہاتھ صاف کیا اور محض بلا قصور ایک سپہ سالار بھیج کر سندھ سے اسے گرفتار کر منگایا اور شہر واسط میں قید کر دیا ۔ جہاں تکالیف سہتے سہتے ۹۶ھ میں اس بے نظیر بہادر نے عین عالم شباب میں نہایت حسرت کے ساتھ جان دی ۔

۱۱۔ کیا مسلمان ترقی نہ کرسکتے ہیں؟

(از رسالہ تہذیب الاخلاق بابت سنہ ۱۲۹۷ھ (۱۸۸۰ء، ص ۱۱۸)

جو قوم ترقی کے بعد تنزل کے درجے پر پہنچ جاتی ہے وہ ایک ایسی ابتر حالت میں ہوتی ہے کہ اس کا دوبارہ ترقی کرنے سے اکثر لوگ مایوس ہو جاتے ہیں۔ یا یوں کہو کہ اس کی قابلیت کا جوہر نظروں سے چھپ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر وہ ترقی کرنے کا ارادہ کرتی ہے تو اس کی سعی ایک حرکت مذبوحی سمجھی جاتی ہے۔ اگر وہ سنبھلنا چاہتی ہے تو اس پر سنبھالے کا گمان کیا جاتا ہے۔ یہی حال آج کل ہماری قوم کا ہے۔

اگرچہ بعضے مومن مسلمان جو کبھی اپنی نسبت بُرا گمان نہیں کرتے مسلمانوں کی قوم کو اب بھی اعلیٰ درجے کی ترقی کے قابل سمجھتے ہیں، لیکن امید ہے کہ وہ جس قدر زمانے کے حالات سے واقف ہوکر دنیا کی ترقیات کا اندازہ کریں گے اور جس قدر اپنی ترقی کے موانع پر غور فرمائیں گے اسی قدر ان کی رائے کی غلطی اُن پر ظاہر ہوتی جائے گی۔

البتہ جو لوگ مسلمانوں کی بہبودی سے بالکل مایوس ہیں اور اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ اُن میں کسی قسم کی ترقی کا مادہ باقی نہیں رہا اور ان کی اصلاح میں کوشش کرنے والے "ایک محال بات کے پیچھے پڑے ہیں" ان کی رائے نہایت غور اور توجہ کے لائق ہے۔ کیونکہ جن لوگوں کی رائے یہ ہے کہ وہ ہماری قوم میں اعلیٰ درجہ کے لائق آدمی ہیں اور ہماری موجودہ حالت جس سے بدتر کوئی حالت نہیں ہوسکتی۔ سراسر انھیں کی رائے کی تائید کرتی ہے۔ یعنی وہ ایک ایسا دعویٰ کرتے ہیں جس کا ثبوت خود ان کے دعوے ہی میں موجود ہے۔ ایک ایسے بیمار کی نسبت جس کی طاقت روز بروز زائل ہوتی جاتی رہی ہو جس کی غذا بالکل مفقود ہو، جو علاج معالجے سے سو سو کوس بھاگتا ہو، یہ کہنا کہ "وہ چند روز کا مہمان ہے" ایک ایسا دعویٰ ہے کہ آپ ہی اپنی دلیل ہوسکتا ہے۔

وہ خیالات جو مسلمانوں کی ترقی نہ کرسکنے کے

متعلق عام طور پر پیش کئے جاتے ہیں

(۱) پہلا خیال، مذہب مانع ترقی ہے۔

وہ لوگ (جن کی رائے اوپر بیان کی گئی) مسلمانوں کی موجودہ حالت کی شہادت کے سوا اور بھی دلیلیں پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ

"مسلمانوں کی مذہبی تعلیم ہی دنیوی ترقی کے لیے مانع ہے۔ پس تاوقتیکہ مسلمان مذہب سے دست بردار نہوں دنیوی ترقی نہیں کر سکتے۔ لیکن اس صورت میں مسلمانوں کی ترقی نہ ہوگی، بلکہ ایک ایسی قوم کی ترقی ہوگی۔ جس سے اسلام کا کچھ تعلق نہ ہو۔"

ہمارے نزدیک یہ ایک دلچسپ فقرہ ہے جو مسلمانوں کی ترقی و تنزل کے بحث کے وقت ہمیشہ استعمال کیا جاتا ہے۔

دنیا میں کوئی قوم شائستہ یا ناشائستہ ایسی نہیں جس کی مذہبی تعلیم اب یا کسی وقت دنیوی ترقیات کی مانع نہ خیال کی گئی ہو۔

اور سب قوموں کو جانے دو۔ عیسائی قومیں جو اس وقت دُنیوی ترقیات میں تمام دنیا سے فائق ہیں اور جو علم و دولت کے ساتھ ساتھ اپنے مذہب کو بھی ترقی دے رہی ہیں۔ اُن کا مذہب ہمارے مروجہ مذہب سے بھی زیادہ دُنیوی ترقی کا منافی سمجھا جاتا تھا جس وقت یورپ میں علم و حکمت کا ستارہ چمکا اور مذہبی خیالات اس کی روشنی میں مضمحل ہونے لگے، اس وقت مذہبی پیشواؤں اور خود گورنمنٹ کی طرف سے کون سی مزاحمت تھی جو نہیں ہوئی۔ جن لوگوں نے مذہب کو حشو و زوائد سے پاک کرنا چاہا اور آزادانہ تحریر و تقریر کرنی شروع کی اُس وقت اُن کو کیسے کیسے سخت عذاب دے گئے۔ ہزاروں آدمی جلائے گئے اور ہزاروں سخت تکلیفیں اور اذیتیں پہنچا کر ہلاک کئے گئے۔

سنہ ۱۲۹۴ء میں وکلف جو عیسائی مذہب کا مصلح تھا اور جس نے کتب مقدسہ کو انگلستان کی زبان مروجہ میں ترجمہ کیا تھا۔ اُس کے معتقدوں پر سخت عذاب کیا گیا۔

سنہ ۱۴۱۲ء میں آزادی مذہب کی بیخ کنی کے واسطے قانون جاری کئے گئے۔

۱۵۳۹ء میں سکاٹ لینڈ میں مصلحانِ مذہب پر انواع و اقسام کے ظلم کئے گئے، اور ساٹھ آدمی بدعت کے الزام پر جلتی آگ میں جلائے گئے۔

۱۵۵۵ء میں کئی رفارمر بدعتی ہونے کے الزام میں جلائے گئے اور تمام قید خانے اس قسم کے بدعتیوں سے بھر گئے۔

۱۶۴۱ء میں جب کہ آئرلینڈ میں بغاوت ہوئی تو چالیس ہزار پروٹسٹنٹ قتل کئے گئے۔

سترھویں صدی عیسوی کے اخیر تک ارسطو کی حجتوں نے تمام یورپ کے مدارس کو ایسا جکڑ بند کر رکھا تھا کہ وہ مذہب کی رکن رکین سمجھی جاتی تھیں۔ اور یہ تمام بندشیں اُس وقت تک نہ ٹوٹیں جب تک کہ لارڈ بیکن[1] نے نہایت زور آور تحریروں سے اُن کو نہ توڑا۔

کوپرنیکس[2] نے جس وقت سیارات کی نسبت اپنی تحقیقات ظاہر کی تو تمام کلیسا نے یک زبان ہو کر اس کو مردود ٹھہرایا۔

گلیلیو[3] نے ۱۶۰۹ء میں دوربینیں بنائیں اور سیارات کے متعلق بہت سے حالات

---

[1] فرانسس بیکن۔ انگلستان کا نامور ادیب اور زبردست فلسفی تھا۔ ۲۲ر جنوری ۱۵۶۱ء کو پیدا ہوا۔ اس کا باپ نکولس بیکن ملکہ الزبتھ کا مہر بردار اور وزیر تھا۔ بڑے ہو کر اپنے باپ کے بعد ۱۶۱۷ء میں یہ عہدہ اس کو ملا۔ مرغی کے گوشت کے نہ سڑنے کا تجربہ کرتے ہوئے سردی لگ کر ۹ر اپریل ۱۶۲۶ء کو ۶۶ برس کی عمر میں انتقال کیا۔

[2] کوپرنیکس (COPERNICUS) یورپ کا نہایت مشہور سائنسدان ہے ۱۴۷۳ء میں پولینڈ میں پیدا ہوا۔ اس نے یورپ میں سب سے پہلے اس مسئلہ کی اشاعت کی کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے اور نظام شمسی کا مرکز آفتاب ہے نہ کہ زمین ۱۵۴۳ء میں وفات پائی۔

[3] گلیلیو (GALILEO) یورپ کے بڑے اور مشہور سائنسدانوں میں سے ہے۔ دوربین کو اسی نے درجہ تکمیل کو پہنچایا۔ ۸ر فروری ۱۵۶۴ء کو اٹلی کے شہر فلارنس میں پیدا ہوا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ زمین گول ہے اور آفتاب کے گرد گھومتی ہے۔ اس جرم میں پوپ کے دربار سے پر کفر کا فتویٰ صادر ہوا اور گرفتار کر کے روما طلب کیا گیا، جہاں اس پر ایسی سختیاں ہوئیں کہ مجبور ہو کر (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

مشاہدہ کئے، مگر ان کا انعام یہ ملا کہ قید کیا گیا۔ اگرچہ ہر چند اس نے بہت زبردست اور صاف دلیلوں سے سمجھایا کہ یہ باتیں دین یا کتاب مقدس سے کچھ منافات نہیں رکھتیں مگر کسی نے التفات نہ کیا۔

غلامی کے موقوف کرنے میں یورپ کو بے شمار مزاحمتیں پیش آئیں۔ لوتھر[1] کی کتاب جو پوپ لیو دہم[2] کے برخلاف لکھی گئی تھی۔ ۱۵۲۰ء میں جلائی گئی۔ اسی طرح کے اور بے شمار واقعات پیش آئے جن کے بیان کرنے کا یہ محل نہیں ہے۔

آخر تعلیم نے تمام الف و عادات اور تعصبات کو دبالیا اور عیسائی مذہب بقدر ضرورت وقتاً فوقتاً حشو و زوائد سے پاک ہوتا رہا۔ اب وہی عیسائی قومیں ہیں کہ جس طرح دنیوی ترقیات میں تمام دنیا سے سبقت لے گئی ہیں، اسی طرح اپنے مذہب کی اشاعت اور حمایت میں تمام عالم کی قوموں سے زیادہ سرگرم ہیں۔

پس یہ خیال کہ مسلمان جب تک اپنے مذہب سے دست بردار نہ ہوں دنیوی ترقی نہیں کر سکتے، صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

اصل یہ ہے کہ ہر مذہب ایک مدت کے بعد اپنی اصلیت سے متجاوز ہوتے ہوتے ایک

(بقیہ نوٹ ص ۱۳۶) اس نے اس سے توبہ کی اور زمین کے گول اور متحرک ہونے سے انکار کیا۔ اس کی تمام کتابیں جن میں اس قسم کی کفریات درج تھیں۔ چوراہے پر رکھ کر نذر آتش کر دی گئیں۔ آخر عمر میں اندھا ہو گیا تھا۔ گلیلیو کا سال وفات ۱۶۴۲ء ہے۔

[1] لوتھر (LUTHER) عیسائی مذہب کا بہت بڑا مصلح اور فرقہ پروٹسٹنٹ کا بانی تھا۔ جرمنی میں ۱۴۸۳ء میں پیدا ہوا۔ ۱۵۱۰ء میں روما گیا۔ وہاں پوپ کی بداطواریاں دیکھیں تو اس کا سخت مخالف ہو گیا اور اس کے خلاف ملک میں لکچر دینے شروع کئے۔ پوپ نے ۱۵۲۰ء میں اسے کافر اور مسیحیت سے خارج کرنے کا اعلان کیا مگر اس نے کوئی پرواہ نہیں کی اور پوپ کا اعلان جلا دیا۔ ۱۵۴۶ء میں وفات پائی۔

[2] لیو دہم (LEO X) اٹلی کا پوپ اور دنیائے مسیحیت کا پیشوائے اعظم تھا۔ ۱۴۷۵ء میں پیدا ہوا اور ۱۵۲۱ء میں مر گیا۔

طومار طویل الذیل ہوجاتا ہے اور جب تک کوئی سخت ضرورت داعی نہیں ہوتی وہ برابر بڑھتا چلا جاتا ہے لیکن جب زمانے کی ضرورتیں اہلِ مذہب کو شکنجے میں کھینچتی ہیں تو وہ مذہب کی اصلیت دریافت کرنے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور بہت سے ملکی قوانین اور بہت سے قصے کہانیاں بہت سے رسم ورواج، بہت سے بیجا تعصبات اور بہت سے ظنون واوہام جو امتداد ایام کے سبب مذہب کے عناصر و ارکان بن جاتے ہیں، ان سے دست بردار ہوکر اصل مذہب پر قناعت کرتے ہیں، وہ خود ایسا نہیں کرتے بلکہ زمانے کی ضرورتیں ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ مثلاً۔

ہندوستان کا ایک شریف مسلمان، جو عورت کے گھر سے باہر نکلنے کو خلافِ شرافت ہی نہیں بلکہ خلافِ شریعت بھی جانتا ہے۔ جب اہل وعیال کے ساتھ سفر حج کرتا ہے تو اس کو مجبوراً پردہ نشینی کے وہ قاعدے توڑنے پڑتے ہیں جن کو وطن میں لازمۂ اسلام خیال کرتا تھا۔ ایک شیعی مسلمان جو مشرکین کے دودھ دہی اور مٹھائی وغیرہ سے پرہیز کرتا ہے۔ جب کوئی لمبا سفر کرتا ہے تو اس کو لاچار سب کچھ گوارا کرنا پڑتا ہے۔

انیسویں صدی کے آغاز میں جب محمود[۱] ثانی سلطان روم نے فوج کو فرنگستانی قواعد سکھانے کی نہایت سخت ضرورت سمجھی اور ینگچری فرقے نے جن کی شجاعت اور استقلال میں بے مثل اور شمار میں ایک لاکھ سے زیادہ تھی، کافروں کی قواعد سمجھ کر اس کے سیکھنے سے انکار کیا۔ اور کسی طرح وہ اپنی سرکشی سے باز نہ آئی تو آخر مجبور ہوکر اس فرقے کے ایک ایک متنفس کو قتل کرنا پڑا۔ اگرچہ اس فوج کے قتل ہونے سے سلطنت کو سخت صدمہ پہنچا لیکن زمانے کی ضرورتوں نے سلطان کو ایسے قتل عام پر مجبور کردیا اور اس دن سے فرنگستانی قواعد روم میں جاری ہوگئی۔

---

[۱] محمود ثانی ۔ خاندان عثمانیہ کا تیسواں تاجدار اور بہادر، عالی حوصلہ، خوش مزاج اور منتظم سلطان تھا محمود کا عہد ترکی میں بہت سی اصلاحات کا موجب ہوا، سب سے پہلے اسی کے زمانے میں ترکی سے اخبار جاری ہوئے۔ ۱۲۲۳ھ (۱۸۰۸ء) میں تخت پر بیٹھا اور ساڑھے پچپن سال کی عمر پاکر ۱۲۵۵ھ (۱۸۳۹ء) میں وفات پائی۔

جینک نیگچری[1] فرقے کی یہ بغاوت و سرکشی مذہبی خیالات کا نتیجہ تھی۔ لیکن چونکہ حقیقت میں اُس کی بنیاد محض تعصب پر تھی، نہ کہ اصول مذہب پر، اور زمانے کی ضرورتیں بھی مجبور کر رہی تھیں کہ بغیر نئے آلات جنگ سے مصلح ہوئے اور موجودہ طرز نبرد آزمائی سے واقف ہوئے بغیر چارہ نہیں اس لیے تمام علماء نے متفق اللفظ ہو کر ایک لاکھ بہادر اور کار آزمودہ فوج کے قتل کا فتویٰ دے دیا۔

الغرض مذہبی توہمات جب ہی تک مانع ترقی رہتے ہیں جب تک زمانے کی ضرورتیں اہل مذہب کو مجبور نہیں کرتیں۔

آج سے تیس برس پہلے ہندوستان میں ایک بھی ایسا نہ ہو گا جو انگریزی زبان سیکھنے کو معصیت نہ جانتا ہو لیکن اب برخلاف اس کے ایک مسلمان بھی ایسا نہ ہو گا جو انگریزی سیکھنے کو ضروری نہ سمجھتا ہو۔[2]

کیا وہ پہلا خیال ایک مذہبی خیال نہ تھا؟ اور کیا اس خیال کے بدل جانے سے مسلمانان اسلام سے دست بردار ہو گئے؟ حاشا ثم حاشا۔

پس یہ خیال بالکل غلط ہو کہ جب تک مسلمان اسلام سے دست بردار نہ ہوں دنیوی ترقی ہرگز نہیں کر سکتے۔ البتہ جب تک کوئی یہ نہ جتائے کہ کیا ضرورتیں درپیش ہیں تب تک

---

[1] نیگچری۔ یہ ٹرکی کی ایک خاص اور بڑی زبردست قواعد داں فوج تھی جس کی بنیاد سلطان ارخان کے بھائی وزیر علاؤالدین نے ان عیسائی اسیران جنگ سے ڈالی تھی جو مسلمان ہو جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ اس فوج نے بہت بڑی طاقت حاصل کر لی اور معاملات سلطنت میں دخل دینے لگی اور اس کے اشاروں پر ٹرکی سلطان معزول اور قتل ہونے لگے۔ بڑھتے بڑھتے اس قاہرہ فوج کی تعداد ۵ لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ یہ فوج اس قدر زبردست تھی کہ تمام یورپ اس کی وجہ سے ٹرکی سلطنت سے کانپتا تھا۔ بالآخر جب اس کی سرکشی حد سے بڑھ گئی تو رمضان ۱۲۴۱ھ (۱۸۲۶ء) میں سلطان محمود ثانی نے چن چن کر اس کا ایک ایک فرد قتل کر ڈالا۔

[2] قبلہ اب بھی ڈھیروں اور غول کے غول ہیں (حاشیہ از سرسید در تہذیب الاخلاق)

نہ مذہبی توہمات ہمارے دل سے دُور ہو سکتے ہیں نہ ترقی کا خیال ہمارے دل میں پیدا ہو سکتا ہے اور وہ شے تعلیم ہے جس کے پھیلانے میں چند باہمت لوگ کوشش کر رہے ہیں۔ اگرچہ قوم ان کی چیخ پکار سے بیدار نہیں ہوئی لیکن افصح المؤدبین (یعنی زمانہ) ان کو جلد ہشیار کر دیگا۔

۲۔ دوسرا خیال۔ ایک بار تنزل کے بعد دوبارہ ترقی نہیں ہو سکتی

دوسری دلیل وہ یہ پیش کرتے ہیں کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں سنی گئی جس نے ایک بار تنزل کے درجے پر پہنچ کر دوبارہ ترقی کی ہو۔

لیکن ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ دوبارہ ترقی کرنے سے کیا مطلب ہے؟ اگر دوبارہ سلطنت حاصل کرنا مراد ہے تو ہم تسلیم کرتے ہیں (بلکہ ہمارے نزدیک اگر دنیا واقعی عالم اسباب ہے تو ممکن نہیں) کہ جو قومیں زمانۂ موجودہ کے فنون جہانبانی و کشورکشائی میں اپنے بنی نوع سے پیچھے رہ گئی ہیں ان کو کبھی سلطنت اور حکومت میں استقلال کا درجہ حاصل ہو سکے یا جو مستقل نظر آتی ہیں ان کا استقلال قائم رہ سکے۔

زمانۂ قدیم اور دورِ متوسط میں جب کہ جنگی طاقتیں تمام قوموں کی قریباً یکساں تھیں، اُس وقت ہر قوم سلطنت اور حکومت حاصل کرنے کی قابلیت رکھتی تھی اور خاص خاص اسباب سے کبھی یہ قوم اُس قوم پر اور کبھی وہ قوم اس قوم پر غالب آجاتی تھی۔

لیکن زمانۂ حال میں قواعدِ جنگ و آلاتِ حرب کے لحاظ سے دنیا کی حالت دگرگوں ہے۔ ایک قوم آسمان پر ہے تو دوسری قوم تحت الثریٰ میں ہے اور جو قومیں ترقی کر چکی ہیں اُن کا فرض ہے کہ مغلوب قوموں کو کبھی ان وسائل میں اپنے برابر نہ ہونے دیں جن کے سبب سے اُن کو غلبہ حاصل ہوا ہے۔ پس ضروری ہے کہ ترقی یافتہ قوموں کا غلبہ اور رعب داب روز بروز بڑھتا جائے اور جن قوموں نے اپنی حد سے آگے قدم نہیں بڑھایا وہ نوبت بہ نوبت مضمحل ہوتی جائیں، لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ مسلمانوں کی ترقی کے لیے کوشش کرنا فضول ہے، صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

ہر قوم بلکہ ہر شخص کی ترقی کی ایک جداگانہ حد ہے اور اس حد تک پہنچنا اُس کا

ضروری فرض ہے۔ ایک شخص جس کے تمام اعضائے جسمانی درست اور مضبوط ہیں اور ذہن و حافظہ بھی عمدہ ہے، بے شک ہر علم و ہنر میں ترقی کر سکتا ہے۔ وہ جس طرح ایک اعلیٰ درجے کا فاضل ہو سکتا ہے ویسا ہی ایک اعلیٰ درجے کا سپاہی بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن ایک دوسرا شخص جس کا فہم، ذہن اور حافظہ عمدہ ہے مگر ایک ہاتھ سے بالکل اپاہج ہے وہ اگرچہ ایک عمدہ سپاہی نہیں بن سکتا لیکن ایک اعلیٰ درجہ کا فاضل ضرور ہو سکتا ہے اور اس لیے اُس کا نہایت ضروری فرض ہے کہ علمی ترقیات میں جہاں تک ہو سکے کوشش کرے۔

اگر دوبارہ ترقی کرنے سے یہ مراد نہیں ہے جو اوپر ذکر کی گئی تو ہم تسلیم نہیں کرتے کہ کسی قوم نے تنزل کے بعد ترقی نہیں کی۔

اور ملکوں کو جانے دو۔ ہندوستان ہی میں ایسی قومیں موجود ہیں جو نہایت پست ہو کر دوبارہ بلند ہوئی ہیں۔ مثلاً گجرات میں پارسی یا بنگالہ میں ہندو۔ ان دونوں قوموں کا حال جو دو سو برس پہلے تھا اور اُن کی موجودہ حالت۔ دونوں کا مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے کس قدر ترقی کی ہے۔

اس کے سوا کوئی روشن اور صاف دلیل اس بات کی نہیں ہے کہ جب گورنمنٹ کی طرف سے ہماری تعلیم، ہماری تجارت اور ہماری صنعت و حرفت میں کوئی صریح مزاحمت نہ ہو تو بھی ہم ان شاخوں میں ترقی نہیں کر سکتے۔

یہودیوں پر جب تک یورپ میں . . . . ظلم و ستم ہوتا رہا اور غلامی کی حالت میں رہے تب تک ان کی ترقیات بس قدر کہ وہ رعیت ہونے کی حالت میں کر سکتے تھے رُکی رہیں لیکن جب سے یورپ میں آزادی پھیلی اور اُن کو رعیت کے پورے پورے حق دئے گئے تب سے اُن کی حالت پہلے کی نسبت نہایت بہتر ہے۔ بعض ملکوں میں تو انھوں نے حکمراں قوموں کے برابر حقوق حاصل کئے ہیں۔ عموماً ہر ملک میں ان کی حالت اچھی ہے۔ ان کی تجارت تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ہے اور اُن کی دولت روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ بعض دولت مندوں میں ایسے ہیں کہ یورپ کی بڑی بڑی سلطنتیں ان کی قرضدار ہیں۔

۳۔ تیسرا خیال۔ موجودہ تعلیمی کوششوں کا نتیجہ کچھ نہ نکلے گا، لہٰذا کوشش بے سود ہے

جو لوگ مسلمانوں کی ترقی سے بالکل مایوس ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ:

"اس کوشش کا نتیجہ جو کہ مسلمانوں کے بعض خیر خواہ کر رہے ہیں، اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ چند آدمی کسی قدر امتیاز حاصل کر لیں۔ کیونکہ آج تک جتنے آدمیوں کو ترقی کا خیال ہوا ہے وہ اس قدر تھوڑے ہیں کہ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ پس اگر سو دو سو برس میں ہزار دو ہزار مسلمان ممتاز ہو گئے تو اس کو قومی ترقی نہیں کہہ سکتے۔"

لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ مسلمانوں کو کے دن سے ترقی کا خیال پیدا ہوا ہے؟ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو ان کے خیال کی عمر اور پرچہ "تہذیب الاخلاق" کی عمر برابر نکلے گی۔ بس جو کچھ اس قلیل عرصے میں ہوا، وہ ترقی کی معمولی چال سے بہت زیادہ ہے۔ اس کے سوا ترقی کی رفتار ابتدا میں ہمیشہ سست ہوتی ہے لیکن وہ جس قدر بڑھتی جاتی ہے، اسی قدر تیز ہوتی جاتی ہے جو بیمار روز بروز زیگر "ہا جاتا ہے، اس کا ادنیٰ افاقہ بھی نہایت تسلی بخش ہوتا ہے اور اگر پھر کوئی غلطی نہیں ہوتی تو اس کی صحت اور طاقت روز بروز ترقی کرتی ہے اور یہ ترقی یوماً فیوماً بڑھتی جاتی ہے۔

جو ترقی یورپ نے اٹھارویں صدی کے شروع سے آج تک یعنی ڈیڑھ سو برس میں کی ہے گزشتہ تین صدیوں میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہوا، اور جو کچھ ان تین صدیوں میں ہوا اس کے مقابلے میں وہ تمام ترقیات ہیچ تھیں جو پندرھویں صدی سے پہلے سالہا سال تک وقتاً فوقتاً ہوتی رہیں۔

۴۔ چوتھا خیال۔ پہلے سے ترقی کُن قوموں کے برابر چونکہ ہم نہیں ہو سکتے، لہٰذا ترقی بے فائدہ ہے

بعض اوقات یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "جو قومیں پہلے سے ترقی کر رہی ہیں، اُن کے برابر ایک ایسی قوم ہرگز نہیں ہو سکتی جس کو سب سے پیچھے ترقی کا خیال پیدا ہوا ہو پس اگر بالفرض مسلمانوں نے اب ترقی کرنے کا ارادہ بھی کیا تو کچھ فائدہ نہیں، کیونکہ ایسی حالت میں ہم ان ترقی یافتہ قوموں سے ہمیشہ پیچھے ہی رہیں گے۔

بے شک یہ بات صحیح ہے۔ لیکن ہماری کوشش صرف اس بات میں ہونی چاہیے کہ ہم اپنی ہم وطن قوموں سے جنھوں نے ہم سے بہت پہلے قدم آگے بڑھایا ہے۔ کسی چیز میں کم نہ رہیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ ہم اس کوشش میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ محکوم قوموں کی ترقی ہمیشہ ایک حد پر جا کر پھیکی ہو جاتی ہے جس سے آگے بڑھنے کا محل ان کے لیے باقی نہیں رہتا۔ پس اگر ان میں سے ایک قوم آگے بڑھ گئی اور دوسری قوم پیچھے رہ گئی ہے تو پسماندہ قوم کو مایوس نہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ اگر راہ میں نہیں تو اخیر منزل میں دونوں مل جائیں گے اور یہ بھی ناممکن نہیں ہے کہ راہ ہی میں پچھلا قافلہ اگلے قافلے سے جا ملے۔ کیونکہ بعض اوقات ایسی اضطراری حالتیں پیش آتی ہیں کہ پچھلوں کو معمولی رفتار سے کسی قدر زیادہ جلد قدم اٹھانا پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ راہ میں اگلوں سے جا ملتے ہیں۔

اصل مانع ترقی مایوسی اور ناامیدی ہے

بہر حال یہ تمام موانع جو اوپر ذکر کیے گئے ہم کو ترقی سے مایوس کرنے والے نہیں ہیں البتہ صرف ایک بات ایسی ہے جو تمام منصوبوں اور ارادوں کو خاک میں ملا دیتی ہے اور وہ ترقی کی طرف سے مایوسی اور ناامیدی ہے۔

جو قوم عام تعصب اور جہالت میں مبتلا ہوتی ہے، وہ ہمیشہ چند ایسے روشن ضمیر آدمیوں کی ہمت اور کوشش سے روبراہ ہوتی ہے جو تعلیم کی بدولت تعصب اور جہالت کی اندھیری کوٹھری سے بالکل باہر نکل آتے ہیں اور قوم کی ابتر حالت حالت دیکھ کر ان کے دل میں بے اختیار ایک دلولہ اٹھتا ہے اور قومی اصلاح و ترقی کی طرف دل و جان سے متوجہ ہو جاتے ہیں۔

اسی بنا پر ہم کو یہ امید تھی کہ جو نوجوان ہماری قوم میں اعلیٰ درجے کی تعلیم پائیں گے وہ اس کام کے ذمہ دار ہوں گے۔ مگر برخلاف اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ جس قدر ایجوکیشن اور سویلیزیشن (تعلیم و تہذیب) میں اعلیٰ درجہ حاصل کرتے ہیں۔ اسی قدر قوم کی ترقی سے مایوس نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ جن نفوس مقدسہ کو قومی ترقی کے خیال میں سرگرم پاتے ہیں ان پر تعجب کرتے ہیں کہ یہ کیوں کوشش کر رہے ہیں؟ اور کیوں کر کر رہے ہیں؟

ہائی ایجوکیشن (اعلیٰ تعلیم) کی بدولت ان . . . . . کی مثال ایسے شخص کی مانند ہے جو

اندھیری رات ایک نہایت روشن کمرے سے باہر نکلتا ہے اور باہر آکر اس کو دلدودیار کچھ نظر نہیں آتا وہ باہر چلنے پھرنے والوں کے پاؤں کی آہٹ سن کر تعجب کرتا ہے کہ یہ لوگ کیونکر اس اندھیرے میں باہر چل پھر رہے ہیں اور آخر گھبرا کر پھر اسی روشن کمرے میں گھس جاتا ہے، وہ اتنا توقف نہیں کرتا کہ روشنی کی چکا چوندھ جس نے اس کی آنکھوں کو خیرہ کر رکھا ہے کم ہو جائے اور تاریکی میں اس کو بھی روشنی محسوس ہونے لگے اور وہ بھی اوروں کی طرح چل پھر سکے۔

اسی طرح ہماری قوم کے نوجوان ایجوکیٹیڈ (تعلیم یافتہ) جنھوں نے یورپ کی سویلزیشن (تہذیب) کو اپنی آنکھ سے دیکھا ہے یا تعلیم کے ذریعے سے اس کا اندازہ کیا ہے۔ وہ جب مغربی قوموں کی حالت کو اپنی قوم کی موجودہ حالت سے مقابلہ کرتے ہیں تو دونوں حالتوں میں وہ نسبت پاتے ہیں جو محض نور اور محض ظلمت میں ہے اور بے شک بادی النظر میں ایسی ہی نسبت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت میں ایسا حال نہیں بلکہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اندھیرے میں کچھ اُجالا بھی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ دو چار شخصوں کی کوششوں سے چند روز میں وہ نتائج پیدا ہوئے ہیں جن کی کسی طرح توقع نہ تھی۔ پس اگر دس بیس یا سیاقت آدمی توجہ اور کوشش کریں تو بہت کچھ کر سکتے ہیں۔

صرف دو چیزیں ہیں جن پر دنیا کی کامیابی اور ناکامی کا مدار رکھا گیا ہے۔

(۱) امید (۲) ناامیدی۔

ہزاروں دشوار کام جو بالیقین محال بلکہ ناممکن سمجھے گئے تھے، امید کی بدولت اور کوشش کے ذریعے نہ صرف ممکن بلکہ انجام پائے ہیں اور ہزاروں سہل اور آسان کام ناامیدی اور ہمت ہار دینے کی وجہ سے ناتمام اور ادھورے رہے ہیں۔ دیکھو کلمبس نے صرف امید کے بھروسے پر ایک ایسا کام سرانجام کیا جس کو تمام عالم محال سمجھتا تھا اور کلایو نے امید کے سہارے وہ فتح حاصل کی جس کے نتائج کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔

بجز امید کہ ایمانِ عشق کیشاں است　　کسے نداد تسلی دلِ زلیخا را

۱۲۔ ایامِ تعطیل میں ایک سفر کی کیفیت

(از علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ بابت ۱۸۸۰ء۔ صفحہ ۱۰۸۳).

(یہ مضمون اس زمانے کا لکھا ہوا ہے جب مولانا حالی اینگلو عربک ہائی اسکول دہلی میں مدرس عربی تھے۔ موسم گرما کی تعطیلات میں بجائے وطن کے قیام کے آپ نے ایک مختصر سا سفر کیا تھا۔ سطور ذیل اسی دورہ کے حالات ہیں جن کو مولانا نے خود علی گڑھ گزٹ میں چھپوایا تھا۔)

ایامِ تعطیل میں دوستوں اور عزیزوں سے ملنے کی غرض سے ہم کو چند مقامات میں دورہ کرنے کا اتفاق ہوا اور ہم دہلی سے علی گڑھ پہنچے۔ اور جناب آنریبل سید احمد خاں بہادر کی کوٹھی پر ٹھہرے۔

اب کی دفعہ ہم نے مدرسۃ العلوم کو تیسری بار دیکھا اور اس کی روز افزوں ترقی دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا۔ مدرسہ کو دیکھ کر ہم کو اس بات کا پورا یقین ہو گیا کہ اولوا العزم اور مستقل مزاج آدمی اپنے ارادوں کی مزاحمت سے اور زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔

ان لوگوں کے سوا جو عناد اور دشمنی سے اس مدرسہ کے مخالف ہیں باقی سب مسلمان رفتہ رفتہ اس کی قدر کرتے جاتے ہیں اور جن عمدہ اصولوں پر اس مدرسہ کی بنیاد قائم کی گئی ہے اب ان کی عمدگی اور خوبی سب پر ظاہر ہو رہی ہے اور اسی وجہ سے طلبا کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔ بہت سے بے خبر اور ناواقف لوگ جو اپنی اولاد کو یہاں بھیجتے ہوئے جھجکتے تھے اور ان کے مذہب و عقائد کے بدل جانے سے ڈرتے تھے وہ اب نہایت اطمینان اور دلجمعی سے اپنی اولاد کو بھیجنے لگے۔

یہ بات تحقیق ہو گئی ہے کہ بانیٔ مدرسۃ العلوم کے مذہبی اعتقادات اور رایوں کو مدرسۃ العلوم کی تعلیم میں کچھ بھی دخل نہیں ہے۔

اس امر کا یہاں تک خیال رکھا جاتا ہے کہ رسالہ "تہذیب الاخلاق" جو مطبع علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ سے چھپکر شائع ہوتا ہے اس کی کوئی کاپی مفت یا بہ قیمت کسی طالب علم کو نہیں دی جاتی

طلبائے مدرسہ کے افعال واخلاق کی نگرانی پر یہاں وہ لوگ مامور ہیں جو جمہور اہل اسلام کے طریقے سے سرمو تجاوز کرنے کو بھی کفر جانتے ہیں۔

علی گڑھ میں ہم بعض ایسے دوستوں سے ملے جو چند سال پہلے اس مدرسہ کو "دارالکفر" سمجھتے تھے لیکن اب حد سے زیادہ اس کے مداح اور ثنا خواں ہیں اور اپنے بچوں کو وہاں تعلیم کے لیے بھیجتے ہیں۔

مدرسہ میں دو چار کے سوا جو کہ مریض تھے ہم نے سب مسلمان طالب علموں کو روزہ دار پایا۔ افطار کے وقت نماز کے چبوترے پر جو بالفعل عارضی طور پر بنا لیا گیا ہے۔ سب جمع ہوتے تھے اور نہایت لطف کے ساتھ روزہ افطار ہوتا تھا۔ نماز عشا کے بعد جناب مولوی محمد امیر صاحب قرآن سناتے تھے اور اکثر طالب علم اُن کا قرآن سُنتے تھے۔ ایک روز جناب مولوی سید فریدالدین احمد خان بہادر نے اور دوسرے روز ہمارے جلیل القدر میزبان (یعنی سید احمد خاں صاحب) نے بھی روزہ افطار کی تقریب میں اپنے دوستوں کو بلایا تھا اور ان دونوں صحبتوں میں ہم بھی شریک تھے۔

مدرستہ العلوم کی تعمیر نہایت شد و مد سے جاری ہے اور جس قدر کام اس میں ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے اس کو دیکھ کر بے انتہا تعجب ہوتا ہے۔

مدرستہ العلوم کے حامیوں اور کارپردازوں کی سرگرمی اور کوشش دیکھ کر ان لوگوں کے دل میں بھی جو مسلمانوں کی ترقی سے مایوس ہیں ایک جوش اور ولولہ پیدا ہوتا ہے اور یہ امید ہوتی ہے کہ اس قوم کی ترقی کا اگر مدار ہو سکتا ہے تو یہی مدرسہ ہو سکتا ہے۔

علی گڑھ میں پانچ روز ٹھہر کر ہم فیروز آباد کا ارادہ۔ مین پوری اور کان پور ہوتے ہوتے ہمیر پور میں پہونچے۔

فیروز آباد ضلع آگرہ کا ایک مشہور قصبہ ہے جس میں سرکاری تھانہ اور تحصیل بھی ہے۔ یہ قصبہ جیسا کہ مشہور ہے فیروز خواجہ سرا کا آباد کیا ہوا ہے لیکن یہ ایک غیر محقق بات ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ فیروز شاہ کا آباد کیا ہوا ہو۔ جیسے فیروز پور یا حصار فیروزہ وغیرہ۔

یہاں کھجور کے پتے کی پنکھیاں ایسی عمدہ بنتی ہیں کہ ہندوستان میں شاید ہی کہیں اور بنتی ہوں۔ سادی پنکھیاں جن میں کسی قدر ریشم کا کام ہوتا ہے۔ ایک روپیہ قیمت کی ہم نے بھی

یہاں دیکھیں اس کے سوا یہاں کی کوئی بات ذکر کے قابل نہیں ہے۔

یہاں کے مسلمان جو پہلے بہت آسودہ اور مرفہ الحال تھے اب اس قدر پست حالت میں ہیں کہ وہاں کے ذی اعتبار باشندوں میں ان کا ذکر نہیں آتا۔

اٹاوہ میں ہم کو زیادہ ٹھہرنے کی مہلت نہیں ملی اور نہ اپنے شفیق میزبان کے مکان کے سوا کہیں جانے کا اتفاق ہوا۔

مین پوری میں ہم دو روز ٹھہرے۔ خوش قسمتی سے ہم کو ایک دن اور ایک رات جناب مرزا عابد علی بیگ صاحب سب ارڈینیٹ جج کی خدمت میں رہنے کا موقع ملا۔ یہاں بھی طریقہ معاشرت میں ہم نے وہی انوار و برکات مشاہدہ کیے جو علی گڑھ میں کیے تھے۔ جناب مرزا صاحب بھی اسی گروہ میں سے ہیں جو قومی ہمدردی کو اس الحسنات اور مخ العبادات جانتے ہیں۔ جب ہم اُن کے دولت خانے سے رخصت ہو کر ڈاک گاڑی پر پہنچے تو اُن کے دو آدمی ہمارے ساتھ تھے جن سے کوچبان کو معلوم ہوا کہ وہ صدر اعلیٰ کے ہاں سے آئے ہیں۔ اس بات نے ہم کو بہت تکلیف میں ڈالا۔ کیونکہ گاڑی کا کوچبان اتفاق سے مسلمان ہونے کے ساتھ نہایت متقی بھی تھا۔ اس نے یہ بات معلوم ہونے پر راستے میں ہم کو پانی پینے کے لیے اپنا کٹورہ تک نہیں دیا اور ہم سے برابر ایسا پرہیز کرتا رہا جیسے بعض ہندو مسلمانوں سے کرتے ہیں۔ اول اول تو ہم کو اس بات سے بہت تعجب ہوا۔ لیکن پھر یاد آیا کہ ہم نے اپنے عالیقدر میزبان کے ہاں برابر دو وقت میز پر کھانا کھایا تھا اور اسی لیے ہم سے پرہیز کرنا ضروری تھا۔

جب ہم کانپور پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہاں سے ہمیر پور تک اونٹ گاڑی کے سوا کوئی سواری نہیں جاتی۔ اس لیے لاچار اسی میں جانا پڑا اور اتفاقاً ہم کو اوپر کے درجے میں جگہ ملی۔ ہم کو یاد نہیں کہ ہم نے کبھی کسی سواری یا پیدل چلنے میں ایسی تکلیف اُٹھائی ہو جیسی اس اونٹ گاڑی میں پہنچی۔

ریل کے زمانے سے پہلے یہی سواریاں نہایت غنیمت سمجھی جاتی تھیں، مگر اب ان کے نام سے ہول آتی ہے۔ افسوس کہ یورپ کی صنعتیں روز ہم کو پرلے درجے کا آرام طلب اور راحت پسند بناتی جاتی ہیں اور اب وہ تمام اسباب اور ذریعے مفقود ہیں جن کے باعث سے

کبھی کبھی ہم کو جفاکشی اور محنت کرنے کا موقع ملتا رہے۔

ہمیرپور کو جاتے ہوئے پچھم کی طرف سڑک سے کسی قدر فاصلہ پر ہم نے ایک مندر دیکھا جو بیربر کا بنا ہوا مشہور ہے۔ گو یہ مندر کچھ زیادہ شاندار نہیں ہے، مگر اس سنسان جنگل میں ایک ایسے زمانے کو یاد دلاتا ہے جو ہندوستان تاریخ میں طلائی زمانہ کہلانے کا مستحق ہے۔

اب ہم جمنا سے اتر کر ہمیرپور میں پہنچے۔ ہمیرپور راجہ ہمیر سنگھ کا آباد کیا ہوا مشہور ہے جس کے خاندان کی عمارتوں کے کھنڈر اب تک وہاں موجود ہیں۔ یہ قصبہ کانپور سے چالیس میل جانب جنوب بہت بلندی پر واقع ہے۔

اس کے شمال میں جمنا اور جنوب میں بیدونتی ندی بہتی ہے اور مشرق میں ایک میل پر جا کر دونوں مل گئی ہیں۔ مغرب میں ایک نالہ ہے جو بیدونتی میں جا کر گرتا ہے۔ یہ نالہ برسات میں جاری ہو جاتا ہے، اور ویسے ایام میں خشک رہتا ہے اور اس لحاظ سے ہمیرپور کو کبھی جزیرہ اور کبھی جزیرہ نما کہا جا سکتا ہے۔

قدیم باشندے یہاں کے زیادہ تر ہندو ہیں، شریف مسلمانوں میں صرف ایک سیدوں کا خاندان ہے جو اکثر خانہ نشین اور بزرگوں کے متروکہ پر قانع ہے۔ اس خاندان کے جتنے آدمی میں نے دیکھے ہیں سب پرانی روش کے بھولے بھالے سیدھے سادھے سید ہیں جن پر زمانۂ حال کی چھینٹ بھی نہیں پڑی۔

اس مقام کی رونق زیادہ تر سرکاری ملازموں سے ہے اور یہ نہایت خوشی کی بات ہے کہ یہاں سرکاری ملازموں میں جس قدر پردیسی مسلمان ہیں، وہ برخلاف عام مسلمانوں کے باہم برادرانہ محبت اور برتاؤ رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کے درد اور دکھ میں شریک ہوتے ہیں مگر باوجود اس کے تعصبات بیجا میں سب گرفتار ہیں۔ حقیقت میں ہمیرپور ایک ایسے گوشے میں واقع ہے جہاں زمانے کے شور وشغب کی آواز بہت کم پہنچتی ہے۔ مدرسۃ العلوم کا نام وہاں کے اکثر مسلمانوں نے کبھی کان سے بھی نہیں سنا اور جنھوں نے سنا ہے اُن کے ذہن میں اس کی ایسی ہولناک صورت سمائی ہوئی ہے کہ اس کے نام سے پناہ مانگتے ہیں۔

دلّی سے ہمیرپور تک ہم کو شریف مسلمانوں کی اکثر صحبتوں میں بیٹھنے اور ان کی بات چیت

ملنے کا اتفاق ہوا۔ تقریباً تمام مجلسوں میں رنگ۔ ہم نے ایک ہی اصل پر دیکھا۔ وہی بناوٹی اور تعلّی، ہر ایک پہلو سے اپنی تعریف نکالنی، لوگوں کے عیب ڈھونڈنے اور ان کی برائی سے یاد کرنا، حاضرین کی خوشامد اور غائبین کی بدگوئی، بات بات میں فحش اور دشنام سے زبان کو آلودہ کرنا اور سب سے زیادہ خودغرضی اور تعصب کا بازار ہر جگہ گرم پایا۔

مراجعت کے وقت ہم ایک دن آگرہ میں ٹھہر کر الور پہنچے۔ یہاں ہم کو "راجپوتانہ اسٹیٹ ریلوے" میں بیٹھنا پڑا۔ چونکہ یہ سرکاری ریل ہے، اس وجہ سے ہم کو امید تھی کہ اس میں زیادہ آرام ملے گا۔ مگر برخلاف اس کے سب سے زیادہ اسی میں تکلیف اٹھانی پڑی۔ اول تو اس میں انٹرمیڈیٹ کلاس کے نہ ہونے سے بڑا نقص ہے۔ کیونکہ متوسط الحال آدمیوں کے لیے یہ درجہ فرسٹ کلاس کا حکم رکھتا ہے۔ دوسرے گاڑیاں اس قدر چھوٹی ہیں کہ ایک ایک کمرے میں صرف چار آدمی آرام سے بیٹھ سکتے ہیں۔ باوجود اس کے ایک ایک کمرے میں آٹھ آٹھ آدمی بٹھائے جانے کا حکم ہے۔ اور اس پر غضب یہ ہے کہ جب تک ایک کمرے میں پورے آٹھ آدمی نہیں بیٹھ لیتے تب تک دوسرا کمرہ نہیں کھولا جاتا۔ حالانکہ اکثر اسی کلاس کی پانچ پانچ سات سات گاڑیاں ٹرین میں خالی جاتی ہیں۔

ہم رات کی ٹرین میں سوار ہوئے تھے اور ہماری گاڑی کے کسی کمرے میں آٹھ آدمی سے کم نہ تھے۔ نیند کے مارے ایک دوسرے پر گرا پڑتا تھا اور تمام راستے مسافروں میں باہم تکرار ہوتی رہی۔ علاوہ اس کے تو یوں بھی یہ ریل اور ریلوں کی نسبت سست رفتار بھی بہت ہے۔ صبح کے سات بجے ہم باندی کوئی میں پہنچے اور دس بجے تک یہاں ٹھہرے رہے۔ یہاں تقریباً ڈیڑھ میل طول اور اسی قدر عرض کے میدان میں بالکل سنگین عمارتیں اس قدر بنائی گئی ہیں کہ بجائے خود ایک شہر آباد ہو گیا۔ سنا جاتا ہے کہ یہاں سرکاری فوج رکھی جائے گی۔

وہاں سے چل کر ساڑھے بارہ بجے الور پہنچے اور دوپہر تک نئی سرائے میں جو کیڈل صاحب پولیٹکل ایجنٹ کے عہد میں تیار ہوئی ہے ٹھہرے۔ اس سرائے کی عمارت بالکل سنگین ہے۔ ظاہرا ہندوستان میں یہ پہلی سرائے ہے جس کے نقشے میں ایک مسافر کی آرائش اور تمام ضروریات کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ رات کو ہمارے ایک معزز دوست نے ہم کو اپنے

مکان پر بلا لیا اور پانچ روز تک ہم انھیں کے مکان پر ٹھہرے رہے۔

الور کو اس سے پہلے ہم نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ شہر کی آبادی عین دامنِ کوہ میں واقع ہوئی ہے اور اسی وجہ سے شہر کا شمالی حصہ جنوبی حصے سے کسی قدر بلند ہے۔ یہاں کے بازار اگرچہ بہت وسیع نہیں مگر پُر رونق ضرور ہیں۔ عمارتیں اکثر سنگین ہیں۔

شہر کی عام عمارتیں کچھ زیادہ امتیاز نہیں رکھتیں لیکن سرکاری محلوں سے راج کی پوری پوری شان و شوکت ظاہر ہوتی ہے۔

خصوصاً وہ محل جو موتی ڈونگری کے باغ میں مہاراجہ جے سنگھ نے بنوایا ہے۔ عمارت کی خوبی کے علاوہ ایسے موقع پر واقع ہوا ہے جس سے اس کی شان اور عظمت دس گنی ہو گئی ہے۔ محل کے اوپر کے درجہ پر چڑھ کر جس طرف نظر ڈالئے زمین اور پہاڑ اور فرشِ زمردیں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اگرچہ اب کے وہاں بارش نہایت کم ہوئی تھی، مگر پھر بھی وہاں قدرتی فضا دیکھنے کے قابل تھی۔

یہاں ایک اور مقام بھی کمال دلکش اور روح افزا ہے۔ جو سیلی سیڑھ کے نام سے مشہور ہے۔ شہر سے تقریباً چھ میل کے فاصلہ پر ایک سیتلا کا مندر ہے جس کو وہاں کے لوگ سیلی سیڑھ کہتے ہیں۔ (سیلی سیڑھ کے لفظی معنی ٹھنڈی سیتلا کے ہیں۔)

یہاں دو طرف سے پہاڑ آکر مل گیا ہے اور ایک مثلث کی سی شکل پیدا ہو گئی ہے۔ اس مثلث کے گوشے میں ایک بڑا اور نہایت مستحکم بند باندھا گیا ہے جس میں وقتاً فوقتاً بارش کا پانی دونوں پہاڑوں سے جھر جھر کر اکٹھا ہوتا رہتا ہے اور یہاں سے الور تک ایک پختہ نہر بنی ہوئی ہے جس کے ذریعہ سے بند پانی رستے کے تمام کھیتوں کو سیراب کرتا ہوا شہر تک پہنچتا ہے اور وہاں جا کر الور کے تمام باغات اور اس کے تمام سواد کو سال بھر تک سرسبز و شاداب رکھتا ہے۔ بند کے ایک جانب پہاڑ پر نہایت پختہ گھاٹ تقریباً پاؤ میل اونچا بنا ہوا ہے جو پہاڑ کی چوٹی پر جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ وہاں سرکاری محل بنے ہوئے ہیں۔ یہ مہاراجہ جے سنگھ کی ایک نمود اور یادگار ہے جو ہمیشہ اُن کے عہدِ حکومت کو یاد دلائے گی۔

الور کا سواد نہایت دلکش اور دلرُبا ہے اور تمام باغات سے گھرا ہوا ہے۔ موتی ڈونگری

کے باغ کے سوا جو کہ مشہور ہے، ایک کمپنی باغ بھی ہے جو مہاراجہ شیو دھیان سنگھ نے حضور ڈیوک آف ایڈنبرا کی تشریف آوری کے زمانے میں تیار کرایا تھا۔ یہ بھی ایک عمدہ پارک ہے۔

اس کے سوا کیڈل گنج، شفاخانہ اور اسکول وغیرہ عمارتیں جو کیڈل صاحب کے عہد میں بنی ہیں نہایت عمدہ اور شہر کے لیے باعث زینت ہیں۔

ریاست الور کے پولیٹیکل حالات جس قدر ہم کو معلوم ہوئے ہیں اُن سے ریاست کی آئندہ بہبودی اور ترقی کی بہت کچھ امید ہوتی ہے۔

مہاراجہ منگل سنگھ جو تقریباً دو ڈھائی برس سے با اختیار ہوئے ہیں، ان کی تعریف میں صرف اس قدر لکھنا کافی ہے کہ نواب گورنر جنرل بہادر سابق جب سال گزشتہ کے ختم پر اجمیر تشریف لے گئے تو انھوں نے کالج کے طالب علموں سے خطاب کر کے ایک لمبی اسپیچ کی تھی جس میں مہاراجہ منگل سنگھ کی شہسواری، گولہ اندازی، بہادری، جفاکشی، شائستگی اور رسائی دماغی کی نہایت تعریف کر کے مخاطبین کو ان کی پیروی کرنے کی ہدایت فرمائی تھی۔

مہاراجہ نے اس قلیل زمانے میں جو دو ڈھائی برس سے زیادہ نہ ہوگا، کئی ایسے کام کیے ہیں جن کا ایک نوجوان ہندوستانی رئیس سے وقوع میں آنا نہایت عجیب معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے پہلے جنوبی ہندوستان کا ایک سفر اختیار کیا جس میں کسی قدر بحری سفر اور جزیرہ سیلون کی سیر بھی شامل تھی، اور بہت شوق سے اپنا سفرنامہ بھی تیار کرایا۔ پھر با اختیار ہونے کے وقت خزانہ بالکل خالی تھا، بلکہ ریاست کسی قدر مقروض تھی، مگر اب سنا جاتا ہے کہ خزانے میں تقریباً سات آٹھ لاکھ روپیہ جمع ہے۔ ہر جمعرات کے دن ایک عام دربار مقرر کیا، جس میں تمام ریاست کے مستغیثوں کو اجازت دی گئی کہ خود مہاراجہ کے روبرو حاضر ہو کر عرض و معروض کریں اور معمولی دربار جو ہر روز تین گھنٹے سے چار گھنٹے تک رہتا ہے اور جس میں کونسل کی تجویزات اور فیصلے پیش ہوتے ہیں۔ یہ اس عام دربار کے علاوہ ہے۔ پولیس اور مال کا از سر نو انتظام کیا جس کی وجہ سے تقریباً پانچ سو روپیہ ماہوار کا اضافہ عملۂ پولیس اور عملۂ مال کی تنخواہوں میں کیا گیا۔ سررشتہ تعلیم میں بھی روز بروز ترقی ہوتی جاتی ہے۔

ایک بڑا اسکول شہر میں عام رعایا کی تعلیم کے لیے ہے جس میں انٹرنس تک پڑھائی ہوتی ہے۔

جو لڑکے یہاں سے انٹرنس پاس کرتے ہیں اُن کو وظیفہ دے کر کسی کالج میں بھیج دیا جاتا ہے۔ اگلے برس دو لڑکوں نے انٹرنس پاس کیا تھا وہ دونوں لڑکے اجمیر کے گورنمنٹ کالج میں ترقی تعلیم کے لیے بھیج دیے گئے اور آٹھ روپیہ ماہوار ان کا وظیفہ مقرر کیا گیا۔

اس کے سوا ایک اور اسکول شہر میں ہے جو خاص کر ٹھاکر اور سرداروں کی اولاد کے لیے مخصوص ہے۔ اس مدرسہ کی حالت ابھی تک اچھی نہیں ہے۔

علاقۂ الور کے دیہاتی مدارس کی ٹھیک تعداد ہم کو یاد نہیں رہی لیکن غالباً سو سے زیادہ اور ڈیڑھ سو سے کم ہے۔

چودہ مدرسے زنانے بھی ہیں جن میں ہندو مسلمان دونوں قوموں کی لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آرام طلبی اور سستی اور کاہلی جو ہندوستانی رئیسوں کی سرشت میں داخل ہے، وہ مہاراجہ کے مزاج میں مطلق نہیں ہے اور سادگی اور بے تکلفی ایسی ہے کہ یورپ میں بھی اس قدر نہیں دیکھی گئی البتہ شکار کا شوق جس قدر رہنا چاہیے اس سے کہیں زیادہ ہے۔ باقی تعیش، لہو و لعب اور مسکرات سے جہاں تک ہم نے سُنا بکلی نفرت ہے اور یہ تمام باتیں بشرطیکہ استقلال کے ساتھ ہمیشہ قائم رہیں ایسی ہیں جو انسانی ترقی کی اصل اصول ہیں۔

ہم جناب ماسٹر سری رام صاحب کے، جو مہاراجہ کے پرائیویٹ سکریٹری ہیں اور جناب ماسٹر کنج بہاری لال صاحب ہیڈ ماسٹر ہائی اسکول الور کے دل سے شکر گزار ہیں جن کی عنایت سے ہم نے الور کی خاطر خواہ سیر کی۔

پانچ روز الور میں ٹھہر کر ہم رمضان کی انتیسویں تاریخ دن کی ریل میں الور سے روانہ ہوئے اور شام کو دلّی میں پہنچ گئے۔

اخبار نویسی اور اس کے فرائض

(از اخبار رفیق ہند بابت اکتوبر ۱۹۲ء)

ایک شخص نے گدھوں کے سوداگر سے جاکر کہا:۔

"مجھ کو ایک ایسا گدھا مطلوب ہے جو نہ زیادہ چھوٹے قد کا ہو، نہ بہت بڑے قد کا جب رستہ صاف ہو تو اُچھلتا کودتا چلے، اور جب راستے میں بھیڑ ہو تو آہستہ قدم اُٹھائے نہ دیوار و در سے اڑتا چلے، نہ تنگ راستوں میں سوار کو لے کر گھس جائے۔ اگر چارہ کم دیا جائے تو صبر کرے اور پیٹ بھرا دیا جائے تو شکر کرے۔ جب اس پر سوار ہوں تو چالاک بن جائے، اور جب اُسے تھان پر باندھ دیں تو کان نہ ہلائے"

سوداگر نے جواب دیا:

"چند روز صبر کر۔ اگر خدا تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے قاضی شہر کو گدھا بنا دیا تو تیرا سوال پورا کر سکوں گا"

اگر آج کل کوئی کسی سے ایسا سوال کرے تو اُس کو قاضی کی جگہ اخبار نویس کا نام لینا چاہیے، کیونکہ قاضی میں صرف یہ دو صفتیں ہونی ضرور ہیں۔

ا۔ اس قانون کی واقفیت جس کی رو سے وہ فیصلے کرتا ہے۔

ب۔ انصاف۔

برخلاف اخبار نویس کے اپنے فرائض کی بجا آوری کے لیے بے شمار لیاقتوں کی ضرورت ہے۔ ہمارے نزدیک کسی شخص کی نسبت یہ کہنا کہ "وہ اخبار نویسی کی پوری لیاقت رکھتا ہے" گویا اس امر کو تسلیم کر لینا ہے کہ "اس کی ذات میں ہر قسم کی لیاقت اور فضیلت موجود ہے"

اخبار نویس قطع نظر اس کے کہ قوم کا ناصح، ملک کا وکیل اور گورنمنٹ کا مشیر ہوتا ہے۔ وہ ایک قسم کا تاجر بھی ہے جس کو کم از کم مصارف اخبار اور اپنے حوائج ضروریہ کے لیے اپنی محنت کا معاوضہ ملک سے وصول کرنا پڑتا ہے۔ پس جس طرح آزادی، انصاف، اور

دیانت اس کی ذات میں ہونی ضروری ہے ۔ اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ اس کے انداز بیان اور طرز تحریر میں ایک قوت مقناطیسی کا ہونا بھی ضروری ہے جس سے وہ پبلک کے دلوں میں فتح حاصل کر سکے ۔

مگر جہاں پبلک کے عام مذاق صحیح نہ ہوں ، جہاں ظرافت اور مسخرگی اور استہزا واقعات اور حقائق سے زیادہ مرغوب ہوں ، جہاں معزز اور شریف لوگوں پر پھبتیاں کہنا داخل حسن بیان سمجھا جائے ، جہاں گورنمنٹ پر بیجا اور اندھا دھند نکتہ چینی کرنے کا نام آزادی رکھا جائے وہاں باوجود آزادی و انصاف و دیانت کے پبلک کے دلوں کو مسخر کرنا قریب ناممکن کے معلوم ہوتا ہے ۔

ہندوستان کے دیسی اخباروں کی عام حالت کیا گورنمنٹ کے نزدیک اور کیا ملک کے لائق آدمیوں کے نزدیک اب تک بہت بری سمجھی جاتی ہے ۔

لیکن جس طرح کسی بستی میں زیادہ تر بوسیدہ اور شکستہ مکانوں اور کھنڈروں کا ہونا اس بستی کے افلاس پر دلالت کرتا ہے یا کسی ملک کی شاعری میں زیادہ تر ہزل اور جھوٹ اور بے تہذیبی کا پایا جانا اس ملک کے مذاق فاسد پر گواہی دیتا ہے ، اسی طرح اخباروں کا بری حالت میں ہونا اخبار نویسوں کی بے سلیقگی کی نسبت زیادہ تر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ پبلک کا مذاق صحیح نہیں ہے ۔

بایں ہمہ اخبار نویسوں کو معذور نہیں سمجھا جا سکتا ۔ کیونکہ ان کا پہلا فرض یہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنی جادو بیانی سے پبلک کے مذاق کو اگر وہ فاسد ہے تو صحیح اور اگر صحیح ہے تو اعلیٰ درجہ کا صحیح بنا دیں ۔

اخبار کے پست حالت میں رہنے کے دو ہی سبب ہو سکتے ہیں یا تو یہ کہ اڈیٹر میں اخبار چلانے کی لیاقت نہیں ہے ، بلکہ اس نے صرف یہ دیکھ کر کہ بہت سے لوگ اخبار کے ذریعے سے آسودگی کے ساتھ بسر کرتے ہیں اخبار کو محض ایک حیلۂ معاش سمجھ کر جاری کر لیا ہے ۔

یا یہ کہ اڈیٹر میں کافی لیاقت موجود ہے مگر چونکہ پبلک کا مذاق صحیح نہیں ہے اس لیے وہ اپنی اصلی لیاقت کو کام میں نہیں لاتا بلکہ زمانے کے تیور دیکھتا رہتا ہے کہ لوگ کس بات کو پسند کرتے ہیں اور کس بات کو ناپسند ۔ اور جو طریقہ ان کے مذاق کے موافق ہوتا ہے اس کو اختیار کر لیتا ہے ۔

پہلی صورت میں سوا اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح ایک بدآواز مؤذن کو کچھ دے کر کے اذان سے روکا گیا تھا اسی طرح ایسے اڈیٹروں کے لیے لوگ چندہ کرکے کچھ تنخواہ اس شرط پر مقرر کر دیں کہ وہ مہربانی کرکے کبھی اخبار نہ نکالیں۔ کیونکہ انھوں نے اپنی طاقت کا اندازہ کرنے میں دھوکہ کھایا ہے اور اپنے لیے پیشہ انتخاب کرنے میں ویسی ہی غلطی کی ہے جیسے کوّے نے ہنس کی چال چلنے میں کی تھی۔

لیکن دوسری صورت میں اڈیٹر سخت الزام کے قابل ہیں۔ وہ باوجودیکہ قوم کے ناصح ہیں مگر اس کو گمراہ کرتے ہیں اور طبیب ہو کر لوگوں کو مہلک دوا دیتے ہیں۔ اُن کی مثال اُس طبیب کی سی ہے جو بیماروں کو دوا اور پرہیز اُن کی مرضی کے موافق بتاتا ہے اور ان کو خوش رکھنا چاہتا ہے نہ کہ تندرست کرنا۔

اس قسم کے اڈیٹروں کو (جن کی تعداد ملک میں بکثرت ہے) خوب یاد رکھنا چاہیے کہ معزز کاموں کا صلہ روپیہ اور دولت نہیں ہے۔ دیکھو ایک گویا جو اچھی طرح گاتا ہے، ایک تماشاگر جو عمدہ تماشا دکھاتا ہے، ایک خدمت گار جو ہوشیاری اور سلیقہ سے کام کرتا ہے ایک طوائف جو دلفریب طریقے سے گاتی ناچتی ہے، ایک مسخرہ جو اپنے مسخرے پن سے امیروں کو خوش کرتا ہے، یہ اور اس قسم کے تمام لوگ روپیہ کمانے میں علما، حکما اور اہلِ کمال سے بالعموم اچھے رہتے ہیں۔ پس اڈیٹر جو ملک کا وکیل اور گورنمنٹ کا مشیر ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اگر وہ بھی صرف روپیہ کمانے کے لیے اپنے اخبار کو پبلک کے مذاقِ فاسد کا تابع رکھنا چاہتا ہے تو وہ بھی مذکورۂ بالا اشخاص سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔

یہ سچ ہے کہ ہمارے ملک میں جو اشخاص اخبار نویسی کے فرائض پورے پورے ادا کرنا چاہے اس کو اول اول کسی قدر مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لیکن یاد رہے کہ سچی عزت جڑ کی طرح اندر ہی اندر پھیلتی ہے اور جھوٹی عزت پھولوں کی طرح جلد مرجھا کر خاک میں مل جاتی ہے۔ سچی عزت نیکی کا سایہ ہے جب تک نیکی باقی ہے عزت اس کے ساتھ ہے۔ جو لوگ اول قدم پر مقبول اور ہردلعزیز ہونا چاہتے ہیں وہ کبھی مقبول اور ہردلعزیز نہ ہوں گے۔ جن کاموں سے جلد فائدہ حاصل کرنے کی آرزو کی جاتی ہے ان کے فائدے قلیل اور ناپائدار ہوتے ہیں مگر جو کام

صبر اور استقلال کے ساتھ کئے جاتے ہیں اُن سے آخر کار وہ نتائج حاصل ہوتے ہیں جو کبھی وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔ کسی حکیم کا قول ہے کہ "قسمت جلد بازوں سے چیزوں کی قیمت ٹھوک بجا کر لیتی ہے مگر صبر کرنے والوں کو مفت دیتی ہے"۔

جو لوگ اخبار نویسی کی عمدہ لیاقت رکھتے ہیں وہ ہندوستان کے دیسی اخباروں میں بہت آسانی سے فوقیت اور امتیاز حاصل کر سکتے ہیں بخلاف انگلستان کے کہ وہاں سب سے اعلیٰ اور افضل اخبار نکالنا بظاہر امکان سے خارج معلوم ہوتا ہے۔ ایک ایسے شخص کے لیے جو اڈیٹر کی عمدہ لیاقت رکھتا ہو۔ ہندوستان کے عام اخباروں کا پست حال میں ہونا بہت نیک فال ہے۔ مثل مشہور ہے کہ "جہاں کوئی بُرا ہو نہ ہو وہاں اچھا کوئی نہیں ہو سکتا" بخلاف اس کے جہاں بُرے ہی بُرے ہوں یا بُرے اچھوں سے زیادہ، وہاں اچھا بن جانا بہت آسان ہے اسپارٹا والے سب بہادر تھے، اس لیے وہاں کسی کی بہادری کی تعریف نہ ہوتی تھی لیکن اگر بنگال میں کوئی بنگالی شخص سپہگری کے فن میں کمال بہم پہنچائے تو وہ تمام قوم میں سر آوردہ ہو سکتا ہے۔

ایک لائق اخبار نویس کے فرائض

اگر ہندوستان میں کوئی شخص اخبار نویسی کے فن میں اصلی اور حقیقی ترقی کرنی چاہے تو:

اپنی جنرل انفورمیشن (معلومات عامہ) کو وسعت دے۔

اپنی طرز تحریر میں اعتدال پیدا کرے۔

مدح و ستائش میں مبالغہ کو کام نہ فرمائے۔

نکتہ چینی میں خیر خواہی اور سنجیدگی کو ہاتھ سے نہ دے۔

جب تک کسی معاملے کے تمام پہلو اُس کی نظر میں نہ ہوں تب تک اس پر رائے دینے میں جرأت اور جلدی نہ کرے۔

جب تک خبر کسی معتبر ذریعے سے نہ پہنچے اس وقت تک اُسے شائع نہ کرے۔

ظرافت قدر ضرورت سے زیادہ کام میں نہ آئے۔

مُلّایانہ اور طالب علمانہ بحثوں میں نہ پڑے۔

مذہبی مباحث میں نہایت ضرورت کے بغیر دخل نہ دے۔
ملک میں جو اچھے کام کرتے ہیں ان کو چمکائے اور جن سے کوئی بُرا کام سرزد ہو اُن سے تابمقدور چشم پوشی کرے۔
جن کی بُرائیوں سے ملک یا سوسائٹی کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو اُن پر آزادانہ گرفت کرے۔
تحریر میں سادگی، متانت اور جامعیت اختیار کرے۔
کارسپانڈنٹوں (نامہ نگاروں) کی دل آزار تحریروں سے جو ان کی ذاتی اغراض پر مبنی ہوں، اپنے اخبار کو پاک رکھے۔
اخبار کی کتابت، چھپائی اور صحت کا نہایت کوشش اور توجہ سے خیال رکھے۔
اس امر کا خاص اہتمام رکھے کہ اخبار بالکل تاریخ معین اور وقت مقررہ پر شائع ہوا کرے۔
گورنمنٹ اور حکام کی نسبت جو کچھ لکھے اس میں ادب اور تعظیم کو نصب العین رکھے۔
غرض کہ کوئی فرض اپنے فرائض میں سے تابمقدور فروگذاشت نہ کرے اور کوئی بات اپنے کانشنس (ضمیر) اور انصاف و دیانت اور آزادی کے برخلاف نہ لکھے۔
ایسا شخص جو ان تمام باتوں پر جو بیان ہوئیں پورے طور پر عمل پیرا ہو اُس کی نسبت امید کی جا سکتی ہے کہ وہ کبھی نہ کبھی اپنے ہم عصروں اور ہم پیشہ اشخاص میں ممتاز ہو گا۔

جو مختصر فرائض ہم نے اخبار نویسی کے اوپر بیان کئے شاید کوئی یہ سمجھے کہ اتنے فرائض ایک اکیلے آدمی سے کیونکر ادا ہو سکتے ہیں لیکن ان سب کا اصل اصول راستی اور سچائی۔ اور یہ ایسا صاف سیدھا، پُرامن اور بے خطر رستہ ہے جو نہایت آسانی سے بے زحمت مشقت طے ہوتا ہے اور کبھی منزلِ مقصود پر پہنچانے میں خطا نہیں کرتا۔ جس طرح ایک جھوٹ کے ترک کرنے سے تمام گناہ خود بخود ترک ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح کسی پیشہ میں راستبازی اور سچائی اختیار کرنے سے اس پیشہ کے تمام فرائض خود بخود ادا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ راستی ایک سیدھی راہ ہے جس پر راہ گیر آنکھ بند کر کے چل سکتا ہے اور منزلِ مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔ لیکن جہاں اُس سے بہکا پھر جتنا آگے بڑھتا جائے گا اتنا ہی منزل سے دُور ہوتا جائے گا۔

۱۴۱۔ موت کے یقین سے ہم کو کیا سبق لینا چاہئیے؟

(از علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ بابت ۱۸۹۳ء ص ۹۲۲)

بے شک ہر شخص کو جس طرح اپنے ہونے کا یقین ہے اسی طرح اس بات کا بھی یقین ہے کہ ایک دن ہم نہ ہوں گے۔

مگر سوال یہ ہے کہ اس پچھلے یقین سے ہم کو کیا سبق لینا چاہیئے۔؟

کیا یہ سبق کہ تمام دنیا کو مع اپنی ہستی کے ناپائدار سمجھ کر جیتے جی مر جائیں اور خاک ہونے سے پہلے خاک ہو جائیں۔

یا یہ نصیحت کہ اس ناگزیر وقت کے آنے سے پہلے جس قدر مہلت ملے اس کو غنیمت سمجھ کر کچھ ہاتھ پاؤں ہلائیں اور خدا کی اس نعمت عظمیٰ سے جہاں تک ہو سکے آپ بھی فائدہ اٹھائیں اور اپنے ہم جنسوں کو بھی فائدہ پہنچائیں۔

ا۔ صوفیا اور صوفی منش شعراء کا بیان

"دنیا گزشتنی اور گزاشتنی ہے"

صوفیا اور شعرائے متصوفین نے پہلی بات پر حد سے زیادہ زور دیا ہے اور درحقیقت ایک ایسی شق اختیار کی ہے جس کو خواہی نخواہی ماننا پڑتا ہے۔ وہ کہتے ہیں :۔

"دنیا اور دنیا کے سب کام ہیچ ہیں۔ بادشاہ اور فقیر، محل اور جھونپڑے سب گذشتنی اور گذاشتنی ہیں۔ دنیا ایک رہ گذر ہے اور ہم سب اس کے رہ گزری ہیں مسافر کو چاہیئے کہ ہر وقت منزل سے لو لگائے رکھے اور رستہ کی دلفریب فضا کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے۔ جب سرے سے دنیا ہی ہیچ در ہیچ ہے تو دنیا سے دل لگانا کیا؟ اور دنیوی ترقیات کے لیے دوڑ دھوپ کرنی کیسی؟ ایک بلند نظر سوداگر

اپنے دل میں طرح طرح کے منصوبے باندھتا ہے کہ ہندوستان سے نیل اور روئی بھر کر یورپ کو لے جاؤں گا اور وہاں سے کپڑا اور شیشہ کی چیزیں لے کر پھر ایشیا میں آؤں گا۔ ایران سے قالین خریدوں گا، اور چین میں جا کر بیچوں گا۔ چین سے پھر چائے بھروں گا اور عرب میں جا کر فروخت کروں گا۔ پھر وہاں سے مغرب میں جاؤں گا۔ اور مغرب سے پھر مشرق چلا آؤں گا۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ ابھی ایک سفر بھی پورا نہیں کر چکتا کہ موت کا پیغام آن پہنچتا ہے اور اس کے تمام منصوبوں کو خاک میں ملا دیتا ہے جب کہ دنیا اور دنیا کی ہر چیز ناپائدار ہے تو انسان کو چاہیے کہ ہر دم مرنے کے لیے تیار رہے اور اس تمام نمود بے وجود کو ایک خواب کی سی نمائش کا سا دھوکا سمجھے مال و دولت، زن و فرزند، باغ اور زمین سب چیزوں سے دست بردار ہو کر زادِ آخرت کی فکر کرے اور بہ قدر سدِ رمق کھانے اور پہننے کے سوا دنیا کی کسی چیز کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔"

بڑے بڑے حکیموں اور عارفوں نے اس امر پر اس قدر دلائل اور براہین قائم کی ہیں کہ حصر اور شمار سے باہر ہیں اور صوفی منش شاعروں کو یہ ایک ایسا دلچسپ مضمون ہاتھ لگا ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری کی بنیاد زیادہ تر اسی پر قائم کی ہے۔

مگر افسوس ہے کہ یہ نصیحت جیسی دلکش اور دلفریب ہے ویسی قابل عمل نہیں۔ اگر بفرض محال تمام انسان اس نصیحت پر کاربند ہوں تو دنیا بالکل اُجڑ جائے۔ اور دنیا کے سارے کاروبار درہم برہم ہو جائیں۔ شجاعت اور ہمت، عقل اور تدبیر، محنت اور جفاکشی، عدالت اور سیاست، غرضکہ وہ سب صفتیں جو انسان کو انتظام معاش کے لیے عطا ہوئی ہیں یک قلم معطل اور بیکار ہو جائیں اور انسان کے لیے کوئی استحقاق خلیفۃ اللہ بننے کا باقی نہ رہے۔

۲۔ حکما اور فلاسفروں کے خیالات

موت کا یقین ہمیں کیوں دیا گیا

پس ظاہر ہے کہ موت کا یقین ہم کو اس لیے نہیں دیا گیا کہ ہر وقت دنیا کی بے ثباتی اور ناپائداری کے خیال میں مستغرق رہ کر زندگی سے دل سرد کرلیں اور تمام تعلقات سے بالکل دست بردار ہوجائیں۔ موت کے انتظار میں دولتِ حیات کے فائدوں سے محروم رہیں اور جوہرِ انسانیت سے جو خدا کا بیش بہا عطیہ ہے، جیتے جی ہاتھ دھو کر بیٹھ رہیں، بلکہ اس لیے دیا گیا ہے کہ اس فانی زندگی کو غنیمت جانیں اور دنیا کو مزرعۂ آخرت سمجھ کر وہاں کے لیے جو کچھ بن آئے سو کریں اور یہ سمجھیں کہ شہر پر غنیم کی فوج دھاوا کرنے والی ہے تھوڑی سی دیر میں بیٹا باپ سے اور باپ بیٹے سے اور بھائی بھائی سے جدا ہوا چاہتا ہے۔ گھر میں اسباب نقد وجنس جو کچھ ہے کوئی دم میں تاخت وتاراج ہونے والا ہے۔ لوگ اونٹ اور چھکڑوں پر اثاثا لبیت لاد لاد کر جہاں کہیں محفوظ جگہ سنتے ہیں چلے جاتے ہیں۔ کوئی قرضداروں سے اپنا قرضہ وصول کر رہا ہے تاکہ بھاگڑ کے وقت رستہ کا سہارا ہوجائے۔ کوئی زیور اور روپیہ زمین میں دفن کر رہا ہے تاکہ شاید غارت گروں کی دست برد سے بچ جائے۔ اسی طرح ہر شخص اپنے اپنے کام میں مصروف ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ ایسے نازک وقت میں ذرا بھی غفلت ہوئی تو بچاؤ کی کوئی صورت باقی نہ رہے گی، جان اور مال دونوں خطرے میں پڑ جائیں گے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے کہ:

"ہم نے موت اور زندگی کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ دیکھیں کون اچھے کام کرتا ہے۔"

اگر موت اس لیے پیدا ہوتی کہ سب کے دل دنیا اور مافیہا سے سرد ہوجائیں تو یوں ارشاد نہ ہوتا بلکہ یوں ہوتا کہ:

"دیکھیں کون دنیا کے کاروبار چھوڑ کر الگ ہوجاتا ہے۔"

آنحضرت صلعم فرماتے ہیں کہ:

"دنیا میں ایسے رہو جیسے غریب الوطن یا راہ رو۔"

اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ہر وقت ہوشیار اور اپنے کام میں سرگرم رہنا چاہیے کیونکہ مقیم کی نسبت پردیسی یا راہ گیر زیادہ خبردار اور چوکنا رہتا ہے۔

اچھے کاموں سے جن کی تحریک کے لئے موت کا کھٹکا لگایا گیا ہے۔ صرف حقوق الٰہی مثلاً نماز، روزہ، حج، عمرہ اور طواف وغیرہ ہی مراد نہیں ہیں، بلکہ حقوقِ عباد ان سے زیادہ ضروری اور اہم ہیں۔

ہر درجہ کے آدمیوں کے فرائض مختلف ہوتے ہیں

ہر فرقہ اور گروہ کو اس کے مرتبہ اور درجے کے موافق تکلیف دی گئی ہے جس پر اُن سے بازپرس کی جائے گی۔

انبیاء پر نماز اور روزہ کی ایسی تاکید نہیں کی گئی جیسی تبلیغ رسالت کے باب میں کی گئی ہے اور حاکموں کے لیے عدل اور مخلوق کی فریادرسی کو سب عبادتوں سے افضل قرار دیا گیا ہے۔

دولت مندوں کو سب سے زیادہ اس بات کی تاکید ہے کہ اپنے تہی دست بے سرمایہ ہم جنسوں کی مدد کریں۔

علماء کا بڑا فرض یہ ہے کہ بنی نوع میں سے جہالت کو دور کریں اور جاہلوں کو راہِ راست دکھائیں۔

اطبّاء کا بڑا فرض یہ ہے کہ بیماروں کی خبر لیں

عیال داروں کا سب سے زیادہ ضروری کام یہ ہے کہ وجہِ حلال سے کمائی کر کے اپنے عیال کی ضروریات کو رفع کریں۔

پس دنیا میں جو کام ہو رہے ہیں، صنعت ہو یا تجارت، نوکری ہو یا حرفہ، بہاررانی ہو یا قلبہ رانی۔ غرض تمام کام بشرطیکہ قانونِ عقل اور قانونِ شریعت سے متجاوز نہ ہوں، گو بظاہر دنیا کے حقیر اور فانی کام سمجھے جائیں، مگر درحقیقت وہ ایسے ضروری فرائض ہیں کہ جب تک انسان، انسان ہے کسی طرح اُن سے سبک دوش نہیں ہو سکتا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ موت کا کھٹکا اس لئے لگایا گیا ہے کہ ہر فرقہ اور ہر جماعت اپنے فرائض مستعدی اور سرگرمی سے سرانجام کرنے

میں مصروف رہے۔

رباعی

دم لینے کی فرصت کوئی کب پاتا ہے
آتا ہے اگر آج تو کل جاتا ہے
جو کرتے ہیں کام ان کو جاری بگتاد
طلبی کا پیام وہ چلا آتا ہے

دُنیا کی کَل علم سے چلتی ہے یا عمل سے

(رسالہ تہذیب الاخلاق جلد ۱ نمبر ۱۔ بابت یکم شوال ۱۳۱۱ھ ص ۵ تا ۱)

یہاں علم سے ہماری مُراد مجرد علم ہے جو عمل سے بالکل خالی ہو، اور عمل سے مُراد محض عمل ہے جس میں علم کو کچھ دخل نہ ہو۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ دُنیا کی کَل علم سے چلتی ہے یا عمل سے ؟

اگر ہم کو یہ بات دریافت کرنا ہو کہ چراغ کی بتی کا اشتعال اوکسیجن سے قائم رہتا ہے یا ہائیڈروجن سے۔ یا دونوں سے، تو ہم کو چاہیئے کہ ایک دفعہ بتی کو محض اوکسیجن میں اور دوسری دفعہ ہائیڈروجن میں رکھ کر دیکھیں۔ اگر دونوں میں بجھ جائے تو سمجھنا چاہیئے کہ ہوا کے دونوں جذوں کو اُس کے اشتعال میں دخل ہے۔ اور اگر ہائیڈروجن میں بجھ جائے اور اوکسیجن میں نہ بجھے تو جاننا چاہیے کہ اس کے اشتعال کا باعث محض اوکسیجن ہے نہ کہ ہائیڈروجن۔

اسی طرح اگر ہم یہ دیکھنا چاہیں کہ دنیا کی کل علم سے چلتی ہے یا عمل سے تو ہم کو چاہیئے کہ اول ایک ایسا ملک فرض کریں جس میں اہلِ علم و اہلِ نظر کے سوا کوئی کام کرنے والا اور ہاتھ پاؤں ہلانے والا نہ ہو اور پھر دیکھیں کہ وہ ملک کتنے دن آباد رہتا ہے۔ پھر ایک دوسرا ملک فرض کریں جس میں اَن پڑھ محنتی مزدوروں کے سوا اہلِ علم کا نام ونشان نہ ہو اور پھر دیکھیں کہ وہ ملک آباد رہتا ہے یا نہیں ؟

اول ایک ایسا خطہ فرض کرتے ہیں جس کے باشندے جغرافیہ داں عالم، فلسفی، ریاضی داں مصنف، اور لیڈر (ORATOR)، شاعر اور بڑے بڑے فاضل ہیں، مگر ان میں کوئی خدا کا بندہ ایسا نظر نہیں آتا جو ان واجب التعظیم اپاہجوں کے کھانے، پینے، اوڑھنے پہننے اور لکھنے پڑھنے وغیرہ کا سامان مہیا کرے۔ اول کسی ملک میں بغیر کارکن جماعتوں کے ایسی آبادی کا وجود میں آنا ہی ناممکن ہے لیکن اگر بفرضِ محال کسی خطہ میں ایسی باشندوں کی کوئی آبادی چند روز کے لیے آباد ہو جائے تو اس کا انجام کیا ہوگا ؟ ممکن ہے کہ بعض کو مطالعہ کے

ذوق و شوق میں ایک آدھ روز بھوک پیاس نہ لگے۔ بعض کو کسی مشکل مسئلے کے حل ہو جانے کی خوشی میں ایک دو وقت کھانے کی کچھ پرواہ نہ رہے، یا بعض کسی مضمون کی دھن میں کچھ دیر تک خور و نوش کا خیال نہ آئے۔ مگر بہت جلد وہ آپ کو ایک ایسی مخلوق پائیں گے جو بھوکی ہے مگر کوئی اُس کا رزاق نہیں بنتی ہے مگر کوئی اس کا ستار نہیں۔ حاجتمند ہے مگر کوئی اس کا قاضی الحاجات نہیں۔ اب یا تو انھیں خود اپنے اعلیٰ اور اشرف ہاتھوں سے وہ تمام حقیر اور ذلیل کام سرانجام کرنے پڑیں گے جو عوام کالانعام کو کرنے چاہئیں، اور یا فوراً اس ملک سے ہجرت کر کے کسی ایسے خطہ میں جا کر رہنا پڑے گا جہاں ان کے لیے فرمانبردار بندے یا بندہ پرور خدا موجود ہو۔ دونوں حالتوں میں نتیجہ یہ نکلے گا کہ "دنیا کی کل محض علم سے نہیں چل سکتی"۔

اس کے بعد ہم ایک دوسرا ملک فرض کرتے ہیں جس کے تمام باشندے اَن پڑھ اور بے علم ہیں مگر محنتی، جفاکش اور اپنی ضروریات زندگی کے مہیا کرنے میں نہایت سرگرم ہیں۔ گو انھوں نے زراعت یا تجارت یا صنعت و دستکاری کے اصول کتابوں میں نہیں پڑھے مگر وہ اپنی تمام ضروریات جن پر انسان کی زندگی موقوف ہے خود مہیا کرتے ہیں۔ قدرتی خواہشیں اور نیچرل ضرورتیں ان کو جس طرح سکھاتی گئیں اور متواتر تجربوں سے جس قدر ان کی سمجھ بوجھ بڑھتی گئی وہ اپنے تمام کام برابر سرانجام کرتے رہے۔ بونا، جوتنا، بیج بونا اور صنعت اور دستکاری غرضیکہ تمام اہم اور ضروری کام رفتہ رفتہ بقدر ضرورت انجام دینے لگے اب اُن کی کوئی ضرورت مند نہیں رہتی اور کوئی کام اٹکا نہیں رہتا۔ ایک اناج پیدا کر کے لاتا ہے، دوسرا پیستا ہے تیسرا پکاتا ہے اور تینوں مل کر کھاتے ہیں۔ ایک کپاس بوتا ہے، دوسرا اسے کاتتا ہے، تیسرا بنتا ہے۔ چوتھا سیتا ہے اور چاروں مل کر پہنتے ہیں۔ ان کو چوری یا ڈکیتی کا مطلق خوف نہیں کیونکہ اُن کے پاس اپنے ہاتھ پاؤں کی محنت کے سوا کوئی دولت نہیں، اُن کو غنیم کے حملہ کا کچھ ڈر نہیں، کیونکہ وہ اپنے ہاتھ پاؤں سے جو کس ہیں غنیم کے مقابلے کے لیے مستعد اور تیار ہیں۔ ان میں کوئی بدکار اور بدچلن نہیں کیونکہ ان کو اپنے کام دھندوں میں بدکاری اور بدچلنی کی فرصت ہی نہیں۔ ان میں کوئی روگی اور بیمار نہیں۔ کیونکہ ان میں کوئی طبیب یا ڈاکٹر

نہیں۔ ان میں کوئی مذہبی تکرار نہیں کیونکہ ان میں کوئی واعظ یا ملا نہیں۔ ان میں کوئی پولیٹیکل اختلاف نہیں۔ کیونکہ وہ سب کنسرویٹو (CONSERVATIVE) ہیں۔ ان میں کوئی عدالتی جھگڑا نہیں کیونکہ ان میں کوئی اور بیرسٹر نہیں۔ اُن میں اس کے سوا کوئی عیب نہیں کہ وہ سویلائزڈ (مہذب و تعلیم یافتہ) نہیں۔ اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ دُنیا کی کَل عمل سے چلتی ہے نہ علم سے۔

اب فرض کرو کہ اس ملک کے باشندوں کا میل جول کسی ایسے ملک والوں سے ہو گیا جن کے تمام کام علمی اصولوں پر مبنی ہیں انھوں نے زراعت تجارت، صنعت و دستکاری اور تمام جنگی اور ملکی مہمات میں علم ہی کو اپنا رہبر بنایا ہے۔ کیا معمار اور کیا بڑھئی، کیا لوہار کیا کمہار، کیا درزی اور کیا کفش دوز غرضکہ تمام پیشہ ور محض علم کی ہدایت سے اپنے تمام کام سرانجام کرتے ہیں۔

اس قسم کی باعلم و عمل قوم کے میل جول اور لین دین نے اس آباد ملک کے اَن پڑھ باشندوں کو سخت نقصان پہنچایا۔ ان کی تجارت اُن کے اخراجات زندگی حد سے زیادہ بڑھ گئے ان کی صنعت کے مقابلے میں ان کی صنعت ماند ہو گئی۔ اُن کی دستکاری کو اینڈ کر دیا مگر ایک مدت تک ان کو اس بات کی مطلق خبر نہ ہوئی کہ ہمارے پیشہ ور کیوں بیکار ہو گئے؟ ہماری کمائیوں میں کیوں برکت نہ رہی؟ ہمارے اخراجات روز بروز کیوں بڑھتے جاتے ہیں؟ اور ہماری آمدنی ہمارے اخراجات کو کیوں مکتفی نہیں ہوتی؟

لیکن اس غیر قوم سے جوں جوں میل جول بڑھتا گیا اُن کو اِن کی اور اِن کو اُن کی زبان سیکھنے کی ضرورت زیادہ ہوتی گئی۔ انھوں نے اول اُن کی زبان سیکھی پھر رفتہ رفتہ ان کے علم بھی سیکھنے لگے۔ جن علموں کے ذریعے سے انھوں نے ہر فن میں ترقی کی تھی وہ علم بھی انھوں نے حاصل کئے مگر سوائے رٹ لینے کے کوئی عملی فائدہ ان کے علموں سے نہ اُٹھایا۔ وہ علم کو عمل کی غرض سے سیکھتے تھے۔ انھوں نے علم کو محض علم کے واسطے سیکھا۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچ چکے تھے کہ علم آدمی کے لیے بنا ہے مگر یہ بمشکل ابھی یہیں تک پہنچے تھے کہ آدمی علم کے لئے بنا ہے۔ وہ علم سے خود بھی لذت اور فائدہ اُٹھاتے اور اپنے ملک اور قوم کو بھی اس کے فوائد پہنچاتے تھے

انھوں نے گونگے کی طرح گڑ نہیں کھایا اور کسی نے نہ جانا کہ کھٹا ہے یا میٹھا۔ وہ دنیا کی مختلف زبانیں اس لیے سیکھتے تھے کہ تمام میں پھرتے تھے۔ غیر ملکوں کے آدمیوں سے ملتے تھے۔ مختلف قوموں کے علوم و فنون سے آگاہی حاصل کرتے تھے اور اُن کو اپنی زبان میں نقل کرتے تھے۔ انھوں نے بھی ان کی دیکھا دیکھی غیر ملکوں کی زبانیں اور غیر قوموں کی بولیاں سیکھیں۔ مگر نہ اس لیے کہ غیر ملکوں میں سفر کریں اور غیر قوموں کے علوم و فنون اپنی زبان میں منتقل کریں بلکہ اس لیے کہ طوطے کی طرح کہیں "حق اللہ پاک ذات اللہ" اور کہیں "ست گورو دت داتا" بول اٹھیں۔ وہ لیمپ روشن کرنے کے لیے، میز لکھنے کے لیے، کرسی بیٹھنے کے لیے، گھنٹہ وقت دیکھنے کے لیے اور فرش بچھانے کے لیے خریدتے تھے۔ انھوں نے ان کی ریس سے یہ سب چیزیں فراہم تو کیں مگر نہ لیمپ جلایا، نہ میز پر لکھا، نہ کرسی پر بیٹھے، نہ گھنٹے میں وقت دیکھا اور نہ فرش کو بچھایا بلکہ کباڑی کی طرح سارا گھر اسباب سے بھر لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ علم کے ذوق و شوق میں انھوں نے ہاتھ پاؤں ہلانے بالکل چھوڑ دیے اور علم کا ادب ان کو دنیا کے ذلیل کاموں میں ہاتھ ڈالنے سے مانع ہوا۔ اب تاوقتیکہ وہ علم کو عمل کی غرض سے نہ پڑھیں اور اس سے عملی فائدے نہ اٹھائیں، تب تک ممکن نہیں کہ ان کی حالت درست ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ دنیا کی کل علم سے نہیں بلکہ عمل سے چلتی ہے۔

اس تمثیل سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ ہم کو علم کی ضرورت نہیں بلکہ ہم کو اس وقت علم کی نہایت ضرورت ہے اور ایسی ضرورت ہے جیسے پیاسے کو ٹھنڈے پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔

لیکن جس طرح ٹھنڈے پانی کی کلیاں کرنے سے پیاس نہیں بجھتی بلکہ اور زیادہ بھڑک اٹھتی ہے، اسی طرح سطحیوں کی مانند کتابوں کے الفاظ اور علوم کی اصطلاحات یاد کرنے سے اور طوطے کی طرح علمی مسائل اور قواعد ازبر کرنے سے کوئی شخص نہ آپ کو اور نہ ملک کو کوئی اصلی فائدہ نہیں پہنچا سکتا، بلکہ اندیشہ ہے کہ ایسے لوگ ملک کے حق میں مضر ثابت نہ ہوں۔

جس علم کی ہم کو ضرورت ہے وہ، وہ علم ہے جو ہماری ساکن اور پژمردہ قوتوں کو متحرک اور شگفتہ و شاداب کرے، نہ کہ وہ علم جو ہمارے متحرک اور شگفتہ قویٰ کو بھی ساکن اور پژمردہ کر دے ایسے علم سے بے علمی سو درجے بہتر ہے، بقول شخصے کہ "بخشو بی بلی چوہا لنڈورا ہی جیے گا"۔

۱۶۔ ہم جیتے ہیں یا مر گئے؟

(از رسالہ تہذیب الاخلاق جلد ا نمبر ۲۱ بابت یکم ذی الحجہ ۱۲۸۷ھ ص ۴۹ تا ۵۲)

عربی میں ایک مشہور مقولہ ہے کہ العمل من شان الاحیاء والبطالۃ من شان الاموات یعنی "کام کرنا زندوں کو شایاں ہے اور بیکار رہنا مُردوں کو" اس قول کے موافق ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ ہماری قوم میں کچھ جان باقی ہے یا نہیں؟ سچ ہے اگر مستثنیٰ مثالوں سے قطع نظر کی جائے تو نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہماری قوم میں کچھ جان باقی نہیں رہی اور بے اختیار یہ شعر زبان پر آتا ہے ؎

ایتہا النفس اجملی جزعا ان الذی تحذرین قد وقعا[1]

اس بات کے بیان کرنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے کہ ہر قوم کی ترقی کا مدار صرف اس بات پر ہے کہ اُس کے افراد میں عموماً مستعدی، محنت اور استقلال کے ساتھ کام کرنے کی عادت پائی جائے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کسی خاندان، بلکہ قوم میں اگر ایک شخص بھی ایسا پیدا ہو جاتا ہے جس میں یہ صفات موجود ہوں تو اس کی ذات سے تمام خاندان بلکہ تمام قوم کو فائدہ پہنچتا ہے۔ پس جس قوم کے افراد میں عموماً یہ خصلتیں پائی جائیں گی ممکن نہیں کہ وہ قوم اپنی بساط کے موافق ترقی میں کوئی ممتاز درجہ حاصل نہ کرے۔ لیکن جہاں تک کہ ہم اپنی قوم کی حالت پر غور کرتے ہیں اس میں چاروں طرف ہم کو ایک سناٹا نظر آتا ہے اور وہ اسلام جو بحرِ قلزم کی طرح موجیں مارتا ہوا اٹھا تھا آج بحرِ منجمد کی طرح ساکن اور بے حس و حرکت معلوم ہوتا ہے۔

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
اب ہوئے خاک انتہا یہ ہے

ترقی کی پہلی سیڑھی اپنے تنزل کا یقین ہے کہ امن و آزادی ترقی کے دو بڑے معاون اور

---

[1] یعنی اے دل اپنی بیقراری کو کم کر کیونکہ جس بات کا تجھ کو ڈر تھا وہ تو ہو چکی۔

میں ہم کو اس تنزل کا پختہ یقین ہو گیا ہے۔

امن و آزادی جو برٹش حکومت کی بدولت ہم کو اس زمانے میں حاصل ہے وہ کبھی عہد اور کسی دَور میں ہندوستان کو نصیب نہیں ہوئی۔

ترقی کے نمونے بھی اپنے ہم وطنوں میں ہم رات دن اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔

ترقی کی قابلیت بھی ہم میں اسی قدر ہے یا ہونی چاہیے جس قدر کہ ہندوستان کو اعلیٰ سے اعلیٰ قوم کو قدرت نے عطا کی ہے۔

باوجود ان تمام باتوں کے ہم دیکھتے ہیں کہ ترقی کی روح ہم میں اب تک پیدا نہیں ہوئی ہم خوب جانتے ہیں کہ ہم کو کچھ کرنا چاہیے لیکن کچھ کرتے نہیں۔

ہم کو شدت سے بھوک لگی ہوئی ہے مگر چاہتے ہیں کہ کہیں سے پکا پکایا ہاتھ لگ جائے تو کھا لیں۔

ہم پیاس کے مارے مرے جاتے ہیں، مگر منتظر ہیں کہ کوئی خدا کا بندہ ہمارے حلق میں آکر پانی چوا جائے۔

ہم توکل کو اس لیے ضروری نہیں سمجھتے کہ اس میں خدا پر بھروسہ کرنا ہوتا ہے بلکہ اس لیے کہ توکل کی بدولت ہم کو ہاتھ پاؤں ہلانے نہیں پڑتے۔

ہم تدبیر کو اس لیے بے سود خیال نہیں کرتے کہ وہ تقدیر الٰہی کا مقابلہ نہیں کر سکتی بلکہ اس لیے کہ تقدیر کے حیلے سے کچھ کرنا نہیں پڑتا۔

ہم دنیا اور دنیا کے کاموں کو اکثر فانی اور حقیر بتاتے ہیں مگر نہ اس لیے کہ فی الحقیقت ہم دنیا کو ایسا ہی سمجھتے ہیں بلکہ صرف اس لیے کہ ہم کو ہاتھ پاؤں ہلانے نہ پڑیں۔

ہم اس حیلہ جو لومڑی کی طرح انگور کے خوشوں سے اس لیے ناک نہیں چڑھاتے کہ اُن کو کھٹا سمجھتے ہیں بلکہ اس لیے کہ ان کے توڑنے میں ہم کو دقت معلوم ہوتی ہے۔

ہم کہتے سب کچھ ہیں، مگر کرتے کچھ نہیں۔ ہماری حالت ہم کو جھٹلاتی ہے اور ہمارے افعال ہمارے قول کی تکذیب کرتے ہیں۔

ہم قدریہ اور جبریہ دونوں فرقوں کو گمراہ بتاتے ہیں مگر ہم خود قدری بھی ہیں اور جبری بھی۔

ہمارے دعوے قدریوں کے سے ہیں اور ہمارے کام جبریوں جیسے، ہماری زبان قدری ہے اور ہمارا دل جبری۔

مسلمانوں میں قوتِ عملی کا فقدان اور اسکی چند مثالیں

اگرچہ ہم میں لائق آدمیوں کا قحط ہے تاہم کم وبیش مصنف، لکچرار اور شاعر ہم میں موجود ہیں۔ ہمارے مصنفین کو یہ شکایت ہے کہ پڑھنے والوں میں قوت منفعلہ نہیں اور پڑھنے والوں کو یہ شکایت ہے کہ مصنفوں میں قوت فاعلہ نہیں۔ ہمارے اسپیکر اور لیکچرار جب کچھ بولتے ہیں تو بعض اوقات ان میں قومی جوش کسی طرح کم نہیں معلوم ہوتا۔ ہمارے شاعر جب کچھ پڑھتے ہیں تو قومی ہمدردی اُن کے ایک ایک لفظ سے ٹپکتی ہے مگر فی الحقیقت ان کے کلام میں اور فونوگراف کی آواز میں کچھ فرق نہیں ہوتا۔ گویا ایک ہوا بھری ہوئی تھی جب وہ نکل گئی تو اب بالکل خالی ہے۔

ہماری قوم میں انگریزی تعلیم (جو پریکٹیکل آدمی [عملی کام کرنے والے اشخاص] پیدا کرنے کا دعوی کرتی ہے) چشم بد دُور روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور تعلیم یافتہ اصحاب کی تعداد میں ہر سال معقول اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ مُستثنیٰ صورتوں کے سوا عملی قوت اور سیلف ہلپ (اپنی مدد آپ کرنا) کا مادّہ ان میں تعلیم کے بعد اتنا بھی باقی نہیں رہتا جتنا کہ مدرسہ میں داخل ہوتے وقت وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔

ان میں سے ایک گروہ وہ ہے جس کی بڑی دوڑ بی۔ اے یا ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد یہ ہے کہ مڈل پاس کئے ہوئے طلبار کی طرح سرکاری نوکری کے لیے ادھر اُدھر سلسلہ جنبانی کرتا پھرے اور ذریعوں اور سفارشوں کی تلاش میں ایک مدت تک سرگرداں و پریشان رہیں۔ ان کو اپنے دست و بازو پر اتنا بھی بھروسہ نہیں ہوتا جتنا کہ چرندوں پرندوں کو اپنی قوتِ لایموت کی تلاش میں ہوتا ہے، وہ وجہ معاش کو غلامی یعنی نوکری ہی میں منحصر جانتے ہیں۔ ان میں ایک اور غریب اورنٹیل سکالر (عربی یا فارسی کے عالم) میں صرف اتنا ہی فرق ہوتا ہے کہ انھوں نے زمانے کی ضرورت کے موافق باقاعدہ غلامی کا پیشہ سیکھا ہے اور اس بیچارے نے نہیں سیکھا۔ ان میں سے جن کو سرکاری نوکری مل جاتی ہے ان کو چار و ناچار کتاب بالائے

طاق رکھنی پڑتی ہے اور لکھنے پڑھنے سے ہمیشہ کے لیے دست بردار ہونا پڑتا ہے۔ ان کی مثال بعینہٖ اس بدقسمت عربی گھوڑے کی سی ہے جس کو گھوڑ دوڑ کے لیے تیار کیا گیا ہو اور پھر بجائے گھوڑ دوڑ کے چھکڑے یا ہل میں جوتا گیا ہو۔

گروہ عالی ہمت گریجویٹ جو نوکری کو پسند نہیں کرتے یا نوکری اُن کو پسند نہیں کرتی ان کا حال پہلوں سے بھی گیا گزرا ہے۔ اگر وہ چھکڑے یا ہل میں جوت دیے جاتے تو کچھ کام بھی آتے لیکن اب وہ کسی کام کے نہیں۔ ان کی کوششیں اکثر بے مصرف ہوتی ہیں جن سے ان کو اور نہ کسی اور کو کچھ فائدہ پہنچتا ہے۔ اُن کو رومن ایمپائر (سلطنت روم) کی تمام ہسٹری اور اُس کے تنزل کے اسباب ازبر ہوتے ہیں۔ مگر ان کی ہستی کی مطلق خبر نہیں ہوتی۔ وہ یورپ کے مصنفوں موجدوں اور ریفارمروں کے کام نہایت فخر کے ساتھ بیان کرتے ہیں، لیکن سوائے اس کے کہ ان کے کارنامے بیان کر کے اپنی واقفیت کی داد چاہیں، خود کچھ نہیں کرتے اور نہ کر سکتے ہیں۔ وہ ہندوستانیوں کے حقوق جو گورنمنٹ کے ذمہ ہیں کمال ادب سے بیان کرتے ہیں، مگر اُن کے خاندان کے اور ان کی قوم کے حقوق جو خود اُن کے ذمہ ہیں ان پر کبھی غور نہیں کرتے۔ وہ گورنمنٹ کے انتظام پر نکتہ چینی کرنے میں آندھی ہیں مگر گھر کے انتظام سے محض بے پروا۔

ہمارے بہت سے نوجوان ولایت سے تعلیم پا کر آئے ہیں اور اُس پارس کی پتھری کو چھو آئے ہیں جو مس کو طلا کر دیتی ہے۔ وہ عمر کا ایک حصہ اس قوم میں بسر کر آئے ہیں جو حبّ وطن اور قومی ہمدردی کو اپنا دین اور ایمان سمجھتی ہے۔ انھوں نے برسوں اس ملک کی ہوا کھائی ہے جہاں انسان علم و عمل کے سائے میں پرورش پاتا ہے۔ مگر جب وہ مع الخیر ہندوستان میں پہنچتے ہیں تو اکثر کی حالت بعینہٖ اس شعر کی مصداق ہوتی ہے۔

مکہ گیا، مدینہ گیا، کربلا گیا
جیسا گیا تھا ویسا ہی چل پھر کے آ گیا

حبّ وطن اور قومی ہمدردی اُن میں اتنی بھی باقی نہیں رہتی جتنی کہ وہ یہاں سے اپنے ساتھ لے کر جہاز میں سوار ہوئے تھے۔ قوم سے ان کو نفرت ہو جاتی ہے اور ہندوستانی سوسائٹی میں شریک ہونے سے اُن کو شرم آنے لگتی ہے جس حقارت سے انگریز ہندوستانیوں

کو دیکھتے ہیں، وہ ان سے بھی زیادہ حقارت کی نگاہ سے اپنے ہم وطنوں کو دیکھنے لگتے ہیں۔ انگریز ان کو ہاف سویلائزڈ (نیم وحشی) کہتے ہیں تو وہ اُن کو ان سویلائزڈ (وحشیٔ مطلق) کا خطاب دیتے ہیں۔ وہ اپنی قوم کو ترقی اور اصلاح کے ناقابل بتاتے ہیں اور اس لیے اُن کی بھلائی کے لیے مطلق کوشش نہیں کرتے، بلکہ جو لوگ ایسے کاموں میں کوشش کرتے ہیں اُن کی کوششوں پر ہنستے ہیں اور ان کو بے سود خیال کرتے ہیں۔ یہ تمام شہادتیں اس بات کی ہیں کہ ہماری قوم میں عملی قوت باقی نہیں رہی۔

کبھی کبھی ہمارے بھائیوں کے دل میں ایک غیر معمولی جوش دودھ کے اُبال سے بھی زیادہ خود بخود اُٹھتا ہے۔

کبھی وہ اپنے چند ہم خیال آدمیوں کو متفق کرکے ایک انجمن محض قوم کی بھلائی کے لیے منعقد کرتے ہیں۔

کبھی مسلمانوں کی تعلیم کے لیے کوئی اسلامی یا انگریزی مدرسہ قائم کرتے ہیں۔

کبھی کوئی رسالہ یا اخبار محض قوم کے فائدے کی غرض سے جاری کرتے ہیں

اسی طرح کبھی ایک تدبیر یا کبھی دوسری تدبیر خاص قوم کی بھلائی کے لیے کرتے ہیں اور اکثر ان تدبیروں کے محرک جہاں تک ہم کو معلوم ہے فی الواقع نہایت خلوص اور صدقِ دل سے ان کاموں کو شروع کرتے ہیں اور ان کا یہ دلی ارادہ ہوتا ہے کہ تادمِ واپسیں ان کاموں میں کوشش کریں گے اور ان کو ترقی دیں گے۔ مگر درحقیقت اُن کی حرکت ایک حرکتِ مذبوحی ہوتی ہے۔ وہ ایک ہی دو جست کے بعد بالکل ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔ اُن کا کوئی منصوبہ (اِلا ماشاءاللہ) پورا نہیں ہوتا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ جو کچھ ہم کرنا چاہتے ہیں، وہ نہیں کرسکتے۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ ہم میں قوتِ عملی باقی نہیں رہی۔

ہم میں ہزاروں بلکہ لاکھوں ایسے سمجھ دار آدمی موجود ہیں جو پُرانی بیہودہ رسموں کو بُرا جانتے ہیں۔ شادی اور غمی میں جو بے دریغ روپیہ صرف ہوتا ہے اس کو محض فضول اور لغو بلکہ گناہ اور معصیت سمجھتے ہیں۔ جو لوگ ایسے موقعوں پر سودی روپیہ قرض لے کر خرچ کرتے ہیں اُن پر نہایت افسوس کے ساتھ ہاتھ ملتے ہیں، مگر جب ویسا ہی موقع خود ان کو پیش آتا ہے تو آنکھیں

بند کر کے اُسے اندھے کنوئیں میں آپ بھی کود پڑتے ہیں جس میں اوروں کو گرتے دیکھ کر افسوس کرتے تھے۔ اکثر لوگ لڑکیوں کی تعلیم کو نہایت ضروری سمجھتے ہیں اور دل سے اس بات کے خواہاں ہیں کہ ان کی تعلیم کا کسی مناسب اور قابل اطمینان طریقے سے رستہ نکلے۔ اس باب میں لوگوں کی ترغیب اور تحریص کے لیے کتابیں اور رسالے تصنیف کرتے اور اخباروں میں مضامین لکھتے ہیں مگر عملی طور پر کوئی کارروائی ان سے نہیں ہو سکتی اور زبانی جمع خرچ کے سوا وہ کوئی عملی کرشمہ نہیں دکھا سکتے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ عملی قوت ہم میں باقی نہیں رہی۔

ہم میں ہزاروں بلکہ لاکھوں ایسے ہیں جو تنگیٔ معاش کے سبب حیران و پریشان ہیں اور چاہتے ہیں کہ جس حیلے سے روٹی میسر آئے وہ طریقہ اختیار کریں۔

بعضے بیوپار کرتے یا دوکان کھول کر بیٹھتے ہیں، اگر اپنے پاس کافی سرمایہ نہیں ہوتا تو چند اور اشخاص کو بھی اپنے ساتھ شریک کر لیتے ہیں لیکن سوا ان لوگوں کے جو قدیم سے تجارت پیشہ ہیں، باقی سب ہمیشہ نقصان اُٹھاتے ہیں۔ دیوالہ نکالتے ہیں۔ مقروض ہوتے ہیں اور پھر کبھی بھول کر بیوپار یا دوکان کا نام نہیں لیتے۔ بعضے کھیتی میں قسمت آزمائی کرتے ہیں۔ بعضے صیغۂ تعمیرات سرکاری میں ٹھیکے لیتے ہیں۔ بعضے پریس جاری کرتے ہیں۔ بعضے اخبار نکالتے ہیں۔ مگر جہاں دیکھیے اخیر نتیجہ ہمیشہ ناکامی، خسارہ اور مایوسی ہوتی ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عملی قوت ہماری قوم میں باقی نہیں رہی۔

اگر کسی خاندان میں حسنِ اتفاق سے ایک کماؤ پیدا ہو جاتا ہے تو تمام خاندان اس کے سہارے بے فکرِ معاش سے فارغ البال ہو جاتا ہے۔ ایک کماتا ہے اور بیس کھاتے ہیں۔ ایک شکاری ہے اور بیس اس کے فضلہ خوار۔ وہ کماتے کماتے تھک جاتا ہے مگر یہ کھاتے کھاتے نہیں تھکتے۔ کھاتے ہیں اور غراتے ہیں، مرغی اپنی جان سے جاتی ہے اور کھانے والوں کو مزہ نہیں آتا۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ ہم میں قوتِ عمل باقی نہیں رہی۔

آٹھ برس سے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس مختلف شہروں میں صرف اس لیے ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی ترقی کی جو تدبیر کسی کے ذہن میں آئے، وہ اس مجمع عام

میں پیش کرے اور جو تجویز بعد بحث و مباحثہ کے اتفاق یا کثرت رائے صائب اور معقول قرار پائے اس سے عام مسلمانوں کو مطلع کیا جائے تاکہ جو باتیں ان کے کرنے کی ہوں ان کو عمل میں لائیں۔ لیکن آج تک کانفرنس کی ایک صلاح پر بھی غالباً کسی نے عمل نہیں کیا۔ بلکہ بجائے اس کے کہ خود اپنے دل میں شرمندہ ہوں اُلٹے کانفرنس کی کارروائیوں پر تعریض کرتے ہیں اور اس کو محض لغو اور بے سود بتاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ جس طرح ان میں قوت عمل باقی نہیں رہی، اسی طرح وہ اپنے فرائض کو بھی نہیں سمجھ سکتے اور مثل جمادات کے اپنے آپ کو کسی تکلیف کا مکلف نہیں جانتے۔

ہماری قوم میں جو اس قابل ہیں کہ ترقی و تنزل کے مفہوم کو سمجھتے ہیں اور اپنے میں اور دوسری ترقی یافتہ اقوام میں ان کو کم و بیش فرق محسوس ہوتا ہے وہ دو حال سے خالی نہیں۔ یا پرانے خیال والے ہیں یا نئے خیال والے۔ جو پرانے خیالات رکھتے ہیں اور قومی تنزل کے اخیر نتائج کا بخوبی اندازہ نہیں کر سکتے۔ وہ اس حیلے سے سعی و کوشش کو بے سود بتاتے ہیں کہ دنیاوی تنزل اور دنیوی ترقی سب ہیچ ہے۔ انجام دونوں کا فنا ہے۔ ہم کو صرف وہاں کی فکر کرنی چاہیئے جہاں ہمیشہ رہنا ہے اور بس۔

نئے خیال والے جو ترقی و تنزل کی ماہیت اور اس کے نتائج سے بخوبی واقف ہیں اور دیگر اقوام کی کوتی تنزل میں جو نسبت ہے اس کو سمجھے ہوئے ہیں، ان میں اکثر کا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ مسلمانوں کی قوم ہرگز ابھرنے والی نہیں۔ اس کا ضعف کسی ایسے مرض کے سبب نہیں ہے جو رداءت مادہ سے عارض ہوا ہو تاکہ اس کو قابلِ علاج سمجھا جائے بلکہ اس سبب سے ہے کہ اس میں حرارت غریزی باقی نہیں رہی اور اس لیے اس کو سنبھالنے کی کوشش کرنی محض بے فائدہ ہے۔

الغرض کیا پرانے خیال والے اور کیا نئے خیال والے دونوں عموماً سعی و کوشش کو عبث اور رائیگاں خیال کرتے ہیں پہلے اس لیے کہ ترقی ضروری نہیں اور پچھلے اس لیے کہ ترقی ممکن نہیں۔ اسی طرح ہمارے بعضے گروہ کچھ کر نہیں سکتے اور بعضے کچھ کرتے نہیں بہت بڑا ثبوت اس بات کا ہے کہ ہماری قوم میں عملی قوت باقی نہیں رہی۔

عملی قوت والوں سے وہ لوگ مراد نہیں ہیں جو محنت مزدوری اور پیشے یا حرفے کے ذریعے سے بُری بھلی طرح اپنا پیٹ پال لیتے ہیں۔ ایسے لوگ تو مُردہ سے مُردہ قوم میں بھی جب تک کہ اُس قوم کے تھوڑے بہت افراد دنیا میں موجود ہیں ضرور ہے کہ پائے جائیں کیونکہ ؎

این شکم بے ہنر پیچ پیچ
صبر ندارد کہ بسازد بہ ہیچ

نہیں، بلکہ وہ لوگ مراد ہیں جو زمانے کی رفتار کے موافق نہ صرف باتوں سے بلکہ کاموں سے قوم کے لیے خود نمونہ بن کر اُس کو ترقی کی طرف مائل کریں۔ مثلاً معاشرت میں جو خرابیاں اُن کو نظر آئیں، صرف ان کی بُرائی اور مذمت کرنے ہی پر اکتفا نہ کریں بلکہ خود ان کو ترک کر کے قوم کے لیے ایک مثال قائم کریں۔ معاش کے وہ جائز ذریعے قوم کی اکثر جماعتوں میں معیوب گنے جاتے ہیں جیسے دُکانداری یا صنعت و دستکاری۔ ان کو خود اختیار کر کے ان جماعتوں کی جھجک دور کریں۔ تجارت کے وہ اصول جن کے ذریعے سے کم مقدور آدمی بھی بڑی بڑی تجارتیں کر سکتے ہیں۔ اُن پر خود کاربند ہو کر قوم میں تجارت چرچا پھیلائیں۔ اسی طرح ترقی کی ہر شاخ میں خود کچھ کر کے دکھائیں تاکہ اور لوگ بھی ان کی دیکھا دیکھی وہی رستہ اختیار کریں جو ترقی کی جڑ ہے۔ اُس کی اشاعت میں دم سے، قدم سے، درم سے، قلم سے، غرض ہر طرح کوشش کریں۔

مختصر یہ ہے کہ تعلیم یافتہ نوجوان جن کو ترقی کا مقدمۃ الجیش کہنا چاہیے وہ اپنی اپنی قابلیت اور اپنے اپنے مذاق کے موافق ایسے کام اختیار کریں جو اولاً خود ان کے حق اور ثانیاً قوم اور ملک دونوں کے حق میں مفید ہوں

لیکن افسوس ہے کہ ایسے آدمی قوم میں نایاب ہیں اور اسی لیے ہم کو اس میں شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے قوائے محرکہ بالکل معطل اور بیکار ہو گئے ہیں۔ ہماری جرأت اور دلیری مفقود ہو گئی ہے۔ ہم میں ہمت اور اولوالعزمی کا نام و نشان نہیں رہا۔ ہم کہنے کو انسان ہیں لیکن جمادات سے بدتر۔ ہم بظاہر زندہ ہیں لیکن حقیقت میں مُردہ۔

پس ہماری قوم میں جن بزرگوں کو قومی ترقی کا خیال ہے اُن کو غور کرنا چاہیے کہ بعام

خاموشی اور سناٹا جو ہماری قوم میں ہر طرف نظر آتا ہے اور یہ مُردنی جو ہمارے تمام طبقوں پر چھائی ہوئی ہے آیا یہ محض ایک اتفاقی بات ہے جس کا کچھ فکر نہیں کرنا چاہئے بلکہ ایک دوسرے اتفاق کا منتظر رہنا چاہئے، جس سے تمام قوم کی حالت خودبخود بدل جائے؟ یا ایسا نہیں ہے۔ بلکہ یہ وبائے عام نہایت زبردست اور قوی اسباب سے تمام قوم میں پھیلی ہے اور جب تک کہ نہایت زبردست تدبیروں سے اس کا تدارک نہ کیا جائے اور آئندہ نسلوں کی تعلیم میں عملی تربیت کی روح نہ پھونکی جائے گی اُس وقت تک مسلمانوں میں قومی زندگی پیدا ہونی دشوار ہے۔

بالفعل ہم اس مضمون کو یہیں ختم کر دیتے ہیں لیکن آئندہ ہم بتائیں گے کہ مسلمانوں میں یہ سکون و انجماد کہاں سے آیا ہے؟ اور ان کے قوائے عملیہ کیوں معطل و بیکار ہو گئے ہیں؟ اس کے بعد ہم اپنی سمجھ کے موافق کسی موقع پر یہ بھی بیان کریں گے کہ وہ کونسی تدبیریں ہیں جن سے ہماری آئندہ نسلوں میں ایکٹوٹی (ACTIVITY) پیدا ہونے کی اُمید ہو اور ان کے قوائے عملیہ از سرِ نو شگفتہ و شاداب ہو سکیں۔

۱۷۔ حسب اور نسب

(از رسالہ تہذیب الاخلاق جلد ۱۔ نمبر ۴ بابت یکم محرم سنہ ۱۳۱۲ھ ص ۶۲ تا ۶۵)

مسلمانوں میں انسان کے خاندان کے متعلق اکثر یہ دو لفظ مستعمل ہوتے ہیں: ''حسب اور نسب''۔

نسب: آدمی کی اصل اور نژاد کو کہتے ہیں۔

حسب: ۔ اس شرف اور بزرگی کا نام ہے جو کسی شخص کی علمیت یا نبوت یا سلطنت یا دولت یا درویشی یا کسی اور فضیلت کے سبب اُس کے خاندان میں ہمیشہ یا چند پشتوں تک باقی رہے۔

پس نسب کے لحاظ سے جیسا کہ ظاہر ہے تمام بنی نوع انسان ایک درخت کی ڈالیاں یا ایک ڈالی کے پتے ہیں۔ ایک کو دوسرے پر کسی طرح کی فوقیت اور ترجیح نہیں ہے۔ امیر المومنین علی مرتضیٰ رضؓ فرماتے ہیں ؎

الناس من جهة التمثال اكفاء

ابوهم آدم والام حواء

یعنی "انسان باعتبار پیکر عنصری کے ایک دوسرے کے ہمسر ہیں۔ ان کا باپ آدمؑ ہے اور ماں حوّا"

پس جو کچھ تفوق اور بڑائی ایک دوسرے پر ہے وہ محض حسب کے لحاظ سے ہے نہ نسب کے لحاظ سے۔

اس بارہ میں کہ حسب کی بزرگی کتنے عرصے تک قائم رہتی ہے مشہور مورخ ابن خلدون[1]

---

[1] ابن خلدون مسلمانوں میں سب سے بڑا تاریخ دان گزرا ہے اُس کی مشہور معروف (باقی آئندہ صفحہ پر)

اپنی تاریخ کے مقدمے میں حسب ذیل رائے ظاہر کرتے ہیں :-

"حسب یعنی خاندانی شرافت اکثر چوتھی نسل میں زائل ہو جاتی ہے
کیونکہ جو شخص خاندان کا بانی ہوتا ہے اس کو خوب معلوم ہوتا ہے کہ میں نے
کیسی مشقتوں سے یہ عزت حاصل کی ہے۔ اس لیے وہ ان محاسن اور
خوبیوں کو جن کے ذریعے سے اس کو امتیاز حاصل ہوا ہے کبھی ہاتھ سے
نہیں جانے دیتا۔ پھر اس کا بیٹا جس نے باپ کا طریقہ دیکھا ہے، ان
محاسن اور خوبیوں کی قدر کرتا ہے جن سے باپ کو یہ مرتبہ حاصل ہوا تھا
وہ بھی اکثر باپ ہی کا طریقہ اختیار کرتا ہے مگر باپ اور بیٹے میں ایسا ہی
فرق رہتا ہے جیسا دیکھنے والے اور سننے والے میں ہوتا ہے گویا باپ
نے جو چیز آنکھوں سے دیکھی تھی، بیٹے نے اس کو کانوں سے سنا ہے
اب تیسری نسل آتی ہے اور محض تقلیداً باپ دادا کی ڈگر اختیار کرتی
ہے لیکن ابھی تک خاندانی عظمت کا طلسم ویسا ہی بندھا رہتا ہے ورنہ پھر
دادا اور پوتے کے طریقے میں کچھ فرق معلوم نہیں ہوتا مگر چوتھی نسل میں
وہ طلسم بالکل ٹوٹ جاتے ہیں یہ نسل باپ دادا کی خوبیوں کو بالکل ملیامیٹ
کر دیتی ہے اور یہ خیال کرتی ہے کہ ہمارے خاندان کی عزت کچھ ہمارے
بزرگوں کی کوشش اور اکتساب سے پیدا نہیں ہوئی، بلکہ ابتدائے آفرینش
سے یہ خاندان اسی طرح ممتاز چلا آیا ہے اور اس خاندان کا ذاتی خاصہ
ہی ہے کہ اوروں سے ممتاز ہے۔ اس خیال خام میں وہ بغیر اس کے کہ

نوٹ ص ۱۷۶ سے آگے

تالیف جس کا نام "کتاب العبر فی دیوان المبتدا والخبر" فن تاریخ میں بڑے پایہ کی کتاب مانی جاتی ہے اس تاریخ کا "مقدمہ" فلسفہ تاریخ کا بے مثل نمونہ ہے تونس (افریقہ) میں ۱۳۳۲ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۴۰۶ء میں ۷۶ سال کی عمر پاکر وفات پائی۔ اس نے اپنی بے نظیر کتاب میں اقوام عرب کی تاریخ اور بربریوں کے حالات ابتدا سے چودھویں صدی کے آخر تک کے بیان کئے ہیں۔ اہل علم کے نزدیک اس کی تاریخ نہایت مستند اور صحیح مانی جاتی ہے مگر تاریخ سے زیادہ اس کا "مقدمہ" قابل قدر ہے۔

تعظیم وتکریم کا استحقاق پیدا کریں۔ آپ کو اپنی قوم یا قبیلے سے بالاتر سمجھنے لگتے ہیں اور ان سے اپنی تعظیم وتکریم کے خواہاں ہوتے ہیں اور خوبیوں کو فراموش کر دیتے ہیں جن کے سبب سے اُن کے خاندان کی تعظیم وتکریم ہوتی تھی۔"

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:۔

"چوتھی پشت کی قید باعتبار اکثر کے لگائی گئی ہے ورنہ بعض گھرانے اس سے بھی پہلے بگڑ جاتے ہیں اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ پانچویں یا چھٹی پشت تک خاندان بنا رہتا ہے۔"

جس زمانے میں قاضی ابن خلدون نے یہ رائے قائم کی تھی، اس وقت گو مسلمانوں کی طاقتیں متفرق اور پراگندہ ہوگئی تھیں۔ مگر پھر بھی اُن میں بہت کچھ جان باقی تھی۔ جو خاندان ابھرتا تھا، اس کی ہوا چند پشتوں تک بندھی رہتی تھی۔ اگر کوئی خاندان دینی عظمت کی وجہ سے ممتاز ہوتا تھا اس کا احترام لوگوں کی خوش اعتقادی کے سبب کئی کئی پشتوں تک باقی رہتا تھا، جو خاندان دنیوی اعتبارات سے وجاہت پیدا کرتا تھا خود سلطنت اُس کی پشت و پناہ ہوتی تھی اور اس کی مراعات اور بزرگ داشت متعدد نسلوں تک جاری رہتی تھی۔ بایں ہمہ وتین پشت سے زیادہ کوئی خاندان مؤقر و محترم نہیں رہ سکتا تھا۔

جب اُس زمانے کا یہ حال تھا تو اس زمانے میں ہم مسلمان خاندانوں کی نسبت خاص کر ہندوستان میں کیا خیال کر سکتے ہیں۔ اول تو آج کل ہماری قوم میں کسی خاندان کا ابھرنا ایسا ہی خلاف قیاس معلوم ہوتا ہے جیسے سورج کی روشنی میں چھوٹے چھوٹے ستاروں کا نظر آنا لیکن اگر بر سبیل ندرت کسی خاندان کا کوئی ممبر کچھ امتیاز حاصل کر بھی لے تو وہ امتیاز اسی کی ذات تک محدود رہتا ہے۔ دینی عظمت کی توجہ سے تو فی زمانا کسی شخص کا مرجع خلائق بننا نہایت ہی مشکل ہے کیونکہ خوش اعتقادی روز بروز زمانے سے رخصت ہوتی جاتی ہے۔ اور اگر کوئی ایسی مثال پائی بھی جائے تو آپ کی مرجعیت بیٹے تک جب ہی منتقل ہو سکتی ہے جب کہ بیٹا فضل وکمال میں اگر باپ سے برتر یا افضل تر نہ ہو تو اس کی برابر ضرور رہو۔ دنیوی امتیاز کا اس زمانے میں یہ حال ہے کہ

ہر شخص کی عزت اور اعتبار کا اسی کی ذات پر خاتمہ ہو جاتا ہے جس گورنمنٹ کے ماتحت ہم ہیں، وہ کسی اعلیٰ خاندان کو ادنیٰ خاندان پر بغیر ذاتی استحقاق کے ترجیح نہیں دیتی۔ خود انگلستان میں ایک لارڈ کا بیٹا مقابلے کے امتحان میں ایک موچی کے لڑکے کے برابر سمجھا جاتا ہے اور سوائے اس کے کہ امتحان میں اُس سے سبقت لے جائے کسی طرح اس پر ترجیح حاصل نہیں کر سکتا جب انگلستان میں یہ حال ہے تو ایسی حالت میں ہندوستان کی نسبت کیا توقع کی جا سکتی ہے۔

پس آج کل کسی خاندان کا امتیاز بدون اس کے قائم نہیں رہ سکتا کہ ہر نسل اپنے سے پچھلی نسل کی تعلیم و تربیت میں جہاں تک ممکن ہو کوشش کرے اور اپنے بعد اس کو ایسی حالت میں چھوڑ جائے کہ زمانہ اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھے اور اس کی قدر کرے۔ نہ اس لیے کہ وہ بڑے باپ کی اولاد ہے، بلکہ اس لیے کہ وہ خود بڑائی کی مستحق ہے۔ اضافی خوبیوں کو ہمارے مقتداؤں نے ہمیشہ حقیر و ناچیز سمجھا ہے اور انسان کا کمال محض اُس کی کسبی اور ذاتی خوبیوں پر منحصر رکھا ہے۔ چنانچہ امیر المومنین علی مرتضیٰؑ فرماتے ہیں ؎

اِنَّ الفَتیٰ مَنْ یَقُوْلُ ھَا اَنَا ذَا
لَیْسَ الْفَتیٰ مَنْ یَقُوْلُ کَانَ اَبِیْ

یعنی "مرد وہ ہے جو کہے کہ میں ایسا ہوں، نہ وہ جو یہ کہے کہ میرا باپ ایسا تھا۔"

اکثر لوگ اس خیال سے کہ ہمارے بعد ہماری اولاد عزت و آبرو سے دنیا میں زندگی بسر کرے، اس کے واسطے جائداد خرید کر چھوڑ جاتے ہیں مگر ان کی تعلیم و تربیت کا کچھ خیال نہیں کرتے گویا وہ چاہتے ہیں کہ ہماری اولاد صرف نالائق ہی نہ رہے بلکہ بدچلنی میں بھی شہرۂ آفاق ہو۔ جہل اور جوانی اور اس کے ساتھ بے فکری، جہاں یہ تینوں چیزیں جمع ہو گئیں پھر خاندان کا اللہ ہی مالک ہے۔

۱۸۔ مسلمانوں میں عملی قوت کیوں نہیں رہی؟

(از محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج میگزین علی گڑھ جلد ۲ نمبر ۷ بابتہ جولائی ۱۸۹۵ء)

یہ بات مسلّم ہے کہ کہ مسلمانوں میں عملی قوت باقی نہیں رہی۔ یہاں ہم صرف اس قدر بیان کرنا چاہتے ہیں کہ عام خاموشی اور سنّاٹا جو ہماری قوم میں ہر طرف نظر آتا ہے اور مردنی جو ہمارے تمام طبقوں پر چھائی ہوئی ہے یہ کوئی اتفاقی بات نہیں ہے بلکہ ایسے زبردست قوی اسباب پر مبنی ہے جن کا اثر کسی خاص جماعت یا خاص فرقے پر محدود نہیں رہا بلکہ اس نے تمام قوم کے قوائے عملیہ کو معطل و بیکار کر دیا ہے

اکثر مسلمانوں کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ بالطبع کاہل اور سست ہیں اور ان کی کاہلی اور سستی کو اسلام کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ چنانچہ پنجاب کے ایک معزز افسر نے پنجاب کی مردم شماری کی رپورٹ میں لکھا تھا:

"پنجاب کے رہنے والوں پر مذہب اسلام اختیار کر لینا نہایت بُرا اثر پیدا کرتا ہے وہ ان کو مغرور اور مشیخت مآب بنا دیتا ہے۔ اُن کی طبیعت کو حق حلال اور ریاض کا لقمہ حاصل کرنے سے پھیر دیتا ہے۔ کیونکہ سستی اور کاہلی اور بناوٹ خاص اوصاف ہیں جو مسلمانوں میں پائے جاتے ہیں اور جن سے مسلمانوں اور ہندوؤں میں تمیز ہوتی ہے۔"

درحقیقت نہ مسلمان بالطبع کاہل اور سست ہیں اور نہ اسلام نے ان کو ایسا بنایا ہے، بلکہ یہ تمام کاہلی اور سستی اور یہ عام سکون و انجماد جو ہمارے رگ و پے میں سما گیا ہے۔ یہ وہ ترکہ ہے جو نہ صرف ہم کو بلکہ تمام ایشائی نسلوں کو ان کے آبا و اجداد کی میراث میں پہنچا ہے۔

ایشیائی طرز حکومت جو ایک طاقت کو اعتدال سے بڑھانے والی اور اس کے سوا تمام طاقتوں کو ملیا میٹ کرنے والی ہے۔ اس نے ایشیا کی کسی قوم میں جان باقی نہیں چھوڑی۔

خود مختار سلطنت میں عام اس سے کہ بادشاہ ظالم ہو یا منصف رعیت بعینہ
ایسی ہوتی ہے جیسے غسّال کے قبضہ میں میت۔ اس کو سوائے اس کے کہ مویشی اور چوپاؤں
کی مانند بُری یا بھلی طرح اپنا پیٹ بھر لیں اور اپنی جسمانی ضروریات کو جس طرح ہو سکے پورا
کر لیں۔ ملک یا قوم کی بُرائی یا بھلائی سے کچھ سروکار نہیں ہوتا خدا کی سلطنت میں تو کوئی اپنے
تئیں مختار سمجھتا ہے اور کوئی مجبور مگر خود مختار سلطنت میں ہر شخص کا فرض ہے کہ اپنے تئیں مجبور
جانے۔ کیونکہ ہر متنفس کو اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ ملک اور قوم کے حق میں بُرائی یا بھلائی
بادشاہ اور اُس کے ارکان کے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔

حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ سے اُن کے عہدِ حکومت میں ایک شخص نے زمانے کی
شکایت کی۔ انھوں نے کہا نحن الزمان من رفعناہ ارتفع ومن وضعناہ اتضع۔ یعنی
"تو کس کی شکایت کرتا ہے۔ زمانہ تو ہم ہیں۔ جس کو ہم نے بلند کر دیا وہ بلند ہو گیا
اور جس کو پست کر دیا وہ پست ہو گیا۔"

جو امور مصالح عامہ سے علاقہ رکھتے ہیں۔ خود مختار سلطنت میں اُن سے پبلک کو کچھ
سروکار نہیں رہتا۔ مسلمانوں کے دور دورے میں ہزاروں مدرسے اور شفاخانے ممالک اسلامیہ
میں جاری ہوئے مگر شاید ہی کوئی مثال ایسی نکلے کہ رعایا نے باہم مجتمع ہو کر کوئی مدرسہ یا شفاخانہ
جاری کیا ہو۔ قریبًا تمام مدرسے اور شفاخانے یا بادشاہوں کے قائم کئے ہوئے پائے گئے
یا ان کے وزرا اور امرا کے۔

کمزور اور مظلوموں کی اعانت کرنا یا حقداروں کے حقوق دلوانے میں کوشش کرنا
یا عاملوں کے ظلم و تعدّی کی شکایت کرنا خود مختار سلطنت میں ایسا ہی جرم ہوتا ہے جیسے
بغاوت اور سرکشی۔ نوشیرواں[1] جیسے عادل بادشاہ کے سامنے اس کے عاملوں کی رشوت

---

[1] نوشیرواں - ایران کے ساسانیان کا بیسواں شہنشاہ اور نہایت ہی عادل اور منصف مزاج انسان
تھا۔ اس کا عہد ایران میں ساسانیوں کے . . . . . کمال عروج کا زمانہ سمجھا جاتا ہے۔ سب سے پہلے
اسی نے بغداد کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ قیصر روم سے لڑ کر اس پر فتح پائی۔ (باقی آئندہ صفحہ پر)

ستانی اور ظلم کی کوئی صریح شکایت نہ کر سکتا تھا۔ جن موبدوں کا وہ نہایت ادب کرتا تھا۔ جب ان سے ملک کا حال پوچھتا تو وہ محض رمز و کنایہ میں ایسی باتیں عرض کرتے تھے۔

خود مختار سلطنت میں بعض اوقات ضعیفوں کی حمایت کرنے کا قانوناً امتناع ہوتا تھا۔ ہندوستان کی قدیم سلطنتوں میں جب کہ منو[۱] شاستر کے موافق عمل درآمد ہوتا تھا کسی کی یہ مجال نہ تھی کہ شودر کو وید یا مذہبی کتابوں کی تعلیم دے سکے یا اس کو کسی برتر فرقے کے مطابق حقوق دلوا سکے۔

اگر بالفرض قانوناً ایسا صریح امتناع نہ ہو تو بھی ایشیائی طرز حکومت کا طبعی اقتضا یہی تھا کہ ملک کی برائی بھلائی سے سلطنت کے سوا کسی کو سروکار نہ ہو کسی حکیم کا قول ہے کہ "خود مختار سلطنت میں صرف ایک شخص ملک کا خیر خواہ ہوتا ہے اور بس"

..... جان اسٹوارٹ مل[۲] کہتے ہیں کہ "اگر کسی کو ایسا بنا دو کہ ملک کے لیے کچھ نہ کر سکے تو تو اس کو اپنے ملک کی کچھ پرواہ نہ رہے گی"

جو شخص ہمیشہ صرف دماغ سے کام لے گا اس کے اعضا و جوارح یقیناً بیکار ہو جائیں گے۔

جو باپ تمام مہمات خانگی کا بوجھ اپنے سر دھر لیتا ہے اور کوئی کام اپنی اولاد سے نہیں لیتا اس کے مرنے کے بعد اولاد کو گھر تھامنا مشکل ہو جاتا ہے۔

جس گھر کی بیوی کو کسی کا کام پسند نہیں آتا اور خود ہر ایک کام اپنے ہاتھ سے

نوٹ ص ۱۸۱ سے آگے: ۵۳۱ء میں تخت پر بیٹھا اور ۴۸ سال حکومت کرنے کے بعد ۵۷۹ء میں فوت ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی کے زمانہ میں ۵۷۰ء میں پیدا ہوئے تھے۔

[۱] منو شاستر: یعنی منو مہاراج کا مرتب کیا ہوا ضابطہ قوانین ملکی و مذہبی۔ زمانہ قدیم میں منو نام ایک قانون داں نے ایک بڑی ضخیم کتاب ملکی، اخلاقی، معاشرتی اور مذہبی ضوابط اور قوانین کی تصنیف کی تھی جو منوسمرتی کے نام سے مشہور ہے۔ سلطنتیں اسی کے مطابق ہر امر کا فیصلہ کرتی ہیں۔

[۲] جان اسٹوارٹ مل (JOHN STAUTRT MILL) انگلستان کا اعلیٰ درجہ کا فلسفر اور پولیٹکل اکانمی معاشیات کا ماہر تھا۔ ۱۸۰۶ء میں پیدا ہوا تھا۔

کرنے سے شوق ہوتا ہے، اس گھر کی لڑکیاں اور نوکریں کاہل اور سست ہو جاتی ہیں۔

تم اپنے نوکروں میں سے صرف ایک نوکر کو اپنا معتمد بنا لو اور سب بڑے کام اسی سے لیا کرو تو اس طرح تمہارے دوسرے ملازم کاہل اور نکمے ہو جائیں گے۔

جب ایسی سرسری اور اتفاقی شخصیت و امتیاز سے یہ نتائج پیدا ہوتے ہیں تو ایک ایسے شخص کی خودمختاری سے جو حاکم علی الاطلاق مانا گیا ہو رعیت میں کیا جان باقی رہ سکتی ہے۔

الغرض اس میں شک نہیں کہ خودمختار سلطنت رعیت کے قوائے عملیہ کو بالکل معطل اور بے حس کر دیتی ہے، نہ وہ ملکی معاملات کے متعلق دم مار سکتے ہیں نہ مذہبی امور میں کوئی بات خلاف جمہور زبان پر لا سکتے ہیں، نہ قوم کی سوشل خرابیوں کی اصلاح کر سکتے ہیں اور صرف اپنی مادی اغراض مہیا کرنے کے سوا پبلک کاموں سے کچھ سروکار نہیں رکھتے۔ ان میں صبر و تحمل اور قناعت روز بروز زیادہ ہوتی جاتی ہے مگر ہمت، دلیری، اولوالعزمی، غیرت و حمیت کم ہوتے ہوتے چند نسلوں کے بعد بالکل فنا ہو جاتی ہے۔

لیکن بااینہمہ دوسری محکوم قوموں میں جن کو سلطنت کا ایسا سہارا نہیں ہوتا جیسا بادشاہ کی قوم کو ہوتا ہے، عملی قوت بالکل زائل نہیں ہوتی۔ چونکہ فوجی اور ملکی خدمات میں ان کا حصہ بہ نسبت حکمراں قوم کے کم ہوتا ہے اور اس کے سوا اور بہت سی رعایتوں سے جو حکمراں قوم کے لیے مخصوص ہوتی ہیں، محکوم قومیں کم ہی مستفید ہوتی ہیں۔ اس لیے بیچارنا چار ان کو زیادہ تر تجارت، کھیتی اور دستکاری وغیرہ پر اپنی معاش کا مدار رکھنا پڑتا ہے اور اس طرح ان میں سیلف ہلپ (اپنی مدد آپ کرنا) کا مادہ روز بروز بڑھتا جاتا ہے اور عقل معاش زیادہ ہوتی جاتی ہے۔

برخلاف اس کے حکمراں قوم میں سلف ہلپ کا ملکہ بالکل باقی نہیں رہتا۔ ان کا مدارِ معاش اکثر بادشاہی ملازمت یا جاگیر، منصب، ملک، مدد معاش اور معافی وغیرہ پر ہوتا ہے، تجارت، زراعت اور دستکاری کو وہ عیب سمجھنے لگتے ہیں اور سلطنت کے سہارے پر کوئی ایسا حیلہ اختیار نہیں کرتے جس میں ان کو محض اپنے دست و بازو پر بھروسا ہو۔ ان کا حال

بعینہ اس چھت کا سا ہوتا ہے جو محض اڑ واڑ کے سہارے تھمی ہوئی ہے۔ اِدھر اڑواڑ ہٹی اور اُدھر چھت گری۔

یہی بپتا ہماری قوم پر پڑی ہے۔ کچھ تو طرزِ حکومت نے ہماری حالت میں سکون انجماد کی بنیاد ڈالی اور کچھ قومی سلطنت کے سہارے نے ہمارے رہے سہے قوائے عملیہ کو معطل کر دیا اور نسلاً بعد نسلٍ یہ حالت منتقل ہوتی چلی آئی یہاں تک کہ کاہلی، پستی، بیکاری، افسردگی، مایوسی اور بزدلی ہماری قومی خصلتیں بن گئیں اور شدہ شدہ پر لوگوں کی میراث ہم تک پہنچی۔ اس صورت میں کون کہہ سکتا ہے کہ یہ خصلتیں ادرباہم میں پیدا ہو گئی ہیں یا ہم اپنی نالائقی سے اپنے مردار اور ہیچ بن گئے ہیں یا (نعوذ باللہ) اسلام نے ہم کو ایسا بنا دیا ہے۔

چہ کند گر پئے دوراں نرود چوں پرکار
ہر کہ در دائرہ گردش ایام افتاد

لیکن ہم کو یاد رکھنا چاہیئے کہ ہماری حالت خواہ کیسی ہو، خواہ موروثی خواہ اختیاری ہو، خواہ اضطراری خواہ اس کے باعث ہم خود ہوئے ہوں، خواہ زمانے کے واقعات اس کا سبب ہوں، لیکن جب تک ہم اس حالت کو نہ بدلیں گے کسی طرح معذور نہیں سمجھے جا سکتے اور الزام سے بری نہیں ہو سکتے۔ غلام جب تک غلام ہے بے شک حقیر و ذلیل سمجھا جائے گا۔ خواہ وہ خود غلام بن گیا ہو اور خواہ جبر سے اس کو غلام بنا یا گیا ہو۔

یہ سچ ہے کہ زمانۂ گذشتہ کے واقعات نے ہم کو گرا دیا ہے لیکن موجودہ زمانے کے حالات ہم کو ابھار رہے ہیں۔

ملک بیرونی حملوں اور اندرونی جھگڑوں سے بالکل پاک ہے۔

طرزِ حکومت بجائے اس کے کہ ترقی کی مانع ہو اس کی معین و مددگار معلوم ہوتی ہے۔

آزادی نے ہمارے طوق اور زنجیریں کاٹ ڈالی اور ہماری مشکیں کھول ڈالی ہیں۔

ہماری ہم وطن قومیں پستی سے بلندی کی طرف چڑھ رہی ہیں اور تمام دنیا میں ترقی کی پکار پڑ رہی ہے۔

خود ہماری ترقی کا حیرت انگیز سامان نہیں ہیں سے ایک زبردست ہاتھ نے ہمارے

لیے مہیا کر رکھا ہے اور ثابت کر دیا ہے کہ اس مُردہ قوم کے مسیحا اسی قوم میں موجود ہیں[1]

ہماری آسمانی کتاب ہم کو ترقی کا سیدھا راستہ بتا رہی ہے اور بزدلی و ذلت سے بچنے کی تدبیر ہم کو سمجھا رہی تھی سنو وہ فرماتی ہے:۔

'' اطیعوا اللہ ورسولہ ولا تنازعوا فتفشلوا وتذہب ریحکم واصبروا ''

یعنی: ، اور رسول کا حکم مانو آپس میں جھگڑا مت کرو جس سے تم بزدل ہو جاؤ اور تمہاری ہوا اُکھڑ جائے اور ثابت قدم رہو''

غرض کہ ترقی کے اسباب اور ترغیبیں کثرت سے ہمارے گرد و پیش موجود ہیں گو کہ افسردگی اور کم ہمتی نے ہم کو دبا لیا ہے۔ لیکن پھر آخر ہم انسان ہیں جماد نہیں۔ اگر بالفرض ہم حیوانِ ناطق نہیں تو جسم نامی حساس متحرک بالارادہ ضرور ہیں۔ اگر ہم میں قومی اسپرٹ نہیں ہے تو اسلامی روح ضرور ہے۔ وہ اسلام جس کی ابتدائی حیرت انگیز ترقیاں قیامت تک یادگار رہیں گی اور جو اس تنزل اور پستی کے زمانے میں بھی نئی اور پرانی دنیا کی ایک ایک کھونٹ میں توحید کا ڈنکا بجا رہا ہے ؎

یاراں بجوئے عشق گذاری نمی کنید اسباب جملہ حاضر و کاری نمی کنید
چوگانِ کام در کف و گوئی نمی زنید بازی چنیں بدست و شکاری نمی کنید
ترسم کزیں چمن نبری آستین گل
کز گلبنش تحملِ خاری نمی کنید

---

[1] مولانا کی مراد سر سید احمد خاں سے ہے۔

١٩۔ تجارت کا اثر عقل اور اخلاق پر

(از محمڈن اینگلو اورئینٹل کالج میگزین بابت ۱۸۹۶ء صفحہ ۲۴۲)

جس طرح بڑے بڑے کامیاب تاجر نوکری کو نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس کو ایک ادنیٰ درجے کی غلامی اور آزادی کو برباد کرنے والی سمجھتے ہیں۔ اسی طرح وہ لوگ جنھوں نے علم و فضل یا مناصب و خدمات کی وجہ سے امتیاز حاصل کیا ہے۔ بیوپار اور دوکانداری کو قوائے ذہنی اور عقل و اخلاق کے حق میں نہایت مضر بتاتے ہیں مگر سچ یہ ہے کہ تجارت میں ہمیشہ وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں اور رہتے ہیں جن کے اخلاق درست اور عقل سلیم ہوتی ہے۔ ایک لائق مصنف لکھتا ہے:۔

"تجارت کے برابر کوئی چیز انسان کے اخلاق کی کسوٹی نہیں ہے۔ ایک عالم جو محض کتابوں کے مطالعہ اور فلسفیانہ استدلال و احتجاج میں رات دن مصروف رہتا ہے۔ وہ خود نہیں جانتا کہ میں کیا چیز ہوں؟ اگر وہ اپنی حقیقت سے آگاہ ہونا اور اپنی عقل اور اخلاق کی آزمائش کرنی چاہتا ہے تو اس کو چاہیئے کہ بازار میں قدم رنجہ کرے تب اس کو بہت جلد معلوم ہوجائے گا کہ وہ دانش مند اور نیک آدمی ہے یا احمق اور شریر النفس۔ اس کی کامیابی اور ناکامی خود اس کو اپنی حقیقت سے خبردار کردے گی۔"

پس جو قوم تجارت سے کچھ تعلق نہیں رکھتی اس کے کسی فرد کی نسبت قطعی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ دانش مند یا نیک نہاد ہے یا احمق اور بدنہاد۔

اگرچہ تاجر ہمیشہ مذہب یا کانشنس کی ہدایت سے اپنے اخلاق کی اصلاح نہیں کرتا بلکہ وہ اپنی کامیابی اسی میں سمجھتا ہے کہ اس کی دیانت داری، خوش معاملگی اور راستبازی پر لوگوں کو اعتماد ہو۔ لیکن جیسا کہ خصائل انسانی کا خاصہ ہے۔ رفتہ رفتہ یہ خصلتیں جو اس نے

بضرورت اختیار کی تھیں، اس کی طبیعت ثانی بن جاتی ہیں۔

یہ کہنا کہ تجارت قوائے عقلیہ کے حق میں مضر ہے، واقع کے بالکل خلاف ہے۔ جس قدر تاجر کو اپنی عقل و تدبر سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے، ایسی اور کسی پیشے والے کو نہیں ہوتی۔

نوکری پیشہ کو اپنی نوکری پر قائم رہنے یا ترقی حاصل کرنے کے لیے صرف اپنے معمولی فرائض ادا کرنے کی ضرورت ہے اور کسان کی کامیابی فقط اس کی محنت اور بخت و اتفاق پر موقوف ہے، مگر تاجر کو باوجود ان تمام فرائض کے جو ایک سچے تاجر کو ادا کرنے ضرور ہیں ہر وقت عقل سے مشورہ لینے اور ایک شطرنج باز کی طرح نت نئی چال چلنے کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہر وقت زمانے کے تیور دیکھتا اور پبلک کے دل ٹٹولتا رہتا ہے۔

ایک وقت اُس کو قرض لے کر کام چلانا بہت مفید پڑتا ہے مگر دوسرے وقت قرضے کی بدولت اس کو نقصان عظیم اُٹھانا پڑتا ہے۔

اس کو اپنے گاہکوں کی نسبت فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ کن کو نقد سودا دینا چاہیے، اور کن کو ادھار پر؟

کبھی نہایت قلیل فائدے پر بلکہ برابر مال فروخت کر ڈالنا اس کے حق میں مفید ہوتا ہے اور کبھی اس کے فروخت کرنے میں جس قدر زیادہ دیر ہوتی جاتی ہے اسی قدر اس کی قیمت بڑھتی جاتی ہے

اکثر اوقات اس کو کثیر لالچ میں راست بازی کے خلاف عمل درآمد کرنے کی ترغیب ہوتی ہے، مگر اسی کے ساتھ اس بات کا خوف بھی دامنگیر ہوتا ہے کہ اگر راز کھل گیا تو پھر اعتبار نہ رہے گا۔

غرضکہ اسی قسم کی بے شمار حالتیں جن میں انسان متردد ہوتا ہے کہ کون سی جانب اختیار کی جائے، تاجر کو قدم قدم پر پیش آتی ہیں اور اس کو عقل و تدبیر سے کام لینے اور کامل غور و فکر کرنے پر مجبور کرتی ہیں اور اس طرح تاجر کی عقلِ معاش روز بروز جلا پاتی ہے۔

نوکری پیشہ یا کاشتکار کو اس قسم کے مرحلے بہت کم پیش آتے ہیں۔ یہ لوگ معمولی

قواعد کی شارع عام پر آنکھیں بند کئے چلے جاتے ہیں۔

"نوکری پیشہ" اگر اپنے فرائض دیانت اور محنت کے ساتھ انجام دیتا ہے تو اس کو اس بات کا مطلق اندیشہ نہیں کہ میری وجہ معین میں کچھ کمی ہو جائے گی۔

کاشتکار کی کامیابی زیادہ تر آسمانی مدد پر منحصر ہے جس میں انسانی عقل و تدبیر کو کچھ دخل نہیں۔

اس لیے پہلا عادم ضرورت کے سبب اور دوسرا عادم قدرت کے سبب عقل اور تدبیر سے بہت کم کام لیتا ہے۔

مگر تاجر خوب جانتا ہے کہ ذرا چال چوکا اور مصیبت میں گرفتار ہوا۔ اس وجہ سے اُس کو نہایت پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جو قوم تجارت سے کچھ تعلق نہیں رکھتی اور نوکری کے سوا کسی اور ذریعے سے معاش پیدا نہیں کرتی چند نسلوں کے بعد ان میں تدبیر معاش کا مادہ باقی نہیں رہتا۔ کیوں کہ جس طرح کسی عضو کے معطل و بیکار رکھنے سے اُس کی قوت زائل ہو جاتی ہے اور اس میں سکت باقی نہیں رہتی۔ اسی طرح قوائے ذہنیہ سے جب کچھ کام نہیں لیا جاتا تو وہ بالکل از کار رفتہ ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ ممکن ہے کہ اس قوم میں مستثنیٰ مثالیں ایسے اشخاص کی پائی جائیں جو اعلیٰ درجے کی عقل معاش رکھتے ہوں لیکن ایسے مستثنیات سے قاعدہ کلیہ نہیں ٹوٹ سکتا۔

اس دعوے کے ثبوت میں ہم کو کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی مثال اس کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔ جہاں تک غور کیا جاتا ہے ہندوستان کی قوموں میں عقلِ معاش کے لحاظ سے جیسے مسلمان ہیٹے معلوم ہوتے ہیں ایسی کوئی قوم نہیں معلوم ہوتی۔ خصوصاً عرب ایران اور توران کے لوگ جو مسلمان فتحمندوں کے ہمراہ ہندوستان میں آئے اور نسلاً بعد نسلٍ فوجی اور ملکی خدمات پر مامور ہوتے رہے، اُن کی نسلوں میں تدبیرِ معاش کا مادہ بہت کم پایا جاتا ہے۔

کسی قوم کی عقلِ معاش کا اندازہ دو طرح سے ہو سکتا ہے۔

اولاً موجودہ حالت کے قائم رکھنے یا اُس کو ترقی دینے سے۔

دوسرے عندالضرورت ایسے وسائل بہم پہنچانے سے جن سے دولت و آسودگی حاصل ہو۔ سو ہم مسلمانوں پر دونوں طرح سے نظر ڈالتے ہیں۔

جہاں تک کہ مذکورہ بالا نسلوں کے مسلمانوں کا حال ہم کو معلوم ہے ہم ایسی مثالیں بہت کم پاتے ہیں کہ کسی ایسے خاندان میں جس کی نگرانی گورنمنٹ کے ہاتھ میں نہ ہو دو چار پشت تک دولت و آسودگی حالت پر یا ترقی روزافزوں کے ساتھ باقی رہی ہو۔

اکثر یہی دیکھنے میں آتا ہے کہ جو کچھ باپ نے عمر بھر میں جمع کیا تھا بیٹے نے باپ کے مرتے ہی اس کو چند روز میں اُڑا دیا۔ ناعاقبت اندیشی اور اسراف جو حماقت اور بے دانشی کی نمایاں علامات ہیں وہ مسلمانوں کی قومی خصلتیں بن گئی ہیں۔ باپ کیسا ہی دولتمند اور آسودہ حال ہو۔ زیادہ سے زیادہ اُس کی اولاد کی . . . نسبت پیشین گوئی کی جا سکتی ہے کہ وہ محتاج ہو گی کہ تنگ معاش۔

جن کے پاس نقد روپیہ ہے مگر آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں وہ اُس روپیہ کو بے دریغ خرچ کرتے چلے جاتے ہیں اور کبھی بھول کر بھی اس بات کا خیال نہیں کرتے کہ جب روپیہ نبڑ جائے گا اُس وقت کیا حال ہو گا؟ جائداد والے دھڑا دھڑ جائدادیں فروخت کرتے ہیں اور مطلق انجام کی فکر نہیں کرتے۔

جن کے پاس نہ روپیہ ہے اور نہ جائداد، مگر اُن کو کم و بیش سود پر قرض روپیہ مل جاتا ہے وہ اس کو ایسی فراخ دلی سے خرچ کرتے ہیں، جیسے کوئی اپنے سرمایہ کو خرچ کرتا ہے۔ سودی قرض لے کر بیاہ شادیوں میں خرچ کرنا تو ایسا عام ہے کہ اس سے شاید کوئی مسلمان بھی خالی نہ ہو گا۔

جب کہ موجودہ روپیہ کو وہ اپنی حالت پر قائم و برقرار نہیں رکھ سکتے تو ظاہر ہے کہ اس کو ترقی دینے کی ان سے کیا امید ہو سکتی ہے۔

رہی دوسری بات یعنی عندالضرورت جائز وسیلوں سے معاش پیدا کرنی اور اپنی ذاتی کوشش سے اپنی حالت کو درست کرنا۔ سو اس لحاظ سے بھی مسلمانوں کے قدیم خاندانوں

کی حالت نہایت سقیم نظر آتی ہے۔ تجارت، زراعت یا دستکاری کے ذریعے سے وہ معاش پیدا کرنی بالکل نہیں جانتے۔

چونکہ اُن کے آبا و اجداد نے ہندوستان میں آکر نوکری کے کسی سوا کسی دوسرے ذریعے سے معاش پیدا نہیں کی۔ اس لئے اول تو بجز نوکری کے کسی دوسرے ذریعۂ معاش کا ان کو خیال ہی نہیں آتا۔ وہ جس طرح مسلمانوں کی اولاد کا مسلمان ہونا ضروری سمجھتے ہیں، اسی طرح نوکری پیشہ کی اولاد کا نوکری پیشہ ہونا ضروری خیال کرتے ہیں اور اگر کوئی مجبور ہوکر بیوپار، دوکانداری یا کاشتکاری اختیار کرتا ہے تو جہاں تک ہم کو معلوم ہے مستثنیٰ صورتوں کے سوا ہمیشہ اُس میں ناکامی ہوتی ہے۔

رہی ملازمت جس کو وہ اپنا موروثی پیشہ سمجھتے ہیں اس میں بھی ان کی مقدار اس قدر قلیل ہے کہ گویا بالکل نہیں۔ اول تو سرے سے عام مسلمانوں ہی کی تعداد سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں بمقابلہ ہندوستان کی دوسری قوموں کے نہایت کم ہے اور پھر خاص کر مسلمانوں کی مذکورہ بالا نسلیں جو اس مقام پر زیر بحث ہیں، اُن کا گورنمنٹ سروس (سرکاری ملازمت) میں اتنا بھی حصہ نہیں جتنا کہ آٹے میں نمک۔ اس کا سبب چاہو یہ قرار دو کہ اُنھوں نے اپنے تئیں گورنمنٹ کی خدمات کے لائق نہیں بنایا اور چاہو یہ سمجھو کہ چونکہ اُن کے آبا و اجداد کو کسی فارن گورنمنٹ (بیرونی سلطنت) میں نوکری کی خاص لیاقت بہم پہنچانے کی ضرورت نہ تھی اس لیے ہریڈیٹیری جینیس (HEREDITERY GENIUS) کے قاعدے کے موافق اولاد میں بھی اس کی لیاقت پیدا نہیں ہوتی۔

دونوں صورتوں میں نتیجہ نکلے گا کہ مذکورہ بالا نسلوں کے مسلمان عقلِ معاش کے لحاظ سے اپنی ہم وطن قوموں سے نہایت بہتر حالت میں ہیں اور اس کا سبب جہاں تک غور کیا جاتا ہے اس سے بہتر خیال میں نہیں آتا کہ پشتہا پشت سے ان کا ذریعۂ معاش صرف اسلامی سلطنتوں کی ملازمت پر منحصر رہا اور تجارت سے جو کہ عقل کی ترقی دینے والی اور جلا کرنے والی ہے کبھی ان کو سروکار نہیں رہا۔

جس طرح تجارت سے قومی عقلِ معاش ترقی پاتی ہے، اسی طرح عمدہ اخلاق اور

نیک خصلتیں صرف تجارت ہی کے ذریعے سے تمام قوم میں شائع ہوتی ہیں۔ جزرسی اور کفایت شعاری جس کے بغیر خاندان بلکہ کسی قوم کا وقار دنیا میں قائم نہیں رہ سکتا، صرف تجارت ہی کی بدولت تمام قوم میں سرایت کرتی ہے۔ اگرچہ ممکن ہے کہ ہر ایک قوم میں خواہ وہ قوم تجارت پیشہ ہو اور خواہ نوکری پیشہ، کچھ افراد جزرسی اور کفایت شعاری کے ساتھ موصوف پائے جائیں۔ لیکن ہمارے نزدیک کوئی قوم عام طور پر جزورس اور کفایت شعار نہیں ہو سکتی جب تک عام طور پر اس میں تجارت شائع نہ ہو۔

یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی وہ مسلمان قومیں جو ابتدا سے روزگار پیشہ چلی آتی تھیں اُن کی نسل میں رفتہ رفتہ جزرسی اور کفایت شعاری کا مادہ بالکل معدوم ہو گیا ہے۔ ایک شریف مسلمان جو ہمیشہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کے ساتھ سلوک کرتا رہتا تھا اُس کا افسوس کے ساتھ یہ کہنا ہمیشہ یاد رہے گا:۔

"اگر میں اپنے کسی بے مقدور مسلمان کا دس روپیہ ماہوار ہمیشہ کے لئے مقرر کر دوں تو بھی مجھے امید نہیں کہ وہ اپنی حالت درست کر سکے۔ لیکن اگر میں اپنے کسی بے مقدور ہندو دوست کو ایک دفعہ دو روپے دے دوں تو مجھکو یقین ہے کہ وہ انہی دو روپوں سے رفتہ رفتہ اپنی حالت درست کرے گا اور پھر کبھی مجھ سے مدد کا خواستگار نہ ہو گا۔"

تجارت کے اصول جن کی پابندی کرنی تاجر کو لازم ہوتی ہے خود بخود اُس کو جزرس اور کفایت شعار بنا دیتے ہیں۔ ایک مہاجن کی نقل مشہور ہے کہ اس کا بیٹا آوارہ اور بدچلن ہو گیا تھا۔ اُس نے باپ کی بہت سی دولت اُس کی زندگی ہی میں اُڑا دی۔ ہرچند باپ ملامت اور نصیحت کرتا تھا مگر اُس کے کان پر جوں بھی نہ رینگتی تھی۔ آخر جب مہاجن مرنے لگا تو اُس نے بیٹے کو وصیت کی کہ جو کچھ مال و دولت چھوڑتا ہوں اُس کے خرچ کرنے نہ کرنے کا تجھ کو اختیار ہے کیونکہ تیرے سوا میرے کوئی وارث نہیں جس کو یہ مال و دولت دے جاؤں لیکن ایک نصیحت کرتا ہوں اس کو کبھی نہ بھولنا۔ اور وہ یہ ہے کہ ایک سے لے کر ہزار تک جو خرچ کرے اور جو کچھ خرچ کے بعد باقی رہا کرے اس کو ہر روز بہی میں لکھ لیا کیجیو اور ہمیشہ آج کا حساب کل اور کل کا حساب

پرسوں دیکھتا رہو۔ بیٹے نے ایسا ہی کیا اور چند ہی روز میں جب اس نے دیکھا کہ سرمایہ روز بروز گھٹتا جاتا ہے تو دفعتہً اُس کی آنکھیں کھل سی گئیں اور اپنے گھر کو سنبھال لیا۔

جس طرح تجارت سے جُزرسی اور کفایت شعاری کی بنیاد تمام قوم میں پڑتی ہے اسی طرح تحمل، بردباری، نرمی اور مرافقت بغیر تجارت کے کسی قوم کی قومی خصلت نہیں بنتی۔ جس طرح سلطنت اور حکومت کا میلان ظلم اور تشدد اور غرور و نخوت کی جانب ہوتا ہے اسی طرح تجارت کا اقتضا یہ ہے کہ وہ تند مزاجوں کو دھیما، مغروروں کو خاکسار، سخت کلاموں کو شیریں زبان اور جباروں کو منکسرالمزاج بناتی ہے۔ تاجر کی ضرورتیں ایسی ہیں کہ جب تک وہ تحمل و بردباری اور شیریں زبانی اختیار نہ کرے ہرگز اپنے پیشے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔

ایک مصنف لکھتا ہے کہ "دنیا میں سب سے زیادہ خوش اخلاق اور شیریں زبان یہودی لوگ ہیں۔ نہ فرانسیسی، نہ اٹلی والے اور نہ جرمن۔ اور یہی وجہ ہے کہ دنیا میں کوئی قوم یہودیوں کے برابر دولت مند نہیں۔" اسی سبب سے جو قومیں تجارت پیشہ ہوتی ہیں ایک مدت کے بعد اُن کی نسلیں فطرتاً ان خصلتوں پر مجبول پیدا ہوتی ہیں۔ کیونکہ اولاد کے جسمانی اور نفسانی قویٰ اپنے آبا و اجداد کے جسمانی اور نفسانی قویٰ کے تابع ہوتے ہیں جس طرح قوی اور تنومند ماں باپ کی اولاد تنومند ہوتی ہے اسی طرح متحمل و بردبار ماں باپ کی اولاد مستثنیٰ صورتوں کے سوا ضرور ہے کہ متحمل و بردبار پیدا ہو۔

راست بازی اور خوش معاملگی بھی تجارت کی کامیابی کے لیے نہایت ضروری ہے، کیونکہ جو تاجر راست باز اور خوش معاملہ نہیں ہوتا اس کی ساکھ شہر یا ملک میں کبھی نہیں بندھ سکتی۔ اگر وہ فریب یا بدمعاملگی سے کبھی کامیاب بھی ہو جاتا ہے تو بہت جلد اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے اس لیے تاجر کو راست باز اور خوش معاملہ بننا پڑتا ہے ہم ہمیشہ بازاروں میں آنکھ سے دیکھتے ہیں کہ جو دکاندار گاہکوں کو دھوکہ نہیں دیتے اور اپنا مال سب کے ہاتھ ایک ہی نرخ پر بیچتے ہیں، وہ چند روز میں اپنے ہم پیشوں سے سبقت لے جاتے ہیں، یہاں تک کہ ان کی کامیابی دیکھ کر اوروں کو بھی وہی طریقہ اختیار کرنا پڑتا ہے اور اس طرح ممکن ہے کہ رفتہ رفتہ بازار میں راست بازی پھیل جائے۔

اگرچہ اس بات کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دنیا میں ابھی تک راستباز تاجروں کی تعداد بہ مقابلہ جو فروش گندم نماؤں کے بہت کم ہے لیکن اس سے تجارت کے پاک دامن پر کوئی دھبہ نہیں لگتا۔ جس طرح علم کا خاصہ ہے کہ وہ براہ راست نیکی کی راہ بتاتا ہے لیکن باوجود اس کے بہت سے اہل علم اپنی بداعمالیوں سے علم کو بدنام کرتے ہیں۔ اسی طرح اگرچہ تجارت براہ راست آنسٹی (دیانتداری) اور راستبازی کی تعلیم دیتی ہے۔ لیکن نالائق تاجر چند روزہ منفعت کے لیے بددیانتی اور فریب اختیار کر کے تجارت کی پائدار برکتوں سے محروم رہتے ہیں۔

ایک دانشمند امریکن مصنف اپنے ملک کے تاجروں کو اس طرح نصیحت کرتا ہے:۔

"جس قدر تمہاری تجارت میں راست بازی اور خوش معاملگی زیادہ ہوگی اسی قدر تمہارا کام جلد ترقی کرے گا۔ تجارت کی ذات میں بھلائی اور نیکی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ مگر انسان نے اپنی بدی سے اُس کو بُرا بنا دیا ہے اور اپنی خیانت اور بددیانتی سے اس کے پاک دامن پر داغ لگایا ہے۔ اگر تم تجارت میں کامیاب ہونا چاہتے ہو تو مکر و فریب چھوڑ دو اور سانپ کی چال نہ چلو۔ جو کمینہ پن سے بجائے پاؤں کے چلنے سے پیٹ کے بل چلتا ہے۔ بلکہ ایسا کرو کہ تمہاری دکانیں گودام اور منڈیاں عزت اور دیانت داری کے مندر ہوں اور اپنی منڈیوں کے دروازوں پر کندہ کرا دو کہ جو کوئی اس احاطہ میں داخل ہوگا اس کو امان دی جائے گی۔"

اصل یہ ہے کہ جب تک کسی ملک کی تجارت وہاں کے تعلیم یافتہ گروہ کے ہاتھ میں نہیں آتی بلکہ جاہلوں اور نالائقوں کے پنجے میں پھنسی رہتی ہے۔ تب تک تجارت کی کامیابی کا بھید عام نظروں سے مخفی رہتا ہے۔ (اکثر نفع یا نقصان کو امورات تقدیری میں شمار کرتے ہیں جن میں انسانی عقل و تدبیر کچھ کام نہیں دے سکتی۔ حالانکہ وہ تدبیر سے ایک دم غافل نہیں رہتے) بعضے چالاکی اور عیاری کو بیوپار کے لوازمات میں سے جانتے ہیں لیکن فی الحقیقت تاجر کی کامیابی کا مدار زیادہ تر اُس کی راست بازی اور خوش معاملگی پر ہوتا ہے جس پر پورا پورا یقین بغیر تعلیم و تربیت کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ ایک مصنف لکھتا ہے کہ:۔

"تجارت کی کامیابی کے لیے زیادہ ضرورت صرف علم کی ہے نہ کہ تجربہ کی۔ کیونکہ تجربہ علم حاصل کرنے کے متعدد ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے۔ عاقل اپنی عقل اور علم سے سبق لیتے ہیں اور کم عقل تجربہ سے مگر نہایت بے وقوف ضرورت سے اور چوپائے نیچر سے"

اسی مصنف کا قول ہے کہ:۔

"وہ وقت قریب ہے جب کہ تجارت ہر قسم کی ذہنی اور عقلی پیشوں سے مقابلہ کر سکے گی۔ زمانۂ آئندہ کا تاجر ضرور دانش مند اور لائق شخص ہوگا جو مصنوعی اور قدرتی چیزوں کا زمین پر تقسیم کرنے والا ہوگا۔ اب وہ اتفاقات روز بروز کم ہوتے جاتے ہیں اور قریب ہے کہ بالکل معدوم ہو جائیں جن سے ایک نالائق تاجر جو بار بار غلطیاں کرتا ہے مدت دراز تک دوالہ نکلنے سے محفوظ رہ سکے"

اصلی جرأت اور دلیری بھی جیسی تجارت کی بدولت انسان میں پیدا ہوتی ہے ایسی کسی اور پیشے کے ذریعے سے نہیں ہوتی۔ شاید وہ لوگ جو تجارت اور دلیری میں منافات سمجھتے ہیں، اس بات کو سن کر متعجب ہوں۔ مگر ان کو یاد رکھنا چاہیے کہ دلیری یا بزدلی کسی خاص فرقے کے ساتھ خصوصیت نہیں رکھتی۔ ممکن ہے کہ ایک سپاہی یا سپہ سالار نہایت بزدل ہو اور ایک بیوپاری بہت بڑا بہادر ہو جس طرح بہادروں کو میدان جنگ میں دلیری اور شجاعت کے کام کرنے پڑتے ہیں، اسی طرح ہر شخص کو اپنی روزانہ زندگی میں اکثر موقعوں پر دلیری سے کام کرنا پڑتا ہے۔

کبھی راستی اور ایمانداری سے کام کرنے میں طرح طرح کے خطرے ہوتے ہیں۔

کبھی حرص اور طمع انسان کی نیت ڈانواں ڈول کر دیتی ہے۔

اکثر دوسروں کا سہارا چھوڑ کر اپنے دست و بازو پر بھروسہ کرتے ہوئے جی ہچکچاتا ہے۔

اکثر اوقات ارادوں میں تزلزل واقع ہو جاتا ہے جس طرح ایک کام کو مفید جانتے ہیں مگر چونکہ کبھی اس کو نہیں کیا، اس میں ہاتھ نہیں ڈالتے۔

بعض اوقات اپنے فرائض کاہلی سے یا کسی کے لحاظ سے یا کسی کے خوف سے پورے کرنے دشوار معلوم ہوتے ہیں۔

غرض اسی قسم کے بے شمار مواقع ہیں جہاں دلیری کی ضرورت ہوتی ہے۔ پس جو شخص ایسے موقعوں پر دلیری اور جرأت ظاہر کرتا ہے اور خوف یا مروت یا دل کی کمزوری پر غالب آجاتا ہے اُس کی دلیری اور جرأت فی الحقیقت میدان جنگ کی دلیری اور شجاعت سے بدرجہا زیادہ تعریف کے لائق ہے اور اس قسم کے مواقع جیسے کہ تاجر کو پیش آتے ہیں دنیا میں کسی شخص کو پیش نہیں آتے۔ وہ لاکھوں من غلہ ایسے اتفاقات کے بھروسے پر جو اس کے اختیار سے باہر ہیں بے دھڑک خرید کر کوٹھے اور کشتیاں بھر لیتا ہے، وہ لاکھوں کی بدنی بدتا ہے اور نقد روپیہ بائع کی جھولی میں ڈال کر محض امید کے سہارے پر بیٹھ رہتا ہے۔ وہ ایک شخص کے اعتبار پر جس کو کبھی اس نے آنکھ سے نہیں دیکھا اور جو اس سے سات سمندر پار رہتا ہے مال سے بھرا ہوا جہازوں کا بیڑا سمندر میں چھوڑ کر تسلی اور اطمینان سے پاؤں پھیلا کر سو رہتا ہے۔

ایک مصنف لکھتا ہے کہ "دور دراز ملک کا سوداگر جو اپنے دوسرے ہم پیشہ بھائی پر صرف خط و کتابت کے ذریعے سے اعتماد کرتا ہے اور اپنی دولت کا بھرا ہوا جہازوں کا بیڑا سمندر کی موجوں کے حوالے کر کے بے فکر ہو جاتا ہے، کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس اعلیٰ درجے کی انسانی خوبی پر نازاں نہ ہو۔"

جو قومیں صرف اس بنا پر کہ اُن کے آباواجداد بڑے تلوار کے دھنی، جنگجو اور سپاہی تھے، اپنے تئیں بہادر اور شجاع خیال کرتی ہیں ان کے لیے اپنی بہادری کی آزمائش کا اس سے بہتر کوئی موقع نہیں کہ وہ تجارت کے میدان میں آئیں۔ ان کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ وہ فی الواقع دلیر اور جری ہیں یا بزدل اور ڈرپوک۔

تجارت کے فوائد و برکات

الغرض تجارت کی کامیابی کے لیے جس کا مدار تاجر کے مقبول و معتمد خاص و عام ہونے پر ہے نہایت ضرور ہے کہ تاجر علاوہ عاقل اور مدبر ہونے کے عمدہ اخلاق اور عمدہ خصلتوں سے

آراستہ ہو اور اس لیے تجارت کو انسان کا معلم اور اتالیق کہا جائے تو کچھ بیجا نہیں۔

وہ صرف تاجر ہی کو نیکی نہیں سکھاتی بلکہ تمام ملک میں نیکی پھیلاتی ہے۔

وہ کسانوں کو ترقی زراعت کی ترغیب دلاتی ہے۔

وہ کاریگروں سے نوعِ انسان کی تمام آسائش و آرام کی چیزیں تیار کراتی ہے۔

وہ ایک ملک کی پیداوار دوسرے ملک میں اور ایک سرزمین کی برکت دوسری سرزمین میں پہنچا کر تمام دنیا کی حاجتیں رفع کرتی ہے۔

تجارت نے جو فائدے دنیا کی قوموں کو پہنچائے ہیں وہ شمار اور تعداد کی حد سے خارج ہیں۔ ایک مصنف تجارت کی نسبت لکھتا ہے کہ:

"لڑائی جو انسان کی خونریز دشمن اور ملکوں کی غارت کرنے والی دیوی ہے اور جو اب بھی ویسی ہی مہیب اور ہولناک ہے جیسی یونان کے مشہور شاعر ہومر کے زمانے میں تھی۔ اگر کبھی اس کی تیغِ خوں آشام ہمیشہ کے لیے میان میں جائے گی تجارت ہی کی بدولت جائے گی۔"

تجارت نے شائستگی کو دنیا میں پھیلایا ہے۔

اس نے تمام روئے زمین پر انسان کی ضرورت اور آسائش کے سامان برابر تقسیم کیے ہیں۔

اس نے علوم و فنون کی بیش قیمت اور مفید تحقیقوں، ایجادوں کو رواج دیا ہے۔

اس نے موجدوں کی طبیعت میں نئے نئے ایجاد و اختراع کی تحریک پیدا کی ہے۔

وہ علم اور دین کی اشاعت میں مدد دیتی ہے۔

تجارت اور ترقی ہمیشہ ہر جگہ لازم اور ملزوم رہی ہیں۔ انسان کے اندرونی قویٰ کی ترقی . . . علوم و فنون کی ترقی، جنرل انفورمیشن (معلومات عامہ) کی ترقی، اخلاق کی ترقی، ضوابط و قوانین کی ترقی، آزادی کی ترقی، غرض کہ ہر طرح کی ترقی ہی ترقی اس سے پیدا ہوئی ہے۔

اس نے ہمیشہ جس چیز کو جس درجے پر پایا ہے اس سے جدا ہوتے وقت اس کو بلند

سیڑھی پر چھوڑا ہے۔

وہ اول ایک ملک سے دوسرے ملک میں شائستگی کے بطور طلایہ کے جاکر رستہ تیار کرتی ہے اور پھر شائستگی کو اپنے ساتھ لے کر وہاں پہنچتی ہے۔

اُس نے وحشیوں کو انسان بنایا ہے۔

اُس نے عوام الناس اور امرا کو بادشاہی تک پہنچایا ہے۔

اُسی نے موروں (مسلمانوں) کو اپنے عہد میں دنیا کا عقل مند بنایا تھا۔

اُسی نے انگریزوں کو اکیلا بلا شرکت غیرے تمام ہندوستان کا وارث ٹھہرایا ہے"

۲۰۔ زبانِ گویا

(از "تہذیبِ اخلاق" مطبوعہ ۱۸۹۵ء)

اے میری بلبلِ ہزار داستان! اے میری طوطیِ شیوا بیان! اے میری قاصد! اے میری ترجمان! اے میری وکیل! اے میری زبان! سچ بتا تو کس درخت کی ٹہنی اور کس چمن کا پودا ہے؟ تیرے ہر پھول کا رنگ جدا اور تیرے ہر پھل میں نیا مزا ہے۔ کبھی تو ایک ساحر فسوں ساز ہے جس کے سحر کا نہ دم نہ جادو کا "تار"۔ کبھی تو ایک افعیِ جاں گداز ہے جس کے زہر کی دارو، نہ کاٹے کا منتر۔ تو وہی زبان ہے کہ بچپن میں کبھی اپنے ادھورے بولوں سے غیروں کا جی لبھاتی تھی اور کبھی اپنی شوخیوں سے ماں باپ کا دل دُکھاتی تھی۔ تو وہی زبان ہے کہ جوانی میں کہیں اپنی نرمی سے دلوں کا شکار کرتی تھی اور کہیں اپنی تیزی سے سینوں کو فگار کرتی تھی۔

اے میری زبان! دشمن کو دوست بنانا اور دوست کو دشمن کر دکھانا تیرا ایک ادنیٰ کھیل ہے جس کے تماشے سینکڑوں دیکھنے باقی ہیں۔

اے میری بنی بات کو بگاڑنے والی! اور میرے بگڑے کاموں کو سنوارنے والی! روتے کو ہنسانا اور ہنستے کو رُلانا اور روٹھے کو منانا اور بگڑے کو بنانا نہیں معلوم تو نے کہاں سیکھا؟ اور کس سے سیکھا؟ کہیں تیری باتیں بس کی گانٹھیں ہیں اور کہیں تیرے بول شربت کے گھونٹ ہیں۔ کہیں تو شہد ہے اور کہیں حنظل، کہیں زہر ہے اور کہیں تریاق۔

اے زبان! ہمارے بہت سے آرام اور بہت سی تکلیفیں، ہمارے سینکڑوں نقصان اور ہزاروں فائدے، ہماری عزّت، ہماری ذلّت، ہماری نیک نامی، ہماری بدنامی، ہمارا سچ، ہمارا جھوٹ، صرف تیری ایک "ہاں" اور ایک "نہیں" پر موقوف ہے۔ تیری اس "ہاں" اور "نہیں" نے کروڑوں کی جانیں بچائیں اور لاکھوں کے سر کٹوائے ہیں۔

اے زبان! تو دیکھنے میں تو ایک پارۂ گوشت کے سوا کچھ نہیں، مگر تیری طاقت عین قدرتِ الٰہی ہے۔ دیکھ! اس طاقت کو رائگاں نہ کھو، اور اس قدرت کو خاک میں نہ ملا۔ سچائی تیرا جوہر ہے اور آزادی تیرا زیور۔ دیکھ اس جوہر کو برباد نہ کر اور اس زیور کو زنگ نہ لگا۔ تو دل کی امین ہے اور روح کی ایلچی۔ دیکھ دل کی امانت میں خیانت نہ کر اور روح کے پیغام پر حاشیے نہ چڑھا۔ اے زبان! تیرا منصب بہت عالی ہے اور تیری خدمت نہایت [illegible]۔ کہیں تیرا خطاب کاشفِ اسرار ہے اور کہیں تیرا لقب محرمِ راز۔ علم کہ ایک خزانۂ غیبی ہے اور دل اس کا خزانچی۔ حوصلہ اس کا قفل ہے اور تُو اس کی کنجی۔ دیکھ اس قفل کو بے اجازت نہ کھول اور اس خزانے کو بے موقع نہ اُٹھا۔ وعظ و نصیحت تیرا فرض ہے اور تلقین و ارشاد تیرا کام۔ ناصحِ مشفق تیری صفت ہے اور مرشدِ برحق تیرا نام۔ خبردار! اس نام کو عیب نہ لگا۔ اور اس فرض سے جی نہ چرانا۔ ورنہ یہ منصبِ عالی تجھ سے چھن جائے گا اور تیری بساط میں وہی ایک گوشت کا چھیچھڑا رہ جائے گا۔ کیا تجھ کو یہ امید ہے کہ تو جھوٹ بھی بولے اور طوفان بھی اُٹھائے۔ تُو غیبت بھی کرے اور تہمت بھی لگائے، تو فریب بھی کرے اور چغلیاں بھی کھائے اور پھر وہی زبان کی زبان کہلائے۔ نہیں! ہرگز نہیں!! اگر تُو سچی زبان ہے تو زبان ہے ورنہ زبون ہے۔ بلکہ سراسر زیاں ہے۔ اگر تیرا قول صادق ہے تو شہد فائق ہے ورنہ تھوک دینے کے لائق ہے۔ اگر تو راست گفتار ہے تو ہمارے منہ میں اور دوسروں کے دلوں میں جگہ پائے گی ورنہ گدی سے کھینچ کر نکالی جائے گی۔

اے زبان! جنھوں نے تیرا کہنا مانا اور جو تیرا حکم بجا لائے انھوں نے سخت الزام اُٹھائے اور بہت پچھتائے۔ کسی نے انھیں فریبی اور مکار کہا۔ کسی نے گستاخ اور منھ پھٹ ان کا نام رکھا۔ کسی نے ریاکار ٹھہرایا اور کسی نے سخن ساز۔ کسی نے بدعہد بنایا، اور کسی نے غمّاز۔ غیبت اور بہتان۔ مکر اور افترا، طعن اور تشنیع، گالی اور دشنام، پھکڑ اور ضلع جگت اور پھبتی۔ غرض دنیا بھر کے عیب ان میں نکالے۔ اور وہ ان سب کے سزاوار ٹھہرے۔ اے زبان! یاد رکھ، ہم تیرا کہنا نہ مانیں گے اور تیرے قابو میں نہ آئیں گے ہم تیری ڈور ڈھیلی نہ چھوڑیں گے اور تجھے مطلق العنان نہ بنائیں گے ہم ہی

جان پر کھیلیں گے پر جھوٹ نہ بولائیں گے۔ ہم سر کے بدلے ناک نہ کٹوائیں گے۔

اے زبان ہم دیکھتے ہیں کہ گھوڑا جب اپنے آقا کو دیکھ کر محبت کے جوش میں آتا ہے تو بے اختیار ہنہناتا ہے۔ اور کتا جب پیار کے مارے بیتاب ہو جاتا ہے تو اپنے مالک کے سامنے دم ہلاتا ہے۔ سبحان اللہ! وہ نام کے جانور اور ان کا ظاہر و باطن یکساں۔ ہم نام کے آدمی ہیں۔ ہمارے دل میں "نہیں" اور زبان پر "ہاں"۔

الٰہی! اگر ہم کو رخصتِ گفتار ہے تو زبان راست گفتار دے۔ اور اگر دل پر تجھ کو اختیار ہے تو زبان کا ہم کو اختیار دے جب تک دنیا میں رہیں سچے کہلائیں اور جب تیرے دربار میں آئیں تو سچے بن کر آئیں۔ آمین۔

سرسیدؒ کی مذہبی خدمات

(از محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج میگزین۔ علی گڑھ جلد ۶ نمبر ۵ بابت ماہ مئی ۱۸۹۸ء از صفحہ ۱۱۵ تا ۱۲۶)

سرسید کی لائف میں من جملہ اُن مختلف حیثیتوں کے جو اُن کی ذات میں جمع تھیں سب سے زیادہ مہتم بالشان اور سب سے زیادہ لحاظ کے قابل بلکہ اُن کی تمام لائف کی جان مذہبی حیثیت ہے جس پر اُن کی لائف میں جو عنقریب شائع ہونے والی ہے۔ ہر ایک پہلو سے نظر ڈالی گئی ہے اور متعدد ابواب میں اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہاں نہایت اختصار کے ساتھ ہمیں صرف تین امور پر بحث کرنی منظور ہے۔

جو کچھ گزشتہ چالیس برس میں سرسید نے مذہب کے متعلق لکھا، اس کے لکھنے کا منشاء کیا تھا؟

یہ لٹریچر مسلمانوں کی مذہبی تصنیفات میں کیا درجہ رکھتا ہے؟

ان تصنیفات سے اسلام یا مسلمانوں کے حق میں کیا نتیجے مرتب ہوئے؟

سرسید کا خمیر اُس شہر کی خاک سے ہوا تھا جو کبھی ہندوستان میں اسلام کا مرکز اور مسلمانوں کا ملجا و ماویٰ تھا اور جس زمانے میں وہ پیدا ہوئے، یہ وہ زمانہ تھا کہ دہلی کے مسلمانوں کے پاس کوئی چیز جس پر وہ فخر کر سکیں، دینِ اسلام کے سوا باقی نہ رہی تھی اور اس لئے وہاں کے شریف مسلمان خاندان مذہب کو زیادہ مضبوط پکڑتے جاتے تھے۔ خصوصاً سرسید کا خاندان اس بات میں کسی قدر امتیاز رکھتا تھا۔ اس کو ایسے تین مقدس گھرانوں سے قوی تعلق تھا جو نہ صرف دلّی میں بلکہ ہندوستان کے دُور دراز حصّوں میں مذہبی مقتدا و پیشوا سمجھے جاتے تھے۔ ان کے باپ کی ننھیال خواجہ میر درد[1] کے خاندان سے علاقہ رکھتی تھی۔

---

[1] خواجہ میر درد خواجہ میر ناصر کے بیٹے اور شاہ گلشن کے مُریدوں میں سے تھے (باقی اگلے صفحہ پر)

خود سرسید کی ننھیال کے تمام زن و مرد شاہ عبدالعزیزؒ کے خاندان سے عقیدت رکھتے تھے اور اُن کے باپ سید متقی شاہ غلام علیؒ صاحب کے نہایت مقرب اور مخصوص ارادت مندوں میں سے تھے۔ شاہ صاحب ان کو اپنا فرزند اور ان کی اولاد کو اپنے پوتا پوتی سمجھتے تھے۔ سرسید کی والدہ جن کی آغوش تربیت میں انھوں نے پرورش پائی تھی۔ نہایت دین دار اور شاہ غلام علیؒ صاحب کی مُرید تھیں اور اُن کے خاندان کے چھوٹے بڑے عموماً فرائضِ مذہبی کے پابند تھے پس سرسید نے آنکھ کھول کر اپنے دائیں بائیں مذہب ہی کا جلوہ دیکھا تھا اور چونکہ اُن کے خاندان کے ایسے گھرانوں سے جو جامع شریعت و طریقت سمجھے جاتے تھے، ارادتمندانہ تعلق تھا اور اُن کے گھر میں ہر ایک کام ان بزرگوں کی ہدایت و ارشاد کے موافق ہوتا تھا اس لیے اُن کا گھر بہت سی جاہلانہ رسموں اور بیہودہ اوہام اور لغو عقائد سے پاک تھا جن میں اکثر جاہل مسلمانوں کے خاندان گرفتار ہوتے ہیں۔ گویا سرسید کو ہوش سنبھالتے ہی اسلام کا وہ نقشہ نظر پڑا تھا جو عامیانہ خیالات، اور جاہلانہ رسوم اور بدعات کے میل کچیل سے بالکل صاف تھا۔ پھر حسن اتفاق سے چند ایسے اسباب جمع ہو گئے کہ ان کو مولانا اسمٰعیل شہیدؒ[۱] کی تصنیفات سے جن میں آزادی کی روح موجود تھی، زیادہ دل چسپی ہو گئی اور اس طرح وہ تقلید کی بندشوں سے رفتہ رفتہ آزاد ہوتے گئے۔ مگر غدر کے زمانے تک اُن کے مذہبی خیالات میں کوئی بڑا انقلاب

نوٹ صفحہ ٢٠١ سے آگے:۔ سلوک و تصوف میں آپ کی بہت سی تصانیف قابلِ دید ہیں متصوفانہ رنگ کے اُردو فارسی اشعار بھی خوب کہتے تھے۔ اُردو شعرا میں بہت بڑا پایہ رکھتے تھے۔ تمام عمر دہلی سے قدم باہر نہیں نکالا۔ نہایت متوکل اور بے پرواہ بزرگ تھے ١١٣٠ھ میں پیدا ہوئے اور ٩٦ سال کی عمر پا کر ١١٩٩ھ میں وفات پائی۔

[۱] مولانا اسمٰعیل شہیدؒ: حضرت شاہ عبدالغنی کے فرزند اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کے پوتے تھے۔ نہایت ذہین و طباع، عالم و فاضل بزرگ اور خاندان کا فخر تھے۔ تبلیغ اسلام کا خاص جوش رکھتے تھے۔ آپ نے فقہ اور ردِ شرک و بدعت میں بہت سی کتابیں تحریر فرمائی ہیں۔ ١٢ ربیع الثانی ١١٩٣ھ (١٧٧٩ء) کو پیدا ہوئے۔ اور مولانا سید احمد رائے بریلوی اپنے پیر کی زیر قیادت سکھوں سے جہاد کرتے ہوئے بالاکوٹ کے قریب ذیقعدہ ١٢٤٦ھ مطابق مئی ١٨٣١ء میں شہید ہوئے۔

واقع نہیں ہوا۔ وہ اسی شرک و بدعت اور تقلید و عدم تقلید وغیرہ کے جھگڑوں میں الجھے رہے اور اسی لیے ان کی وہ مذہبی تصنیفات جو غدر سے پہلے کی ہیں، چنداں امتیاز نہیں رکھتیں۔

ایک ہندی دوہے میں علمی بحث و مباحثے کو گڑیوں کے کھیل سے اور خدا کی معرفت کو بیاہ سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ یعنی جب انسان کو خدا کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے تو جس طرح لڑکیاں بیاہ کا لطف اٹھانے کے بعد گڑیوں کے کھیل کو محض فضول سمجھنے لگتی ہیں۔ اسی طرح آدمی خدا کی معرفت کا مزا پاکر علمی قیل و قال اور مذہبی بحث و جدال کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے۔ غدر کے بعد سرسید کا بھی یہی حال ہوا۔ مسلمانوں کی ہمدردی نے مذہبی تحقیقات کا جو مفید پہلو ان کو سجھایا تھا اور جو لذت اس کاوش اور خلش میں ان کو حاصل ہوئی تھی۔ اس کے آگے ان کو اپنے پہلے مذہبی خیالات بچوں کا کھیل معلوم ہونے لگے۔

مسلمان مذہبی تعصبات میں سخت بدنام تھے اور انھیں تعصبات کی بدولت غدر کے بعد ان کی پولٹیکل حالت کو سخت صدمہ پہنچا تھا اور آئندہ اس سے بھی سخت تر آفتوں کا سامنا نظر آتا تھا۔ سرسید کو جس طرح اسلام کے دین برحق ہونے کا یقین تھا اسی طرح اس بات کا بھی یقین تھا کہ سچا دین انسان کے حق میں خدا کی رحمت ہونا چاہیے۔ اس لیے انھوں نے سمجھا کہ اسلام ہرگز ایسے تعصبات کی تعلیم نہیں دے سکتا جن کی بدولت ہندوستان کی چھ کروڑ مخلوق طرح طرح کی آفات و حوادث کا نشانہ بن رہی ہے، ورنہ بجائے اس کے کہ اسلام کو خدا کی رحمت سمجھا جائے وہ انسان کے حق میں سخت ترین عذاب الٰہی ہوگا۔

ا۔ مسلمانوں کی پولٹیکل مشکلات

اگرچہ گزشتہ زمانوں میں اسلام کو جس قسم کی مشکلات پیش آئیں علمائے اسلام نے ان کو بخوبی حل کیا اور اپنے فرائض کا حق پورے طور پر ادا کر گئے۔ مگر جو مشکل اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کو درپیش تھی۔ چوں کہ وہ کبھی ان کے زمانے میں پیش نہیں آئی تھی، اس لیے ان کو اس کے حل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ ایک ہزار برس سے زیادہ عرصے تک مسلمانوں کو کسی غیر قوم کی رعایا ہونے کا بہت ہی کم اتفاق ہوا تھا۔ وہ ایک آدھ

مستثنیٰ صورت[1] کے سوا ہمیشہ جہاں کہیں رہے حکمراں رہے اور غیر قومیں ان کی محکوم رہیں۔ اس لیے جو برتاؤ مسلمانوں کو اصول اسلام کے موافق کسی غیر قوم کے محکوم ہونے کی حالت میں اس قوم کے ساتھ رکھنا چاہیے اس کی طرف کبھی کسی کی توجہ مبذول نہیں ہوئی۔

حالانکہ اسلام نے بادشاہ کے فرائض، اس کی حالت کے موافق اور رعیت کے فرائض اس کی حالت کے موافق اور اسی طرح ہر طبقے کے مصالح معاش جدا جدا بیان کر دیے تھے۔ مگر چونکہ مسلمان کبھی (الا ماشاء اللہ) کسی کی رعیت بن کر نہیں رہے تھے، اس لیے رعیت ہونے کی حالت میں بھی وہ رعیت کے فرائض سے بے خبر رہے۔ انھوں نے اقبال کے دور دورہ میں ہمیشہ زمانے کو اپنے موافق دیکھا تھا اس لیے ادبار کی حالت میں بھی وہ اسی بات کے متوقع رہے کہ زمانہ اب بھی ہمارا ساتھ دے گا، ہم کو زمانے کا ساتھ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

۲۔ مسلمانوں کی مذہبی مشکلات

یہ مشکلات تو مسلمانوں کی پولیٹیکل حالت سے علاقہ رکھتی تھیں مگر ان کے سوا دینیات

---

[1] اس سے مراد تاتاریوں کی سلطنت ہے جو ایک مدت تک ایران و ترکستان اور دیگر ممالک میں مسلمانوں پر حکمراں رہے۔ لیکن آغاز تسلط میں جب کہ چنگیز خاں نے خروج کیا تاتاریوں اور مسلمانوں کے تعلقات ہرگز ایسے نہ تھے جیسے بادشاہ اور رعیت میں ہونے چاہئیں۔ چنگیز خاں کہتا تھا کہ خدا نے مجھ کو مسلمانوں کو غارت کرنے کے لیے پیدا کیا ہے اور مسلمان اس کو فی الواقع اپنے حق میں غضب الٰہی جانتے تھے۔ مگر آخر کو تاتاریوں کی سلطنت کی باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھ میں آگئی تھی جس کو وہ ایک اسلامی سلطنت سمجھنے لگے تھے۔ یہاں تک تین چار پشت کے بعد خود بادشاہ مسلمان ہو گیا اور اخیر تک وہ ایک اسلامی سلطنت رہی۔ پس اول میں بسبب غایت عداوت کے اور آخر میں بہ سبب کمال رسوخ کے وہ تعلقات پیدا ہی نہیں ہوئے جو بادشاہ اور رعیت میں ہونے چاہئیں اور اس لیے مسلمان ایک غیر قوم کی حکومت میں بھی فرائض رعیت سے بے خبر رہے۔

سخت اور خطرناک مشکلیں خاص کر مذہب اسلام کو اُس وقت درپیش تھیں۔

اولاً عیسائی مشنری (مبلغ)، جو تمام دنیا میں دین مسیحی کی اشاعت میں سرگرم ہیں اور برٹش انڈیا میں اس کے پھیلانے کو اپنا قدرتی حق سمجھتے ہیں۔ ان کا دانت ہندوستان کی قوموں میں سب سے زیادہ مسلمانوں پر تھا۔ اگرچہ غدر سے پہلے اکثر مسلمان عالموں نے ان کے مقابلے میں اپنے قدیم طریقہ مناظرہ کے موافق عمدہ عمدہ کتابیں لکھی تھیں اور بعض نے اُن سے زبانی مناظرے بھی کئے تھے جن سے بلا شبہ مسلمانوں کو بہت بڑا فائدہ ہوا اور وہ عیسائیوں کا شکار ہونے سے بچ گئے لیکن غدر کے بعد مشنریوں نے مناظرہ کا قدیم طریقہ بالکل بدل دیا تھا اور جس قسم کے اعتراض انھوں نے اب اسلام اور داعیٔ اسلامؐ پر کرنے شروع کئے تھے ان کی تردید کے لیے مسلمانوں کو بھی مناظرے کا نیا طریقہ اختیار کرنا ضروری تھا کیونکہ جس طرح آج کل کی نو ایجاد بندوقوں کے سامنے پرانے توڑے دار بندوقیں کچھ کام نہیں دے سکتیں اسی طرح مشنریوں کے نئے طریقہ مناظرہ سے ہمارے قدیم طرز کے مناظرہ کا عہدہ برآ ہونا دشوار تھا۔ چنانچہ سر ولیم میور[1] کی لائف آف محمدؐ جو چار جلدوں میں لکھی گئی تھی، اس کی نسبت عیسائیوں میں مشہور تھا کہ کوئی کتاب اسلام کی جڑ کاٹنے والی عیسائی دنیا میں ایسی نہیں لکھی گئی جیسی یہ ہے۔ انگریزی تعلیمیافتہ نوجوان مسلمانوں کے حق میں مشنریوں کا نیا طریقہ نکتہ چینی حد سے زیادہ خطرناک تھا اور اس لیے ضرور تھا کہ مسلمان بھی اسلام کی طرف سے مدافعت کا نیا طریقہ اختیار کریں۔

دوسری مشکل جو اسلام کے حق میں پہلی مشکل سے بہت زیادہ خطرناک تھی وہ یہ تھی کہ انگریزی تعلیم جس سے ہندوستانیوں کو کسی طرح مفر نہ تھا۔ روز بروز ہندوستان میں پھیلتی جاتی تھی اور غدر کے بعد اس کی ترقی کی رفتار نہایت تیز ہو گئی تھی۔ اگرچہ غدر سے پہلے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی کچھ اشاعت نہیں ہوئی تھی، لیکن غدر کے بعد اس کے بغیر مسلمانوں کا اُبھرنا اور ہندوستان میں عزت سے رہنا محال ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ سر سید کو خود ان میں تعلیم

---

[1] سر ولیم میور صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ کے لفٹنٹ گورنر تھے۔

پھیلائی پڑی۔ حالانکہ انگریزی تعلیم کے نتائج اسلام کے حق میں مسلمانوں کی پریچنگ (تبلیغ مذہب) سے زیادہ اندیشہ ناک تھا۔ یورپ میں جو سخت صدمہ علوم جدید کی تعلیم سے دین عیسوی کو پہنچا تھا وہی صدمہ اُن کی اشاعت سے ہندوستان میں اسلام کو پہنچنے کا اندیشہ تھا، اور اس مشکل کا اس طرح مقابلہ کرنا کہ مغربی تعلیم مسلمانوں میں جاری نہ ہونے دی جائے، اول تو مسلمانوں کی طاقت سے باہر تھا کیونکہ وہ جس طرح ہندوستان میں روز بروز پھیلتی جاتی تھی، اسی طرح تمام دنیا میں یہاں تک ممالک اسلامیہ ترکی، مصر اور ایران وغیرہ میں بھی عام ہوتی تھی۔ دوسرے مغربی علوم کی تعلیم کو، اس خوف سے کہ مبادا مذہب اسلام کو ان سے صدمہ پہنچے روکنا اور ان کے انسداد میں گویا اس بات کو تسلیم کر لینا تھا کہ اسلام علوم جدیدہ کی روشنی کے آگے نہیں ٹھہر سکتا اور مثل دیگر مذاہب کے اسلام بھی سائنس کے حملے کی تاب نہیں لا سکتا۔

یہ تمام مشکلات ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کو در پیش تھیں اور چھ کروڑ مسلمانوں میں صرف ایک سید احمد خاں ان تمام مشکلوں کا سمجھنے والا، ان کے انجام کا سوچنے والا اور اُن کا مقابلہ کرنے والا تھا۔

ہمارے مسلم الثبوت علماء کو اول تو ان مشکلات کا احساس ہونا ہی دشوار تھا اگر بالفرض ان کو احساس بھی ہوتا تو ان مشکلات کا تدارک ان کے احاطۂ قدرت سے خارج تھا۔ کیونکہ تقلید کی بدولت ان میں اس بات کی قابلیت باقی نہیں رہی تھی کہ اگر مذہب کے متعلق کوئی ایسی نئی مشکل پیش آئے جو اگلے علماء کو پیش نہیں آئی، اور جس کا حل ان کی کتابوں میں صراحۃً موجود نہ ہو تو اس کے حل کرنے میں اپنی سمجھ بوجھ سے کام لے سکیں اور اس کا علاج خود قرآن و حدیث میں جو دینیات کے اصل مخرج ہیں تلاش کر سکیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ مذہبی مشکلات کے حل کرنے والی صرف فقہ اور تفسیر اور علمائے سلف کی کتابیں ہیں۔ قرآن محض تلاوت کے لئے، حدیث محض سند کے لیے عقل انسانی امور مذہبی میں محض معطل و بیکار رہنے کے لیے ہے اور بس۔

جو مشکلات اسلام اور مسلمانوں کو اس وقت در پیش تھیں ان کے مقابلے کے لیے کسی عالم متبحر کی ضرورت نہ تھی بلکہ ایک ایسے معمولی استعداد کے آدمی کی ضرورت تھی جو صاحب عقل سلیم

ہو۔ قدیم طریقۂ تعلیم کا منتر اس پر کارگر نہ ہوا ہو۔ دنیا کے حالات سے باخبر ہو۔ علوم جدیدہ کی طاقت سے واقف ہو۔ تقلید کی بندش سے آزاد ہو۔ لومۃ لائم سے خائف نہ ہو۔ اسلام اور مسلمانوں کا حقیقی خیر خواہ اور جاں نثار ہو۔

سرسید نے غدر کے زمانے سے لے کر اخیر دم تک ان تمام مشکلات کا مقابلہ کیا انھوں نے دلائلِ عقلیہ سے قرآن و حدیث کے حوالوں سے ممالک اسلامیہ کے موجودہ عملدرآمد سے بیشمار ثبوت اس بات کے دیے کہ عیسائیوں کے ساتھ سچے دل سے دوستی کا برتاؤ کرنا۔ ان کے ساتھ دوستانہ میل جول رکھنا۔ ان کے کھانوں اور دعوتوں میں شریک ہونا، مصالح دنیوی میں ان کی پیروی کرنا، ان کی زبان اور ان کے علوم سیکھنا۔ ان کے آڑے وقت میں کام آنا اُن کے مصائب میں ان کے ساتھ ہمدردی کرنا عین اسلام کی تعلیم کا مقتضا ہے اور جس طرح قرآن کی رو سے کوئی قوم عیسائیوں سے بڑھ کر مسلمانوں کی دوست نہیں ہے، اسی طرح مسلمانوں کو بھی اُن کا خالص و مخلص دوست ہونا ضرور ہے۔

اُنھوں نے پُرزور مذہبی دلائل سے ثابت کیا کہ انگریزی حکومت میں رہ کر مسلمانوں کا مذہبی فرض ہے کہ سلطنت کی اطاعت خیر خواہی اور وفاداری میں ثابت قدم رہیں اور جب کبھی سلطنت کو کوئی مشکل پیش آئے تو جان و دل سے اس کا ساتھ دیں۔ غرض ان کو طرح طرح سے عقلی اور نقلی دلائل کے ساتھ یقین دلایا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا عزت و آبرو سے رہنا اُسی حالت میں ممکن ہے جب کہ وہ برٹش گورنمنٹ کی وفادار اور خیر خواہ بن کر رہیں۔

سرسیّد کی تعلیم کا اثر

(قومی نفرت اور مذہبی تعصب دور ہوگیا)

اس باب میں جو کچھ سرسیّد نے لکھا اگرچہ وہ ایک آدھ بات کے سوا بالکل اصول اسلام کے مطابق تھا لیکن چونکہ اس میں بہت سی ایسی باتیں شامل تھیں جو ہندوستان کے مسلمانوں نے کبھی دیکھی یا سنی نہ تھیں اور نہ مذہبی تعصبات کے ساتھ قومی تعصب بھی شامل تھا اور جس شخص کی زبان یا قلم سے وہ باتیں نکلتی تھیں :۔ ایک دنیادار آدمی سرکار انگریزی کا ملازم اور

مذہبی تقدس کے لباس سے معرا تھا، اس لیے ایک مدت تک مخالفتیں ہوتی رہیں مگر آخر کار ہندوستان کے تمام سمجھ دار مسلمانوں کو سرسید کی نصیحتیں تسلیم کرنی پڑیں اور ان پر عمل کرنا پڑا۔

جو مسلمان مذہبی خیالات کے سبب انگریزی تعلیم سے نفرت کرتے تھے ان کے خیالات بدل گئے۔ یہاں تک کہ جن مولویوں نے مدرستہ العلوم کے قائم کرنے پر سرسید کے اوپر کفر کے فتوے لکھے تھے اُن میں سے بعض کی اولاد کو خود انگریزی تعلیم پاتے ہوئے دیکھا گیا۔

ترکی لباس جو انگریزی لباس سے بہت مشابہ تھا اور اس لیے مسلمان اُس کے سایہ سے بھڑکتے تھے، وہ مسلمان نوجوانوں میں عموماً پھیل گیا۔

ہزاروں آدمی میز کرسی پر چھری کانٹے سے کھانے لگے اور لاکھوں اس کو جائز اور مباح سمجھنے لگے۔

جو لوگ انگریزوں کے ساتھ کھانا کھانے پر سخت معترض تھے۔ وہ فخریہ اُن کی دعوتیں کرنے لگے اور اُن کے ہاں دعوتوں میں جانے لگے اور ان کے ساتھ انھیں کے ہاں کا ذبیحہ اور انھیں کے باورچی خانہ کا پکا ہوا ایک میز پر بیٹھ کر کھانے لگے۔

تعلیم کے لیے اولاد کو ولایت بھیجنے لگے جو وہاں جا کر انگریزوں کے ساتھ شیر و شکر ہو جاتے ہیں۔

"علی گڑھ محمڈن کالج" جہاں مسلمان طلبہ اپنے یورپین اُستادوں کے ساتھ بالکل اسی طریقے سے معاشرت رکھتے ہیں، جیسے مسلمان آپس میں ایک دوسرے سے رکھتے ہیں، وہاں کوئی مسلمان اپنی اولاد کے بھیجنے میں پس و پیش نہیں کرتا۔ الّا ماشاءاللہ

اسی قسم کی اور بہت سی سوشل تبدیلیاں جو مسلمانوں کی سوسائٹی میں سرسید کی مذہبی تحریروں سے ظہور میں آئی ہیں ایسی صاف اور صریح ہیں کہ کوئی شخص اُن کا انکار نہیں کر سکتا۔

ا۔ سرسید کے پولیٹکل کارنامے

اب دیکھنا یہ ہے کہ مسلمانوں کے پولیٹکل خیالات پر سرسید کی تحریروں نے کیا اثر کیا ہے؟

اگرچہ اکثر مذہبی مسائل میں لاکھوں مسلمان اب تک سرسید کے سخت مخالف رہے ہیں مگر جو کچھ انھوں نے گورنمنٹ اور رعیت کے تعلقات کی نسبت مذہب اسلام کی رو سے لکھا ہے اُس کو ہندوستان کے مسلمانوں نے بالاتفاق تسلیم کیا ہے۔ اور گو سرسید کو مسلمانوں نے اپنا مذہبی پیشوا نہیں مانا۔ لیکن شاید ہندوستان میں ایک ایسا مسلمان بھی نہ ہو گا جس کو اُن کے قومی پولٹیکل لیڈر ہونے میں کچھ تامل ہو۔ اس کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ انڈین نیشنل کانگرس جو درحقیقت کوئی باغیانہ یا خلاف قانون مجمع نہ تھا مگر مسلمانوں کی پولٹیکل حالت کے لحاظ سے اُن کا اس میں شریک ہونا سرسید کے نزدیک خلاف مصلحت تھا۔ جس وقت سرسید نے اس کی مخالفت کی اور مسلمانوں کو اس میں شریک ہونے سے روکا تو باستثنائے معدودے چند تمام ہندوستان کے مسلمان کیا سُنی اور کیا شیعہ کیا وہابی اور کیا غیر وہابی۔ کیا پڑھے لکھے اور کیا اَن پڑھ۔ کیا وہ لوگ جو سرسید کی پارٹی میں گنے جاتے تھے اور کیا وہ جماعتِ کثیر جو ہر بات میں ان کی مخالفت کرتی تھی، سب نے بالاتفاق "نیشنل کانگرس" سے ہمیشہ کے لیے صرف اس بنا پر علیحدگی اختیار کی کہ سید احمد خاں کے نزدیک ان کا شریک ہونا مناسب نہ تھا، اور لاکھوں نے ان کاغذوں پر آنکھیں بند کر کے دستخط کر دیے جو "پیٹریاٹک ایسوسی ایشن" نے اس بات کے ظاہر کرنے کو ولایت بھیجے تھے کہ ہندوستان کے مسلمان کانگرس میں شریک نہیں ہیں۔

سب سے زیادہ وفاداری اور لائلٹی (وفاداری) کی مستحکم بنیاد جو سرسید کی مذہبی تحریروں نے مسلمانوں میں قائم کی ہے وہ انگریزی تعلیم کی مزاحمتوں کو دور کر کے ان کو عام طور پر اُس کی طرف متوجہ کرنا اور خاص کر اُن کی تعلیم کے لیے "محمڈن کالج" قائم کرنا ہے جس کی وجہ سے نہایت وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ جس قدر اعلیٰ تعلیم مسلمانوں میں زیادہ پھیلتی جائے گی اسی قدر وہ تاج برطانیہ کے زیادہ وفادار اور گورنمنٹ کے زیادہ معتمد علیہ بنتے جائیں گے۔

یہاں تک ہم نے ایک نہایت مختصر بیان ان نتائج کا کیا جو سرسید کی ان تحریروں سے پیدا ہوئے جو انھوں نے مسلمانوں کی مذہبی غلط فہمیوں کی اصلاح کے لیے وقتاً فوقتاً شائع

کیں مگر ان کے سوا جو کچھ کہ انھوں نے حکمراں قوم کے ان شکوک و شبہات کے رفع کرنے کے لیے جو غدر کے بعد اسلام کے بعض مذہبی مسائل کی نسبت اُن میں پھیل گئے تھے، اور جن مسلمانوں کی پولیٹیکل حالت نہایت نازک ہو گئی تھی گزشتہ چالیس برس میں لکھا وہ بھی ایک دفترِ طویل الذیل ہے جس میں متعدد کتابیں اور رسالے اور بے شمار آرٹیکل شامل ہیں۔ اگرچہ ان تمام تحریروں میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جس کا شریعتِ اسلامیہ میں کافی ثبوت موجود نہ ہو، مگر جس بسط اور تفصیل کے ساتھ اور جس خوبی اور صفائی سے سرسید نے ان مضامین کو بیان کیا ہے، نہ اس صدی میں اور نہ گزشتہ اسلامی صدیوں میں (شاید اس وجہ سے کہ پہلے کبھی اُن کی ضرورت پیش نہیں آئی) کسی مسلمان عالم نے نہیں لکھا۔

ان تحریروں کا مفصل حال اور جو اثر انھوں نے حکمراں قوم کے دل پر کیا اس کو سرسید کی لائف میں جو عنقریب چھپنے والی ہے دیکھنا چاہیے۔ یہاں صرف اس قدر لکھنا کافی ہے کہ سرسید کی اُن تحریروں سے جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے انگریزوں کی بہت کچھ غلط فہمیاں جو اُن کو مسئلہ جہاد، وہابیوں کے اصول اور بعض دیگر مسائل کی نسبت تھی، رفع ہو گئی ہیں۔

سرسید ہی کی تحریر کا یہ اثر تھا کہ جس وقت ڈاکٹر ہنٹر کی اس کتاب پر جو انھوں نے غدر سے دس بارہ برس بعد مسلمانوں اور خاص کر وہابیوں کے برخلاف لکھی تھی سرسید کا ریویو ہندوستان اور انگلستان میں شائع ہوا تھا تو تمام انگریز جن کو ڈاکٹر موصوف کی کتاب نے مسلمانوں پر نہایت برافروختہ کر رکھا تھا، سب کے خیالات بالکل بدل گئے اور ڈاکٹر ہنٹر جیسے مشہور اور نامور مصنف پر اعتراضوں کی بوچھار پڑنے لگی۔ یہاں تک ہندوستان کے ایک اینگلو انڈین اخبار نے ان کی نسبت صاف لکھ دیا کہ "اصلی واقعات کے محقق ہونے کی ناموری ان کے (یعنی ڈاکٹر ہنٹر کے) ہاتھ سے ایسی گئی ہے کہ پھر کبھی ان کو میسر ہونے والی نہیں ہے"، اور ایک جلیل القدر حاکم نے جو غالباً سر ولیم میور تھے، وہابیوں کی نسبت جن کی صفائی کے لیے سرسید نے ریویو لکھا تھا یہ ریمارک کیا کہ "وہابی وہ ہے جو خالصاً خدا کی عبادت کرتا ہو، موحد، اور اس کا اسلام ہوائے نفسانی اور بدعت کی آمیزش سے پاک ہو، اس کو یہ کہنا کہ وہ ہمیشہ دربردہ تخریبِ سلطنت کی فکر میں رہتا ہے اور چپکے چپکے منصوبے باندھتا

کرتا ہے اور غدر اور بغاوت کی تحریک کرتا ہے محض تہمت ہے۔"

سر الیفرڈ لائل اپنے ایک آرٹیکل (مضمون) میں جو سرسید کے ریویو کے بعد تھیالوجیکل ریویو میں شائع ہوا تھا مسٹر ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریمارک کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "اس مصنف کو مبالغے کا جن بسا اوقات نہایت پریشان کرتا ہے اور بہتر ہوتا اگر اس جن کو وہ اتار دیتا" ہم نے سنا ہے کہ کئی برس پہلے سے جو بنگال میں وہابیوں کی گرفتاری برابر جاری تھی سرسید کا ریویو نکلنے کے بعد پھر کوئی وہابی گرفتار نہیں کیا گیا۔

انھیں دنوں میں تہذیب الاخلاق کے مذہبی مضامین دیکھ کر سرسید کے ایک انگریز دوست نے ان کو لکھا تھا کہ:-

"تہذیب الاخلاق نے ثابت کر دیا کہ اسلام تنگ و تاریک رستہ نہیں ہے جیسا کہ خیال کیا جاتا تھا"

سب سے پہلے جبکہ غدر کو دو ہی تین برس گزرے تھے سرسید کو اس مقصد کے پورا کرنے کے لیے کہ مسلمانوں اور عیسائیوں میں مصالحت کرائی جائے اور دونوں قوموں کے مذہبی تعصبات اور مذہبی غلط فہمیوں کو دور کیا جائے، ایک عظیم الشان کام کا خیال آیا تھا جس کا ان سے پہلے تیرہ سو برس میں کسی مسلمان کو خیال نہیں آیا۔

انھوں نے نہایت مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ بائیبل کی تفسیر اہل اسلام کے اصول کے موافق لکھنی شروع کی تھی جس کی صرف دو جلدیں چھپنے پائی تھیں کہ مالی مشکلات کے سبب اس ارادے سے دست بردار ہونا پڑا۔

اس تفسیر کی نسبت فرانس کا مشہور اورینٹلسٹ (مستشرق) مسٹر گارسن ڈی ٹاسی[1] پروفیسر اردو لٹریچر اپنے ایک لکچر میں لکھتا ہے کہ:-

---

[1] ڈی تاسی ۱۷۹۴ء میں فرانس میں پیدا ہوا اور وہیں ۱۸۷۸ء میں وفات پائی۔ اکثر یورپین زبانوں کے علاوہ عبرانی، سریانی، سامری، عربی، فارسی زبانوں کا ماہر تھا۔ اردو زبان کا پروفیسر تھا۔ اردو مصنفین اور شعراء کا بہت بڑا تذکرہ تین جلدوں میں لکھا ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سی کتابیں اردو زبان اور اس کے قواعد پر تصنیف کی ہیں۔ اردو کے محسنوں میں سے ہے۔

"میں اپنے آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ یہ کتاب ایسی زبان میں لکھی گئی ہے جس کا سکھانا میرا فرض ہے، کیونکہ مجھ کو یقین ہے کہ یہ پہلا ہی موقع ہے کہ کسی مسلمان نے نہ صرف اُردو میں بلکہ ایشیا کی کسی بھی زبان میں اس قسم کے مضمون پر ایسی بسیط اور مکمل بحث کی ہو۔"

یہ کتاب اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں لکھی گئی تھی تاکہ ہندوستان کے مسلمان اور یورپ کے عیسائی دونوں اس کے مضامین سے مطلع ہوں اور اس کے نسخے بہ نسبت ہندوستان کے یورپ میں زیادہ شائع ہوئے تھے۔

غالباً اسی کتاب کا یہ نتیجہ ہے کہ ٹرکی اور مصر وغیرہ کے کئی عیسائی عالموں نے جیسا کہ سرسید کی لائف میں مفصل بیان کیا گیا ہے۔ اسلام اور کرسچینٹی (عیسائیت) میں اتحاد اور مصالحت پیدا کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ یہاں تک کہ جس طرح سرسید نے اپنی تفسیر میں دعویٰ کیا ہے کہ تثلیث کا مسئلہ انجیل کی کسی آیت سے ثابت نہیں ہوتا۔ اسی طرح مصر کے ایک عیسائی عالم نے جو اخبار الشہادۃ الحق کا اڈیٹر ہے اپنی کتاب "وحدۃ الادیان و وحدۃ الایمان فی التوراۃ والانجیل والقرآن" میں لکھا ہے کہ تثلیث کا مسئلہ بائبل میں کہیں نہیں ہے۔ اس لیے عیسائیوں کی ہٹ دھرمی ہے کہ قرآن کے عمدہ عقیدۂ توحید کو نہ مانیں۔

۲۔ سرسیّد کی مذہبی خدمات

اب ہم نہایت مختصر ذکر سرسید کی اس غیر معمولی سرگرمی اور عجیب و غریب لیاقت کا کرتے ہیں جو دین اسلام کی حمایت میں بہ حیثیت اس کے دین برحق ہونے کے آخر دم تک اُن سے ظاہر ہوتی رہی ہے اور جس کی رو سے ٹھیک طور پر اُن کو اسلام کے جدید علم کا موجد اور سائنس اور مذہب میں دائمی صلح کی بنیاد ڈالنے والا کہا جا سکتا ہے۔

جو کچھ سرسید نے اسلام کی حمایت میں بمقابلہ عیسائیوں کے لکھا ہے اس میں سب سے زیادہ لحاظ کے قابل وہ بارہ واسٹے یا خطبے ہیں جو انھوں نے سرولیم میور کی کتاب لائف آف محمدؐ کی پہلی جلد کے جواب میں لکھے ہیں اور جو اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں چھپ گئے

ہیں لیکن جو شخص اس کتاب کی اصل خوبی اور مصنف کی لیاقت سے پوری پوری واقفیت حاصل کرنی چاہے، اس کو چاہیے کہ اُردو اڈیشن کا مطالعہ کرے کیونکہ انگریزی اڈیشن درحقیقت اردو اڈیشن کا خلاصہ ہے جس میں بہت سی باتیں بہ نسبت اُردو اڈیشن کے نہایت اختصار کے ساتھ بیان ہوئی ہیں۔ چونکہ اس کتاب کا لکھنا سرسید کی مذہبی خدمات میں ایک جلیل القدر خدمت ہے اور اس کا بیان بہت طولانی ہے جس کی اس مضمون میں گنجائش نہیں ہے۔ اس لیے ہم اس موقع پر اُس کی نسبت زیادہ لکھنا نہیں چاہتے کیوں کہ سرسید کی لائف میں اس کا مفصل بیان کیا گیا ہے یہاں صرف اس قدر سمجھ لینا چاہیئے کہ سرسید سے پہلے جہاں تک ہم کو معلوم ہوا ہے کبھی کسی مسلمان نے مثل خطبات احمدیہ کے کوئی ایسی کتاب جس میں اسلام کی خوبیاں ظاہر کی گئی ہوں یا اُس کے مخالفوں کے اعتراضات کے جوابات دیے گئے ہوں اُن قوموں کے ملک میں جا کر جن کو مسلمان گمراہ سمجھتے ہیں اور جن پر اسلام کا عرض کرنا فرض جانتے ہیں انھیں قوموں کی زبان میں لکھ کر شائع نہیں کی۔ ایک بہت بڑے عیسائی عالم ریونڈ ہوپر نے جو ایک زمانے میں لاہور ڈیوننٹی کالج کے پروفیسر تھے، میرے ایک مسلمان دوست سے کہا تھا:-

"خطبات احمدیہ لکھنے سے سید احمد خاں نے اسلام کی ایک ایسی خدمت کی ہے جو تیرہ سو برس میں کسی مسلمان سے بن نہیں آئی تھی۔"

اگرچہ ہندوستان کے مسلمانوں نے اب تک اس کتاب کی کچھ قدر نہیں کی بلکہ معدودے چند کے سوا اس کو کسی مسلمان نے دیکھا بھی نہیں مگر امید ہے کہ جب وہ ان ضرورتوں کو سمجھیں گے جو مسلمانوں اور اسلام کو فی زمانا درپیش ہیں اور جن کو سید احمد خاں کے سوا بہت ہی کم آدمیوں نے اب تک سمجھا ہے تو اُس کی صرف قدر ہی نہیں کریں گے بلکہ فخر کریں گے کہ اس کا لکھنے والا ایک ہندوستان کا مسلمان تھا۔ جس زمانے میں سرسید لندن میں یہ کتاب لکھ رہے تھے اس وقت ٹرکی کے ایک مسلمان عالم سے وہاں ان کی ملاقات ہوئی تھی سرسید نے اپنی کتاب کے چند مقالات اس کو سنائے تو اُس کا یہ حال تھا کہ وہ بار بار سرسید کے ہاتھ چومتا تھا اور رہچپا جاتا تھا۔

کرنل گریہم سرسید کی لائف میں اسی خطبات احمدیہ کی نسبت لکھتے ہیں :-

"جو لوگ (یعنی انگریز) مذہبی باتوں سے دل چسپی رکھتے ہیں، ان کو چاہیئے کہ اس کتاب کو غور سے پڑھیں۔ دینِ محمدی فی زمانناً انگریزوں کے نزدیک بالکل ایک غیر معقول اور سخت متہم دین ہے اور وہ اس کو ایک روحانی آفت خیال کرتے ہیں، جیسے کہ ہمارے بزرگ اس صدی کے شروع میں بونا پارٹ کو ایک جسمانی آفت خیال کرتے تھے۔ وہ (یعنی اسلام) عموماً ایک تلوار کا مذہب خیال کیا جاتا ہے اور ہر ایک چیز تعصب، مغائرت اور تنگ دلی کی اس میں خیال کی جاتی ہے۔ لیکن ہمارے ناظرین کتاب جو اس غلطی میں مبتلا ہیں جب سید احمد خاں کی اس کتاب کو غور سے پڑھیں گے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ بالکل دوسرے خیالات لے کر اٹھیں گے۔ ہمارے مصنف (یعنی سید احمد خاں) نے اپنے دلی دوست سر ولیم میور کی کتاب لائف آف محمدؐ کی تحریروں کی مخالفت کی ہے اور خوب برچھیاں توڑی ہیں اور میں خیال کرتا ہوں کہ بے تعصب اور دقیقہ سنج ناظرین کتاب بہت سی باتوں میں سر ولیم میور کے خلاف فیصلہ دینے میں اتفاق کریں گے۔"

انگلستان کے اخبار اکوائرر میں جب خطباتِ احمدیہ وہاں شائع ہوئی ایک مبسوط ریویو (جس کا خلاصہ سرسید کی لائف میں درج کیا گیا ہے) کسی آزاد خیال انگریز نے اس کتاب پر لکھا تھا، جس میں توقع سے بہت زیادہ اس کی تعریف کی تھی اور بڑے بڑے اہم مسائل میں سرسید کے جوابوں کو تسلیم ہی نہیں کیا تھا بلکہ ان کی حد سے زیادہ داد دی تھی اور سر ولیم میور نے ڈاکٹر اسپرنگر کے مقابلے میں سرسید کی کامیابی کا اعتراف کیا تھا۔ اس سے بہتر ایک ایسی کتاب کے حق میں جو عیسائیوں کے مقابلے میں لکھی گئی ہو اور کیا شہادت ہو سکتی ہے کہ خود عیسائی قوم کے متعدد ممبروں نے اس کی نسبت ایسی عمدہ رائے ظاہر کی ہے۔

اس کتاب میں چند جزوی اختلافات کے سوا جن کا ایک محقق مصنف کی کتاب میں ہونا لابدی ہے، کوئی ایسی بات نہیں ہے جو جمہور اسلام کے خلاف ہو، اور امید ہے کہ جس قدر

تعصبات کا طوفان فرد ہوتا جائے گا اور اس کے فرد ہونے کا وقت اب آگیا ہے، اسی قدر اس کتاب کی وقعت روز بروز مسلمانوں میں زیادہ ہوتی جائے گی۔

سب سے زیادہ اہم اور قابل غور سرسید کی وہ مذہبی خدمت ہے جو ان کے اخیر دم تک برابر جاری رہی۔ یعنی تفسیر القرآن کا لکھنا جس کا اصل مقصد تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں کے خیالات کی اصلاح کرنا اور اسلام کو سائنس کے حملوں سے بچانا تھا۔ جس نیت سے سرسید نے یہ تفسیر لکھنی شروع کی اور جن ضرورتوں نے ان کو اس کے لکھنے پر مجبور کیا تھا اُس کا مفصل بیان انھوں نے اپنے ایک لکچر میں کیا ہے جو لاہور میں اسلام پر دیا گیا تھا اور جو سفرنامۂ پنجاب میں اور ان کی اسپیچوں اور لکچروں کے مجموعے میں چھپ گیا ہے اس لکچر میں انھوں نے اس تفسیر کے لکھنے کا اصل منشا ایسی سچائی اور خلوص اور جوش اسلامی کے ساتھ بیان کیا تھا کہ ان کے ایک سخت مخالف مولوی نے جو ان کے برخلاف رسالے شائع کرتے تھے اور ان کو نفرین و ملامت کے گمنام خط لکھتے تھے، لکچر ختم ہونے کے بعد علی رؤس الاشہاد اپنی غلط فہمی کا اقرار کیا۔ اور سرسید سے اپنے قصوروں کی معافی چاہی اور خود اپنے اوپر یہ جرمانہ کیا کہ اپنی ایک پوری تنخواہ کالج کے چندے میں دی۔

اس تفسیر پر بھی سرسید کی لائف میں مکمل ریویو کیا گیا ہے جو کسی قدر طویل ہے یہاں صرف اس مختصر بیان پر اکتفا کرنا چاہیے کہ جس وقت سرسید کو مسلمانوں میں انگریزی تعلیم پھیلانے کا خیال پیدا ہوا اسی وقت سے ان کو اس بات کی فکر تھی کہ جس قدر دنیوی ترقی کے لیے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کی طرف مائل کرنا ضرور ہے، اس سے بہت زیادہ اس بات کی ضرورت ہے کہ ان کو تعلیم کے ان مضر نتائج سے جو مذہب کے حق میں اس سے پیدا ہوتے نظر آتے ہیں۔ جہاں تک ممکن ہو بچایا جائے۔

سرسید دیکھتے تھے کہ جو لوگ انگریزی تعلیم پاتے ہیں خواہ ہندو ہوں خواہ مسلمان اور خواہ عیسائی، ان کے دل میں مستثنیٰ صورتوں کے سوا عموماً مذہب کی وقعت باقی نہیں رہتی۔ وہ جانتے تھے کہ اسی تعلیم کی بدولت روز بروز الحاد اور دہریت بڑھتی جاتی ہے اور عیسائی مذہب میں ضعف آتا ہے۔ اس لیے ان کو خوف تھا کہ جو تعلیم وہ مسلمانوں میں پھیلانی چاہتے ہیں

اور جو ضرور ان میں پھیلنے والی ہے۔ مبادا اس سے ویسے ہی مضر نتائج اسلام کے حق میں پیدا ہوں۔ چنانچہ ۱۸۷۶ء میں کہ یہی زمانہ مسلمانوں میں تعلیم کی بنیاد پڑنے اور کالج کے کھلنے کا ہے اور تقریباً یہی زمانہ سرسید کی تفسیر شروع ہونے کا معلوم ہوتا ہے، انھوں نے ایک اسپیچ میں (خاص کر مدرستہ العلوم کے طلبہ سے مخاطب ہو کر) کہا تھا کہ:

"یاد رکھو سب سے سچا کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے
اسی پر یقین کرنے سے ہماری قوم ہماری قوم ہے۔ اگر تم نے سب کچھ
کیا اور اس پر یقین نہ کیا تو تم ہماری قوم نہ رہے۔ پھر اگر تم آسمان کے
تارے ہو گئے تو کیا۔ پس امید ہے کہ تم ان دونوں باتوں (یعنی علم اور اسلام)
کے نمونے ہو گے اور جب ہی ہماری قوم کی عزت ہو گی۔"

باوجود اس اندیشے کے جو ان کو انگریزی تعلیم سے اسلام کے حق میں تھا، ان کو اس بات کا بھی یقین تھا کہ خالص اسلام کو وہ ٹھیٹ اسلام کہتے تھے اور جو ان کے نزدیک حالت موجودہ میں صرف قرآن مجید میں منحصر تھا، اس کو انگریزی تعلیم سے وہ صدمہ ہرگز نہیں پہنچ سکتا جو یورپ اور امریکہ میں عیسائی مذہب کو پہنچا ہے۔ ان کو معلوم تھا کہ مغربی تعلیم سے جو ایک عام یقین ایجوکیٹڈ (تعلیم یافتہ) نوجوانوں کے دل پر نقش ہو جاتا ہے وہ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی امر لا آف نیچر یعنی قانون فطرت کے خلاف وقوع میں نہیں آتا اور اس لیے جو چیزیں مذہب میں ایسی پاتے ہیں جو قانون فطرت کے خلاف معلوم ہوتی ہے اس پر یقین نہیں کرتے۔ سرسید کو بھی اس اصول پر ایسا ہی یقین تھا اور اسی کے ساتھ یہ بھی یقین تھا کہ قرآن میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو در حقیقت قانون قدرت کے خلاف ہو، مگر ان کا قول تھا کہ قرآن چوں کہ کافہ انام کی ہدایت کے لیے نازل ہوا ہے اس لیے اس کا طرز بیان ایسا واقع ہوا ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ اُمی اور جاہل سے لے کر اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کے عالم اور حکیم تک سب اپنی اپنی سمجھ کے موافق اس سے ہدایت پاتے ہیں۔ پس گو اس کی ظواہر آیات سے اکثر موقعوں پر عام ذہنوں میں فوق العادۃ امور کا واقع ہونا سمجھا جاتا ہے، مگر جب آیتوں پر تعمق نظر کے ساتھ غور کیا جاتا ہے تو ان میں کوئی بات عادت

الٰہی یا قانونِ فطرت کے خلاف نہیں معلوم ہوتی۔

اسی اصول پر انھوں نے تفسیر القرآن لکھنی شروع کی جو قریب نصف قرآن کے چھ جلدوں میں چھپ چکی ہے اور بہ قدر ایک جلد کے اس کا قلمی مسودہ موجود ہے۔

جس طرح سید کے اور اکثر کام سب سے نرالے اور اچھوتے تھے اسی طرح اس تفسیر کا بھی سب سے نرالا کام تھا۔ تیرہ سو برس میں کسی مسلمان نے قرآن کی تفسیر اس اصول پر نہیں لکھی کہ قرآن میں کوئی بات قانونِ فطرت کے خلاف نہیں ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ جس کتاب کی نسبت یہ یقین کیا جائے کہ وہ سرتاسر خدا کا کلام ہے، اس کی سچائی اس سے بہتر کوئی معیار نہیں ہو سکتا کہ اس میں کوئی بیان درحقیقت قانونِ فطرت کے خلاف نہ ہو۔ مگر جس طرح یہ کہنا آسان ہے کہ "خدا کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں" لیکن اس کے ہر ایک کام کی مصلحت بیان کرنی سخت مشکل ہے۔ اسی طرح یہ کہنا تو بہت آسان ہے کہ "قرآن میں کوئی بات قانونِ فطرت کے خلاف نہیں"، مگر قرآن کے ہر ایک بیان کو قانونِ فطرت پر تطبیق کرنا نہایت دشوار ہے۔ کیوں کہ جو کتاب خدا کی طرف سے تمام دنیا کی ہدایت کے لیے آئی ہو اس کی شان یہی ہے کہ اس میں کوئی بات عام لوگوں کی سمجھ سے بالاتر نہ ہو، اور اس لیے ضرور ہے کہ اس میں بہت سی باتیں ایسے پیرایوں میں کی جائیں کہ اگر ان کو ظاہری معنوں میں محدود رکھا جائے تو وہ کسی طرح علمی تحقیقات کی میزان میں پوری نہ اتر سکیں۔

بہرحال سرسید نے یہ ایک ایسا مشکل کام اختیار کیا تھا کہ اگر کوئی اور شخص ایسا ارادہ کرتا تو مشکلات کا ہجوم دیکھ کر اس ارادہ سے کبھی کا دست بردار ہو گیا ہوتا۔ مگر انھوں نے باوجود ایسی مشکلات کے، اور باوجود اپنے ہم مذہبوں کی سخت مخالفت کے اس ارادے کو اخیر دم تک ترک نہیں کیا، بلکہ اس کو اپنی زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد اور اسلام کی خیر خواہی کا سب سے بڑا کام سمجھا۔

اگرچہ ان کو اس تفسیر کے اکثر مقامات میں توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی ہے

جس سے ایک عجیب و غریب تھیالوجیکل (مذہبی) قابلیت ان کے دماغ میں ثابت ہوتی ہے، مگر اسی کے ساتھ بہت سے مقامات ان کی تفسیر میں ایسے بھی موجود ہیں جن کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ایسے عالی دماغ شخص کو کیوں کر ایسی تاویلات باردہ پر اطمینان ہو گیا اور کیوں کر ایسی فاحش غلطیاں ان کے قلم سے سرزد ہوئی ہیں؟ لیکن درحقیقت یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ جن لوگوں نے تقلید کی بندشوں کو توڑ کر تحقیق کے میدان میں قدم رکھا ہے اور زید و عمر کا سہارا چھوڑ کر اپنی خداداد عقل سے کام لینا اور قدما کے علم میں کچھ اضافہ کرنا چاہا ہے۔ ان سب کی رایوں میں اس قسم کی شترگربگی پائی جاتی ہے کہ ان کی بعض باتوں پر الہامی ہونے کا گمان ہوتا ہے اور بعض انتہا درجے کی رکیک اور سخیف معلوم ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ ایک کو دوسرے کے ساتھ کچھ نسبت نہیں معلوم ہوتی۔ مگر یہی وہ لوگ ہیں جو علوم دینیہ میں اپنے اپنے فن کے امام مانے گئے ہیں۔ ان کی غلطیوں سے دین کو کچھ نقصان نہیں پہنچا۔ ۔ ۔ کیوں کہ وہ لغو سمجھ کر آخر کار مردود ٹھہر گئیں۔ مگر ان کی فتوحاتِ جدیدہ سے اسلام کو بے انتہا تقویت پہنچی ہے۔ سرسید کو اپنی اس نئی طرز کی تفسیر کے جن جن مقامات میں پوری کامیابی ہوئی ہے۔ (اور ایسے مقامات کی تعداد کچھ کم نہیں ہے۔) ان سے فی الواقع بمقابلہ علوم جدیدہ کے اسلام میں ایک نئے علم کلام کی بنیاد پڑ گئی ہے اور اس بات کی امید بندھ گئی ہے کہ جب اس قدر مشکلات صرف ایک شخص کی کوشش سے حل ہو گئی ہیں، تو باقی مشکلات بھی ضرور کبھی نہ کبھی حل ہو جائیں گی۔ دنیا میں ہمیشہ بڑے بڑے کام اسی طرح پورے ہوئے ہیں کہ ایک شخص کسی کام کی بنیاد ڈالتا ہے اور آئندہ نسلیں اس کام کو پورا کرتی ہیں اور اس کی غلطیوں کی اصلاح کرتی ہیں۔ سرسید خود اپنے ایک لکچر میں جو انھوں نے بمقام لاہور "اسلام" پر دیا تھا، اس بات کا اقرار کیا ہے کہ:۔

"میں معصوم نہیں ہوں، اور نہ معصوم ہونے کا
دعوے کرتا ہوں۔ میں ایک جاہل آدمی ہوں
اسلام کی محبت سے میں نے یہ کام کیا ہے۔ جس

کے میں لائق نہیں ہوں۔ ممکن ہے کہ اس میں
غلطی ہو، مگر آئندہ علماء اس کی صحت کر دیں گے
اور اسلام کو مدد دیں گے۔ میرے خیال میں
مخالفین اور مشککین فی اصول اسلام کے مقابلے
میں اسلام کی تائید اسی طریقے پر ہو سکتی ہے اور کسی
طریقے پر نہیں ہو سکتی۔"

اگرچہ اس نئی طرز کے علم کلام کو جس کی بنیاد بمقابلہ علم جدیدہ کے سرسید نے اپنی تفسیر میں ڈالی ہے، اب تک ہمارے علماء نے اسی نفرت اور کراہیت سے دیکھا ہے جیسے عباسیہ کے عہد میں محدثین و فقہا نے قدیم علم کلام کو اس کے آغاز کے زمانے میں دیکھا تھا۔ مگر جس طرح قدیم علم کلام آخر کار علوم دینیہ کا ایک ضروری حصہ سمجھا جانے لگا تھا۔ اسی طرح امید ہے کہ اگر ہمارے علماء نے تعصب اور تقلید کی بندشوں سے آزاد ہو کر ٹھنڈے دل سے اس تفسیر پر غور کیا اور سرسید کے عمدہ خیالات کو اخذ کیا اور ان کی غلطیوں کی اصلاح کرنی چاہی اور جس عمارت کی انھوں نے بنیاد ڈالی ہے اس کو پورا کرنا چاہا تو تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں کے مذہبی خیالات کی اصلاح کے لیے یہ جدید علم کلام کا نہایت مفید بلکہ علوم دینیہ کا ایک نہایت ضروری حصہ سمجھا جائے گا۔ اور اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ جو کچھ سرسید نے اس مضمون پر تفسیر القرآن یا تہذیب الاخلاق یا چھوٹے چھوٹے متعدد رسالوں میں لکھا ہے، اس کا ایجوکیٹڈ کلاس (تعلیم یافتہ طبقہ) کے مسلمانوں پر عجیب و غریب اثر ہوا ہے۔ میں ایسے متعدد مسلمان نوجوان سے واقف ہوں جنھوں نے انگریزی تعلیم پانے کے زمانے میں مذہب کو بالکل خیرباد کہہ دی تھی اور بعضوں نے عیسائی ہونے کا ارادہ ٹھان لیا تھا اور ایسے تو بے شمار تھے جن کا ایک قدم لامذہبی کی طرف اٹھتا تھا تو دوسرا قدم مذہب کی طرف سے پیچھے ہٹ جاتا تھا۔ مگر جب سے سرسید کی مذکورہ بالا تحریریں شائع ہونی شروع ہوئیں اس وقت سے جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے یہ رخنہ تقریباً بالکل بند ہو گیا ہے بعض مسلمان نوجوانوں

نے اخباروں میں بذریعہ تحریر کے اور بعضوں نے پبلک لکچروں میں اور بعض نے اپنے دوستوں سے زبانی بیان کیا ہے کہ "اگر سیّد صاحب کی تحریریں ہماری نظر سے نہ گزرتیں تو ہم اسلام سے منحرف ہو جاتے" جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا یہی مقصد سرسید کا تفسیر القرآن لکھنے سے تھا۔

ایک بار ایک مولوی صاحب سرسیّد سے ملنے کو آئے اور اُن کی تفسیر دیکھنے کو مانگی سرسید نے اُن سے کہا کہ آپ کو خدا کی وحدانیت اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر تو ضرور یقین ہو گا؟" انھوں کہا "الحمد للہ" پھر کہا کہ "آپ حشر و نشر اور عذاب و ثواب اور بہشت و دوزخ پر بھی یقین رکھتے ہوں گے؟ انھوں نے کہا "الحمد للہ" بس تو آپ کو میری تفسیر دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی ضرورت ان لوگوں کو ہے جو مذکورہ عقائد پر پختہ یقین نہیں رکھتے یا ان میں متردد و مذبذب ہیں"

سرسید کا خیال تھا کہ اس تفسیر سے کچھ عجب نہیں بلکہ نہایت قرین قیاس ہے کہ مسلمانوں میں ایجوکیٹڈ (تعلیم یافتہ) لوگوں کا ایک نیا فرقہ پیدا ہو جائے جو مذہبی خیالات میں مسلمانوں کے موجودہ فرقوں سے کسی قدر مختلف ہو، لیکن وہ کہا کرتے تھے کہ "ایسا نیا اسلامی فرقہ بہ نسبت اس کے کہ وہ اسلام کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرلیں، یا کسی مذہب کے پابند نہ رہیں۔ ہزار درجہ بہتر ہے"۔

یہاں ایک لطیفہ ذکر نے کے قابل ہے۔ علی گڑھ کے ایک مشنری (پادری) صاحب نے سرسید کے ایک دوست سے کہا کہ "سرسیّد صاحب یہ تو خوب جانتے ہوں گے کہ محمڈن کالج کے طالب علم عام مسلمانوں کے طریقے پر قائم نہیں رہ سکتے، پھر وہ تفسیر لکھ کر ان کو ہمارے ہاتھ سے بھی کیوں کھوتے ہیں؟"

۲۲۔ قرآن مجید میں اب نئی تفسیر کی گنجائش باقی ہے یا نہیں؟

(از رسالہ "معارف" علی گڑھ بابت دسمبر ۱۸۹۹ء)

سرسیّد کی تفسیر جس میں بیسیوں آیات کے معانی جمہور مفسرین کے خلاف لکھے گئے ہیں، اس کی نسبت پہلا شبہ جو ہر شخص کے دل میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ

"باوجود بے شمار تفسیروں کے، جو گزشتہ تیرہ سو برس میں وقتاً بعد وقتاً قرآن مجید کی لکھی گئی ہیں۔ اب تفسیر قرآن کے متعلق ایسا کون سا مرحلہ باقی رہ گیا ہے جس کو علمائے سلف نے طے نہ کر لیا ہو؟ اولاً رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے جن کی برابر قرآن کا علم کسی اُمتی کو نہیں ہو سکتا، جن آیتوں کے معانی بیان کرنے کی ضرورت تھی، خود زبان مبارک سے ان کا مطلب ارشاد فرمایا۔ پھر آپؐ کے بعد صحابہ[۱] تابعین[۲] تبع تابعین[۳] اور علمائے اُمت نے جو یقیناً اُس

۱۔ صحابہ یعنی وہ مقدس گروہ جس نے آنحضرت صلعم کا فیض صحبت حاصل کیا۔

۲۔ تابعین، وہ لوگ جنھوں نے صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی صحبتیں اُٹھائیں اور ان سے اکتساب علم کیا

۳۔ تبع تابعین، وہ جماعت جس نے تابعین کا زمانہ پایا اور اُن سے فیض حاصل کیا۔

زمانے کے لوگوں سے بہتر قرآن کے معنی سمجھنے والے تھے،
قرآن کی ایک ایک آیت اور ایک لفظ کو بالکل حل کر دیا۔
پس، زمانۂ حال میں مفسر کے لیے اس کے سوا کوئی منصب باقی
نہیں رہا کہ وہ انھیں تفسیروں کا ماحصل جو علمائے سلف لکھ گئے
ہیں، زیادہ شرح و بسط یا زیادہ فصاحت و بلاغت کے ساتھ
بیان کر دے، یا ایک زبان سے دوسری زبان میں ان کا
ترجمہ کر دے۔ یہ منصب اب کسی کا نہیں ہے کہ ایک بھی آیت
کے معنی ایسے بیان کرے جو تیرہ سو برس میں کسی نے بیان
نہ کئے ہوں۔"

چناں چہ اسی شبہ کی بنا پر بعض ستم ظریفوں کو کہتے سنا ہے کہ:
"جو مطلب قرآن کا سر سید نے بیان کیا ہے وہ نہ خدا کو سوجھا
نہ نبیؐ کو، نہ صحابہؓ و تابعینؒ کو اور نہ دیگر علمائے اُمت کو۔"

اس مضمون میں ہم کو اسی شبہ کا حل کرنا مقصود ہے، مگر پہلے اس سے کہ اصل مقصود بیان کیا جائے چند باتیں ذہن نشین کر لینی ضرور ہیں۔

ایک یہ کہ محکمات و متشابہات کے الفاظ جو قرآن مجید میں وارد ہوئے ہیں ان سے کیا مراد ہے۔ شاہ ولی اللہ کے نزدیک جیسا کہ "حجۃ اللہ البالغہ" میں مذکور ہے:

محکمات۔ وہ آیتیں ہیں جن میں ایک معنی سے زیادہ کا احتمال نہ ہو۔

متشابہات۔ وہ ہیں جن میں متعدد معنوں کا احتمال ہو مگر مقصود ایک معنی سے زیادہ نہ ہوں۔

اس سے ظاہر ہے کہ قرآن مجید میں جس قدر آیتیں ایسی ہیں جن میں معانی متعددہ کا احتمال ہو سکتا ہے وہ سب متشابہات کے تحت مندرج ہیں۔

دوسرے یہ کہ قرآن مجید میں متشابہات کے لانے سے شارع کا کیا مقصد تھا؛ امام رازیؒ نے اس کی کئی وجہیں بیان کی ہیں، مگر سب سے عمدہ وجہ جس کو انھوں

نے تمام وجوہ پر ترجیح دی ہے وہ یہ ہے کہ:۔

> ''قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس میں خواص وعوام سب کو حق کی طرف بلایا گیا ہے اور عوام کی طبیعتیں ادراک حقائق سے بعید ہوتی ہیں۔ مثلاً اگر ان کے سامنے ایک ایسی ہستی کا بیان کیا جائے جو نہ جسم ہے نہ کسی مکان میں ہے اور نہ اس کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے، تو ان کو یہی خیال ہوگا کہ ایسی چیز معدوم محض کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے؟ پس مقتضائے حکمت یہی تھا کہ ایسے الفاظ کے ساتھ خطاب کیا جائے جو من وجہ ان کے خیالات سے مناسبت رکھتے ہوں''

شاہ صاحب نے اسی مطلب کو ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں اس طرح بیان کیا ہے کہ:۔

> ''شارع نے محض لوگوں کی معمولی سمجھ کے موافق جو دقائق علم وحکمت تک پہنچنے سے پہلے اُن کی اصل خلقت میں ودیعت تھی ان سے خطاب کیا ہے اور اسی لیے (ان کی سمجھ کے موافق) فرمایا اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی''

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ:

> ''آنحضرتؐ نے ایک حبشیہ عورت سے پوچھا کہ ''خدا کہاں ہے؟'' اُس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ آپؐ نے فرمایا ''یہ مومنہ ہے''

یعنی آنحضرتؐ نے باوجودیکہ آپؐ خدا تعالیٰ کو کسی خاص جہت میں ہونے سے منزہ جانتے تھے، اُس کے آسمان کی طرف اشارہ کرنے کو اُس کے ایمان کے لیے کافی سمجھا اور اس دقیق بات کے سمجھانے کو مناسب نہ جانا کہ وہ ذات اقدس جہت اور مکان سے پاک ہے۔

ان سب حوالوں سے ظاہر ہے کہ قرآن میں وہ تمام روحانی اور اعلیٰ مقاصد جو عموماً انسان کی فہم وادراک سے اور خاص کر عرب کے اُمیوں کی سمجھ سے بالاتر تھے

اور جن پر بالاجمال ایمان لانا کافی تھا، ان کو مجاز و استعارہ اور تمثیل کے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے تاکہ اُمّی اور حکیم دونوں اپنی اپنی سمجھ کے موافق اس سے ہدایت حاصل کریں۔

عہدِ عتیق کی کتابیں جن کو مسلمان، یہودی اور عیسائی سب آسمانی کتابیں مانتے ہیں، چونکہ وہ اس زمانے میں القا کی گئی تھیں جب کہ انسان کی سمجھ نہایت ابتدائی حالت میں تھی، اس لیے ان میں قرآن سے کہیں زیادہ کلام کی بنیاد مجاز اور استعارہ پر رکھی گئی ہے۔ تمام عہد عتیق کی کتابیں اور صحیفے متشابہات سے بھرے ہوئے ہیں۔ جیسے:

"خدا کا طوفانِ نوحؑ پر اس قدر رونا کہ اُس کی آنکھیں آشوب کر آئیں۔ ایک دوسرے موقع پر اُس کا ایسا ہنسنا کہ کھلیاں نظر آنے لگیں۔ سرکشوں کا اُس کو کھجا کر غصہ دلانا اور اس کی ناک میں دھوئیں کا سا اثر کرنا۔ اس کے سانس کا گندھک کے سیلاب کی مانند ہونا۔"

شہر آشور کا اس کی آواز سے تباہ ہونا اور اس کا آشور والوں کو لٹھوں سے مارنا وغیرہ وغیرہ۔

ایک جگہ کتاب یرمیاہ میں یروشلم کی تباہی پر خدا تعالیٰ اپنا غصہ اس طرح ظاہر کرتا ہے:۔

"اے میری انتڑیوں! اے میری انتڑیوں! میرے دل کے پردے میں درد ہے۔ میرے دل کی ایسی گھبراہٹ ہے کہ میں چپ نہیں رہ سکتا۔ اے میری جان تو نے نرسنگی کی آواز اور لڑائی کی للکار سُنی شکست پر شکست کی خبر ہوئی۔ یقیناً تمام سرزمین برباد ہو گئی۔ میرے خیمے اچانک، اور میرے پردے ایک دم ہی غارت کیے گئے۔ کب تک میں

بہ جھنڈا دکھایا کروں اور ترتری کی آواز سنا کروں۔

زبور میں ایک جگہ خدا تعالیٰ داؤدؑ کے مقرب اور محبوب ہونے کو اس طرح بیان کرتا ہے :

"میں نے تجھے چُنا ہے۔ میں آج کے دن تیرا باپ ہوا"

دوسری جگہ زبور ہی میں خدا کے انتقام لینے کا بیان اس طرح ہے :

"آخر خداوند خواب سے بیدار ہوا اور اس پہلوان کی طرح جو شراب پی کر عربدہ کرے اپنے دشمنوں کے پچھاڑ ماری"

غرضکہ تمام عہدِ عتیق کی کتابیں اسی قسم کے متشابہات سے مالا مال ہیں جن میں روحانی تعلیم جسمانیات کے پیرایہ میں کی گئی ہے۔ اسی لیے شاہ ولی اللہ صاحب انبیاء خواص کے ذکر میں لکھتے ہیں :

"وَمِنْ سِيَرِهِمْ اَنْ لَا يُكَلِّمُوا النَّاسَ اِلَّا عَلٰى قَدْرِ عُقُوْلِهِمُ الَّتِیْ خُلِقُوْا عَلَيْهَا وَ عُلُوْمِهِمُ الَّتِیْ هِیَ حَاصِلَۃٌ عِنْدَ هُمْ بِاَصْلِ الْخِلْقَۃِ"

تیسرے یہ بات بھی سمجھ لینی ضرور ہے کہ متشابہات کی تاویل جس کی نسبت قرآن مجید میں کہا گیا ہے "وَمَا يَعْلَمُ تَاوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ" اس سے کیا مراد ہے؟ ظاہر ہے کہ اس آیت کے یہ معنی قرار دینے تو بالکل غلط ہیں کہ متشابہات کی تاویل کا علم اجمالاً یا تفصیلاً کسی طرح پر انسان کو نہیں دیا گیا۔ ورنہ مسلمانوں کا یہ دعویٰ غلط ہو جائے گا کہ ہمارے دین میں عیسائیوں کے مسئلہ تثلیث کی مانند کوئی ایسا راز سربستہ نہیں ہے۔ جو انسان کی عقل اور سمجھ سے بالاتر ہو۔

امام نووی شرح صحیح مسلم میں تاویل اور متشابہات کے متعلق لکھتے ہیں :-

يَبْعُدُ اَنْ يُخَاطِبَ اللّٰهُ عِبَادَهٗ بِمَا لَا سَبِيْلَ لِاَحَدٍ مِّنَ الْخَلْقِ اِلٰى مَعْرِفَتِهٖ وَقَدِ اتَّفَقَ اَصْحَابُنَا وَغَيْرُهُمْ مِنَ الْمُحَقِّقِيْنَ عَلٰى اِنَّهٗ يَسْتَحِيْلُ اَنْ يَّتَكَلَّمَ اللّٰهُ تَعَالٰى بِمَا لَا يُفِيْدُ۔ یعنی بعید از

عقل ہے کہ اللہ جل شانہٗ اپنے بندوں سے ایسے کلام کے
ساتھ خطاب کرے جس کے سمجھنے کی کوئی سبیل کسی مخلوق کے
لیے نہ ہو، اور ہمارے علمائے مذہب اور اُن کے سوا اور
محققین اس بات پر متفق ہیں کہ خدا تعالیٰ کا ایسے کلام کے
ساتھ متکلم ہونا جو مفید معنی نہ ہو، محال ہے۔"

غرضکہ آیۃ مذکورہ کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ انسان کو تاویل متشابہات کا علم مطلقاً نہیں دیا گیا، بلکہ یہ معنی ہیں کہ خاص کر مبداء و معاد کے متعلق جو باتیں انسان کی سمجھ بوجھ سے باہر ہیں اور جن کا بیان آیات متشابہات میں بطور مجاز و استعارہ کے واقع ہوا ہے اور جن پر ایمان لانے کو یُؤمِنُونَ بِالْغَیْبِ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے ان کی حقیقت اور کنہ خدا کے سوا کوئی نہیں جان سکتا اور اس لیے انسان جن الفاظ و عبادات سے ان حقائق کو تعبیر کرے گا وہ تعبیر ناقص اور ادائے معنی مقصود سے قاصر ہو گی۔

طیبی شرح مشکوٰۃ میں لکھتا ہے کہ:۔

"المتشابه الذی یجد رمنه هو صفات اللّٰہ تعالیٰ
التی لا کیفیة لها و لا وصاف القیمة التی لا سبیل
الی ادراکها بالقیاس و استنباط و لا سبیل الی استحضار
ها فی النفوس۔ یعنی جن متشابہات کے اتباع سے بچنے کا
حکم ہے وہ صفات باری تعالیٰ یا قیامت کے حالات کا بیان
ہے جو قیاس اور استنباط سے دریافت نہیں اور نہ لوگوں کو
اس کا تصور دلانے کی کوئی سبیل ہے۔"

لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ انسان یہ بھی نہیں سمجھ سکتا کہ آیات متشابہات میں وہ اسرار و حقائق بطور استعارہ یا تمثیل کے بیان ہوئے ہیں اور الفاظ اپنے حقیقی معنوں میں استعمال نہیں ہوئے۔ مثلاً سورۂ کُوِّرَتْ میں ہول قیامت کا بیان اِن

لفظوں میں کیا گیا ہے وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ یعنی جب کہ عنقریب بیانے والی اونٹنیاں چھٹی پھریں گی اور اُن کی کوئی خبر نہ لے گا:

بے شک ہول قیامت کی جس کیفیت کو اس تمثیل میں بیان کیا گیا ہے اُس کے ادراک سے انسان کی عقل قاصر ہے اور اس کی قدرت سے باہر ہے کہ اس کیفیت کو کسی لفظ یا عبارت کے ذریعے سے پورا پورا ادا کر سکے لیکن یہ سمجھنا اس کی طاقت سے باہر نہیں ہے کہ یہ بیان اس کیفیت کی تمثیل ہے اور ایک اونٹ چرانے والی قوم جس کی دولت اونٹ اور اونٹنیوں کے سوا کچھ نہ تھی اس کو ہول قیامت کا تصور دلانے کے لیے کوئی اسلوب اس سے زیادہ بلیغ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ عرب اپنی الف و عادت کے سبب اس بات کو ناممکن سمجھتے تھے کہ جب اونٹنی بیانے کے قریب ہو اُس وقت مالک اُس کی نگرانی سے غافل ہو جائے۔ پس انھوں نے اُس وقت کو کیسا ہولناک تصور کیا ہوگا جبکہ ایسی اونٹنیوں کی خبر گیری کا ہوش باقی نہ رہے گا۔

لیکن یہاں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر تاویل متشابہات کا علم خدا تعالیٰ کے ساتھ مخصوص نہ تھا تو سلفِ صالح تاویل کرنے کو کیوں ناجائز سمجھتے تھے اور جو تاویل کا مرتکب ہوتا تھا اس سے کس لیے مواخذہ کیا جاتا تھا۔ چناں چہ حضرت عمرؓ نے صبیغ بن عسل کو اتباع متشابہ پر سزا دلوائی اور مدینہ منورہ سے جلا وطن کر کے بصرہ بھجوا دیا اور جب امام مالک سے استواء علی العرش کا مطلب پوچھا گیا تو انھوں نے اس کے سوا کوئی جواب نہیں دیا کہ "استواء کے معنی معلوم ہیں اور اس کی کیفیت مجہول ہے اور اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس سے سوال کرنا بدعت ہے"۔

سو اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ جس زمانے میں قرآن نازل ہوا اس وقت اہلِ کتاب تحریف کتب مقدسہ کے سبب سے نہایت بدنام تھے۔ وہ اکثر اپنے اغراض فاسدہ کے لیے کتب مقدسہ کے معنی لوگوں کو غلط بتاتے تھے اور اس طرح دین

میں رخنہ ڈالتے تھے۔ چناں چہ قرآن مجید میں جابجا ان پر تحریف کا الزام لگایا گیا ہے اور بہت سی حدیثیں اس مضمون کی صحاح وغیرہ میں موجود ہیں، بلکہ خود اہلِ کتاب نے تسلیم کیا ہے کہ بلا شبہ قدیم یہودی اور عیسائی علمائے بائبل کی کتابوں میں تحریفِ معنوی کے مرتکب ہوتے تھے۔ ظاہر ہے کہ تحریف سے زیادہ کوئی چیز دین کے حق میں خطرناک نہیں ہوسکتی اور اہلِ کتاب اُس کی مثال قائم کرچکے تھے اور چوں کہ مسلمانوں کو بنی اسرائیل سے روایت کرنے کی اجازت تھی اور دونوں اصول دین میں عموماً باہمدگر مشابہت رکھتے تھے اس لیے مسلمانوں کا سب سے زیادہ میل جول اہلِ کتاب کے ساتھ تھا۔ لہٰذا اُن میں تحریف کا فتنہ پھیلنے کا قوی احتمال تھا۔ چناں چہ من جملہ بہت سی بندشوں کے جو شارع نے اسلام میں انسدادِ تحریف کے لیے باندھیں ایک یہ تھی کہ آیاتِ متشابہات کے معنی میں چھان بین کرنے کی مذمت کی گئی، اور قرآن میں صاف کہہ دیا گیا کہ:

فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ
مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ۔

اور آں حضرت نے عموماً قرآن کی تفسیر کے متعلق فرمایا کہ:

مَنْ فَسَّرَ الْقُرْاٰنَ بِرَاْیِهٖ فَلْیَتَبَوَّاْ مَقْعَدَهٗ۔

اور جھوٹی روایت کرنے کی نسبت فرمایا

مَنْ کَذَبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّدًا فَلْیَتَبَوَّاْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ۔

اسی بنا پر سلفِ صالح متشابہات کی تاویل سے کوسوں دُور بھاگتے تھے، باوجودیکہ وہ تشبیہ کے عقیدے سے بالکل مبرّا تھے اور جس بات میں تشبیہ کا ادنیٰ شائبہ پاتے تھے، اُس سے حذر کرتے تھے۔ پھر بھی جو آیتیں تشبیہ پر دلالت کرتی تھیں، اُن کی تاویل سے ہمیشہ سکوت کرتے تھے، اور ان کے ظاہری معنوں سے ہرگز تجاوز نہ کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم آیاتِ متشابہات کے ظاہری

معنوں پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کے اصلی معنوں کی جو خدا نے مراد رکھے ہیں تصدیق کرتے ہیں اور ان کا علم خدا پر چھوڑتے ہیں کیوں کہ ان کے سمجھنے کی ہم کو تکلیف نہیں دی گئی۔ بعضے یہاں تک احتیاط کرتے تھے کہ مثلاً ید یا وجہ یا استوا کا ترجمہ تک دوسری زبان میں نہیں کرتے تھے اور اگر کسی ایسی آیت کے ترجمے کی ضرورت ہوتی تھی تو انھیں الفاظ کو بعینہ ترجمے میں رکھ دیتے تھے۔ حالاں کہ عربی زبان جس میں شاعری نزول قرآن کے وقت حد کمال کو پہنچ چکی تھی۔ استعارہ و کنایہ اور اقسام مجاز سے مالامال تھی اور اسی زبان میں قرآن نازل ہوا تھا۔ باوجود اس کے علمائے سلف محض اس نیت سے کہ دین میں فتنہ پیدا نہ ہو اور اہل اسلام میں مثل اہل کتاب کے تحریف کا باب مفتوح نہ ہونے پائے "تاویل متشابہات اور تفسیر بالرائے سے اجتناب کرتے تھے اور جہاں تک ممکن ہوتا تھا متشابہات قرآن کے الفاظ کو ان کے حقیقی معنوں پر مقصود رکھتے تھے اور بغیر سخت ضرورت کے ان کو مجازی معنوں پر محمول نہ کرتے تھے اور کسی آیت کی تفسیر کرنے پر جب تک کوئی روایت اس کی موید نہ ہو عموماً مبادرت نہ کرتے تھے۔ حالاں کہ تفسیر بالرائے سے ممانعت ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کسی آیت کے معنی جب تک اس کی تفسیر کسی حدیث سے ثابت نہ ہو بیان کرنے جائز نہیں ہیں۔ چناں چہ امام غزالی اور صاحب مجمع البحار اور دیگر محققین نے تصریح کی ہے کہ اگر حدیث مذکور کے یہ معنی ہوں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ابن عباس کے حق میں یہ دعا کرنا کہ اللّٰھمّ فقّھہ فی الدّین وعلّمہ التّاویل نعوذ باللہ بے کار ٹھہرتا ہے۔ باوجود اس کے سلف صالح جہاں تک ہو سکتا تھا بغیر روایت کے تفسیر قرآن میں دم نہ مارتے تھے تاکہ جس مصلحت سے شارع نے تفسیر بالرائے کی ممانعت فرمائی ہے، وہ مصلحت فوت نہ ہو اور تحریف کا رستہ مسدود رہے۔

لیکن یہ مصلحت اسی وقت تک محدود رہ سکتی تھی جب تک کوئی اور اس سے بھی زیادہ ضروری آیت اور مہتم بالشان مصلحت پیش نہ آئے۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا کہ جو آیتیں بظاہر تشبیہ پر دلالت کرتی تھیں، جب ان کے اصلی معنی بیان کرنے سے علمائے

نے سکوت کیا اور ان کو محض حقیقی معنوں پر مقصود رکھا تو ایک طرف تو خود مسلمانوں میں حشویہ اور غلاۃ شیعہ عقیدۂ تشبیہ میں غلو کرنے لگے، اور دوسری طرف جوں جوں یونانی فلسفہ کا رواج زیادہ ہوتا گیا اسی قدر آیات متشابہات کے معنوں پر زیادہ چون و چرا ہونے لگی اور مخالفین طرح طرح کے شبہات قرآن پر وارد کرنے لگے۔ اب علمائے اسلام کو اس کے سوا کچھ چارہ نہ تھا کہ سلف صالح نے جو محض از راہِ مصلحت زبانوں پر مہر لگا رکھی تھی اس کو توڑ دیا جائے اور جو الفاظ قرآن مجید میں در حقیقت مجاز و استعارہ کے طور پر اطلاق کیے گئے ہیں بقدرِ ضرورت ان کے اصلی معنی صاف صاف بیان کیے جائیں۔

چناں چہ سب سے پہلے علمائے معتزلہ نے تاویل متشابہات کی راہ کھولی۔ آخر کو اسلام میں عموماً یہ قاعدہ مسلم ٹھیر گیا کہ جب نقل اور عقل میں تعارض واقع ہو تو نقل کے لیے ایسے معنی لینے چاہئیں جن سے وہ تعارض رفع ہو جائے یعنی جب نصِ شرعی کے حقیقی معنی دلیل قاطع عقلی کے خلاف ہوں تو اس کو اصول عربیت کے موافق مجازی معنوں پر محمول کرنا چاہیے۔ اور یہی معنی تاویل کے ہیں۔

یہ اصول علم کلام کی عام کتابوں مثل مقاصد، مواقف، تفسیر کبیر، درء تعارض العقل والنقل اور فصل المقال قاضی ابن رشد وغیرہ وغیرہ میں مفصل بیان کیا گیا ہے اور شیخ حسین آفندی طرابلسی نے جو ابھی ایک کتاب موسوم بہ حمیدیہ حکمائے زمانۂ حال کے مقابلے میں لکھی ہے اس میں بھی اس اصول کو قاعدۂ مسلمۂ اہلِ اسلام قرار دیا ہے بلکہ شیخ موصوف نے اپنے ملک کے تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں کو جو معجزاتِ حسیہ کو علوم جدیدہ کے خلاف سمجھتے ہیں یہ ہدایت کی ہے کہ علیہم ان یقفوا بما تقبله عقولهم. ثم مالم تقبله ویرفضه البرهان العقلی القاطع یرجعون فیه الی التاویل الجامع بین النقل والعقل (حمیدیہ صفحہ ۳۸)

یعنی ان کو چاہیے کہ جس بات کو ان کی عقل قبول کر لے اس پر قناعت کریں اور جس بات کو وہ قبول نہ کرے، اور برہان عقلی اس کے منافی ہو

ہو تو تاویل کی طرف رجوع کریں جس سے عقل اور نقل میں تطبیق ہو جائے۔

اگرچہ ابوالحسن اشعری جو فرقۂ اشاعرہ کے سرگروہ ہیں، متشابہات کی تاویل کو جائز نہیں سمجھتے مگر ان کی یہ ممانعت صرف ان راسخ الاعتقاد مسلمانوں کے لیے مخصوص معلوم ہوتی ہے جن کے دل ہر قسم کے وساوس اور شبہات سے پاک ہیں۔ کیوں کہ ضرورت کے وقت کیا معتزلی اور کیا اشعری اور کیا اسلامی فرقے سب کو ناگزیر متشابہات کتاب و سنت کی تاویل کرنی پڑتی ہے۔

امام غزالی جو خود بھی اشعری المذہب ہیں رسالہ التفرقۃ بین الاسلام والزندقۃ میں لکھتے ہیں کہ:-

اسلام کا کوئی فرقہ ایسا نہیں ہے جو تاویل کا محتاج نہ ہوا ہو۔ سب سے زیادہ تاویل سے بچنے والے امام احمد بن حنبل ہیں، باوجود اس کے وہ سب سے زیادہ بعید تاویلات کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔"

اس مقام پر ہم ایک آیت بطور مثال کے اس غرض سے لکھتے ہیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ آیا متشابہات کے معنی ابتدا میں کیا سمجھے جاتے تھے اور پھر رفتہ رفتہ علم و حکمت کی ترقی اور زمانے کی ضرورتوں سے ان کے کیا معنی قرار دیے گئے۔

آیۃ الکرسی میں جو جملہ " وَسِعَ کُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ " آیا ہے اس کی تفسیر میں امام رازیؒ نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے پایا جاتا ہے کہ کرسی کو پہلے ایک جسم عظیم (جو آسمان و زمین پر محیط ہے) سمجھا جاتا تھا۔ بعضے اسی کو عرش اور بعضے عرش و کرسی دونوں کو جدا جدا جسم سمجھتے تھے۔ بعضے کرسی کو خدا کے قدم رکھنے کی جگہ کہتے تھے۔ یہاں تک مسلمانوں میں علوم حکمیہ نے رواج پایا اور علماء کو زمانے کی ضرورتوں نے مجبور کیا کہ مہر سکوت کو توڑا جائے اور عرش و کرسی وغیرہ الفاظ سے جو معنی اصل مقصود ہیں وہ صاف صاف بیان کیے جائیں۔ چناں چہ امام رازی نے علمائے

شافعیہ میں قفال کا یہ قول آیتہ مذکور کی تفسیر کے متعلق نقل کیا ہے کہ:

"خدا تعالیٰ نے اپنی ذات و صفات کے بیان میں لوگوں سے ایسے الفاظ کے ساتھ خطاب کیا ہے جن کو وہ امراء سلاطین کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً اس نے کعبہ کو اپنا گھر بتایا ہے جس کے گرد وہ بادشاہوں کے محلوں کی طرح طواف کرتے ہیں اور اس کی زیارت کا حکم دیا جس طرح وہ بادشاہوں کے دربار میں حاضر ہوتے ہیں اور حجر اسود کو اپنا دایاں ہاتھ قرار دیا اور اس پر بوسہ دینے کا حکم کیا جس طرح وہ سلاطین کے ہاتھوں پر بوسہ دیتے ہیں۔"

اسی طرح قیامت کے حساب کتاب کے موقع پر ملائکہ اور انبیا اور شہدا کا حاضر ہو جانا بیان فرمایا اور اسی طرح اپنے لیے عرش یعنی تخت قرار دیا اور فرمایا کہ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى پھر اپنے تخت کی نسبت یہ کہا کہ وَكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَاءِ۔ اور پھر فرمایا وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ اور فرمایا وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ اور کہا اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ اور اپنے لیے کرسی قرار دی اور فرمایا وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ۔"

اس کے بعد امام رازی کہتے ہیں:

اذا عرفت هذا فنقول كل ما جاء من الالفاظ الموهمة التشبيهية فى العرش والكرسى فقد ورد مثلها بل اقوى منها فى الكعبة والطواف وتقبيل الحجر ولما توافقنا ههنا على ان المقصود تعريف عظمة الله وكبريائه مع القطع بانه منزه عن ان يكون فى الكعبة فكذا الكلام فى العرش والكرسى۔

یعنی جب تم قفال کا قول سن چکے تو اب میں کہتا ہوں کہ جتنے الفاظ

موہم تشبیہ عرش و کرسی کے متعلق واقع ہوئے ہیں ویسے ہی بلکہ اُن سے زیادہ موہم تشبیہ کعبہ اور طواف اور بوسۂ حجرِ اسود کے متعلق آئے ہیں۔ پس جب ہم نے یہاں اتفاق کر لیا کہ الفاظ سے محض خدا کی عظمت و کبریائی کا تصور دلانا ہے اور خدا کی نسبت یقین ہے کہ وہ کعبہ میں ہونے سے پاک ہے تو ہم کو ایسا ہی عرش و کرسی کی نسبت سمجھنا چاہیئے۔"

لیکن چوں کہ اس زمانے کی علمی تحقیقات نہایت محدود تھی اس لیے بہت سے شبہات جو اس زمانے میں قرآن کی نسبت پیدا ہو سکتے ہیں، اس زمانے میں ان کا خطرہ بھی کسی کے دل میں نہیں گزرتا تھا اور اس وجہ سے بہت سی آیات متشابہات جو درحقیقت تاویل طلب تھیں، ان کی تاویل کرنے کی ضرورت علمائے سلف کو محسوس نہیں ہوئی مثلاً جب تک یونانی فلسفہ اسلام میں نہیں پھیلا تھا، الفاظِ قرآنی میں شک اور وسوسہ نے راہ نہیں پائی تھی لوگ ان آیتوں کے (الفاظ کو جن سے زمین کا مثل فرش کے بچھا ہوا ہونا مفہوم ہوتا ہے) ان کے حقیقی معنوں پر محمول کرتے تھے اور اب تک بھی اُن ملکوں کے بعض علماء[1]، جہاں کسی زمانے میں یونانی فلسفے کا رواج نہیں ہوا، زمین کو مثل فرش کے بچھا ہوا سمجھتے ہیں۔ مگر جب علم و حکمت کا مسلمانوں میں رواج ہوا، اور دلائل قاطعہ سے زمین کی کرویت ثابت ہو گئی تو علمائے متکلمین کو تصریح کرنی پڑی کہ قرآن میں زمین کی نسبت الفاظ فراشًا اور دحاھا اور طحٰھا اطلاق کیے گئے ہیں، وہ اپنے حقیقی معنوں پر محمول نہیں ہیں لیکن چوں کہ اس وقت تک زمین کی حرکت کا مسئلہ سائنس

---

[1] شیخ حسین آفندی نے رسالہ حمیدیہ میں اپنے زمانے کے ایک قشری عالم کا یہ قول نقل کیا ہے کہ دینِ اسلام میں امریکہ کے وجود پر اعتقاد رکھنا جائز نہیں، کیوں کہ اس سے زمین کی کرویت کا اعتقاد کرنا لازم آتا ہے جو اسلامی عقیدے کے خلاف ہے۔ شیخ اس کی نسبت لکھتے ہیں کہ "اس نادان نے اپنی جہالت سے مسلمانوں کو اس بات پر مجبور کیا ہے کہ ایک محسوس چیز کا انکار کر دیں اور اپنے دین کو لوگوں کی نظر میں مضحکہ بنائیں۔ ۱۲۰۔ (حالی)

کے درجے تک نہیں پہنچا تھا اس لیے قرآن کے بعض الفاظ جو بظاہر زمین کے ساکن ہونے پر دلالت کرتے ہیں ان کی کچھ تاویل نہیں کی گئی۔ یا مثلاً جن آیتوں سے مینہ کا آسمان سے برسنا سمجھا جاتا ہے۔ جب تک قرآن کے الفاظ میں کسی نے چون و چرا نہیں کی۔ لوگ ان آیتوں کو اُن کے حقیقی معنوں پر محمول کرتے تھے، مگر جب دلائل سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ مینہ درحقیقت آسمان سے نہیں برسنا تو لفظ سماء جو قرآن میں جا بجا وارد ہوا ہے اس سے مجازی معنی یعنی جانب فوق مراد لی گئی ہے۔ چونکہ اس وقت تک یہ تحقیق نہیں ہوا تھا کہ آسمان درحقیقت کوئی مجسم محیط عالم مثل گول گنبد کے جیسا کہ بظاہر نظر آتا ہے نہیں ہے بلکہ تمام ثوابت اور سیارے فضائے بسیط میں بکھرے ہوئے اور ایک عجیب کرشمۂ قدرت ہے جس کا نام جاذبیہ یعنی کشش ہے اپنی اپنی جگہ قائم ہیں۔ اس لیے جو الفاظ آسمان کے موجود یا مجسم ہونے پر بظاہر دلالت کرتے تھے، ان کی کچھ تاویل نہیں کی گئی۔

اسی سبب سے قرآن مجید کی بہت سی آیتیں اور الفاظ ایسے باقی رہ گئے ہیں جن میں درحقیقت تاویل کی ضرورت تھی، مگر چوں کہ وہ ضرورت کسی کو محسوس نہیں ہوئی، اس لیے ان کی تاویل کرنے کا کسی کو خیال نہیں آیا اور سب سے بڑا مانع تاویل متشابہات پر جرأت کرنے کا یہ تھا کہ امام ابوالحسن اشعری جو تاویل متشابہات کے باب میں سلف صالح کے پورے مقلد تھے اور اس لیے اس کو بغیر اشد ضرورت کے جائز نہیں سمجھتے تھے، ان کے مذہب نے چوتھی صدی ہجری کے آخر میں ترقی کرنی شروع کی اور چھٹی صدی میں وہ تقریباً تمام ممالک اسلامیہ میں پھیل گیا اور معتزلہ جنھوں نے ملاحدہ اور دیگر مخالفین اسلام کے مقابلے میں سب سے پہلے تاویل متشابہات کی ضرورت کو محسوس کیا تھا اور ان کو عندالضرورت واجب سمجھتے تھے، جوں جوں اشاعرہ کے مذہب کو ترقی ہوتی گئی اسی قدر وہ، ان کا مذہب اور ان کے اصول اور ان کی تصانیف ناپید ہوتی گئیں۔ اکثر بادشاہوں نے جبراً اشعری مذہب کو رواج دیا اور معتزلہ کے اصول کا استیصال کیا، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ دُنیا سے معدوم ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ آج اسلامی دنیا میں زیادہ تر اشاعرہ کی تفسیریں پائی جاتی ہیں۔ جن میں بغیر سخت ضرورت کے متشابہات کی تاویل میں کسی نے

دم نہیں مارا اور جس قدر تاویلات ان تفسیروں میں منقول ہیں، ان کا ماخذ زیادہ تر وہی معتزلہ کی تفاسیر ہیں جو ایک آدھ کے سوا اب بالکل مفقود ہیں، صرف ان کے اقوال جستہ جستہ اشاعرہ کی تفسیروں میں پائے جاتے ہیں۔ چناں چہ قفال[۱] جن کا قول کرسی کی تفسیر میں امام[۲] رازیؒ نے نقل کیا ہے، وہ بھی معتزلہ میں شمار کئے گئے ہیں۔

اگرچہ امام ابوالحسن[۳] اشعری سے جیسا کہ علامہ شہرستانی[۴] نے ملل ونحل میں لکھا ہے ایک قول یہ بھی منقول ہے کہ عند الضرورت تاویل کرنی جائز ہے اور اسی بناپر اشاعرہ بھی مثل دیگر فرقوں کے جہاں نقل وعقل میں تعارض واقع ہو، تاویل کو جائز سمجھتے ہیں۔ لیکن جہاں تک دیکھا جاتا ہے وہ متشابہات کی تاویل پر حتی المقدر جراءت نہیں کرتے۔

شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ البالغہ میں لکھتے ہیں :-

من اصول الدین ترک الخوض بالعقل فی المتشابہات من الکتاب السنۃ۔

اس کے بعد فرماتے ہیں :-

ومن ذلک رای من المتشابہات امور کثیرۃ لا بد دی ادین

۱؎ قفال۔ محمد بن علی بن اسمٰعیل۔ ان کا نام تھا، بڑے مشہور عالم گزرے ہیں۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور علوم ادبیہ کے امام تسلیم کئے جاتے ہیں ۳۶۵ھ میں وفات پائی۔

۲؎ امام رازی۔ تفسیر کبیر کے مصنف اور تاریخ اسلام میں بڑے اعلیٰ پایہ کے عالم شمار ہوتے ہیں بہت سے علوم میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ ۵۴۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۶۰۶ھ میں وفات پائی۔

۳؎ ابوالحسن اشعری۔ فرقہ اشاعرہ کے بانی، علم کلام کے زبردست عالم اور تقریباً ۳۰۰ کتابوں کے مصنف تھے۔ ۲۷۰ھ میں بصرہ میں پیدا ہوئے اور ۳۲۰ھ میں بغداد میں انتقال کیا۔

۴؎ شہرستانی۔ مسلمانوں میں مشہور متکلم گزرے ہیں الملل والنحل ان کی نہایت مشہور کتاب ہے ۴۶۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۵۴۸ھ میں وفات پائی۔

حقیقۃ الکلام واقرب مجاز الیہا وذلک فیما لم یجمع
علیہا الامۃ ولہ تقع فیہ الشبہۃ۔ یعنی

"قرآن اور حدیث میں از قبیل متشابہات بہت سے بیانات ہیں
جن کی نسبت نہیں معلوم کہ ان کے حقیقی معنی مقصود ہیں یا ایسے مجازی
معنی جو حقیقت سے قریب تر ہوں' اور یہ تردد اُن بیانات میں ہے
جن کی نسبت اجماع امت سے فیصلہ نہیں ہوا اشتباہ رفع نہیں ہوا"

شاہ صاحب کے اس قول سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک قرآن مجید میں بہت سے مقامات ایسے باقی ہیں جن میں حقیقی اور مجازی دونوں معنوں کا احتمال ہے اور باوجودیکہ صدہا تفسیریں نہایت بسوط لکھی جا چکی ہیں۔ مگر آج تک کسی مفسر نے اس بات کا فیصلہ نہیں کیا کہ ان مقامات پر جو الفاظ حقیقی اور مجازی دونوں معنوں کو محتمل ہیں ان سے درحقیقت حقیقی معنی مقصود ہیں یا مجازی۔

قطع نظر اس محققانہ کلام کے جو شاہ صاحب نے متشابہات کے باب میں لکھا ہے۔ تفسیر کبیر اور حجۃ اللہ البالغہ کے دیگر حوالوں سے جو ہم پہلے دے چکے ہیں صاف پایا جاتا ہے کہ خدا کا کلام جو کافۂ انام کی ہدایت کے لیے نازل ہوتا ہے' اس کا طرز بیان ایسا ہونا چاہئے کہ ہر طبقے اور ہر درجے اور ہر زمانے کے لوگ اپنی اپنی سمجھ اور اپنی اپنی معلومات کے موافق اس سے ہدایت پا سکیں۔ جب انسان کی معلومات نہایت محدود اور اس کی سمجھ ابتدائی حالت میں ہو اس وقت بھی اس کی تعلیم سے وہی نتیجہ حاصل ہو جو علم انسانی کے منتہائے ترقی پر پہنچنے کے وقت حاصل ہو ورنہ اس کی نسبت یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ وہ کافۂ انام کی ہدایت کے لیے نازل ہوا ہے اور اس تقدیر پر امکان سے خارج ہے کہ جب تک انسان میں علمی ترقی کرنے کی قابلیت باقی ہے' کلام الٰہی نئی تفسیروں سے بالکل مستغنی ہو جائے۔ کیونکہ جس قدر انسان پر حقائق موجودات زیادہ منکشف ہوتے جائیں گے اسی قدر کلام الٰہی کے معنوں سے زیادہ پردے مرتفع ہوں گے۔

علامہ ابن الحاج اپنی مشہور کتاب "مدخل" میں لکھتے ہیں:

قال علیہ الصلوٰۃ والسلام فی القرآن لاتنقضی عجائب،
ولا یخلق علی کثرۃ الرد فعجائب القرآن لا تنقضی الی یوم
القیٰمۃ فکل قرن لابدلہ ان یاخذ منہ فوائد جمّۃ
خصہ اللہ تعالیٰ بہا وضمہا الیہ برکتہ ھذہ الامتہ
مستمرۃ الی یوم السّاعۃ"
یعنی "آنحضرت صلعم نے قرآن کے باب میں فرمایا ہے کہ اس
کے عجائب یعنی دقائق واسرار جو اس میں مضمر ہیں ختم نہ ہوں گے
اور وہ باوجود بار بار دہرانے کے پُرانا نہ ہوگا"
پس قرآن کے عجائب قیامت تک ختم نہ ہونے والے نہیں ہیں، اور اس لیے ہر زمانے
لوگوں کو چاہیئے کہ اس سے فوائد کثیرہ جو ان کے حصے میں آئے حاصل کریں تاکہ امت کی برکت روز قیامت تک جاری رہے
اس کے بعد علامہ موصوف لکھتے ہیں :-
"قال علیہ الصلوٰۃ والسّلام "مثل امتی کمثل المطر
لا یدری اولہ خیر ام اٰخرہ" یعنی فی البرکۃ والخیر
والدعوۃ الی اللہ تعالیٰ وتبئین الاحکام۔
یعنی آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ "میری امت کی مثال مینہ کی سی
ہے جس کا نہیں معلوم اول بہتر ہے یا آخر"۔
یعنی برکت اور خیر میں لوگوں کی طرف بلانے میں اور احکام الٰہی کے
بیان کرنے میں"۔
دونوں مذکورہ بالا حدیثوں سے جو علامہ ابن الحاج نے نقل کی ہیں۔ صاف ظاہر
ہے کہ قرآن کے عجائب اور دقائق ہمیشہ وقتاً فوقتاً انسان پر ظاہر ہوتے رہیں گے اور جس طرح
امت کے اول فرقوں میں قرآن کے بہت سے دقائق واسرار دنیا پر منکشف ہوں گے۔
امام حجۃ الاسلام غزالیؒ اس باب میں لکھتے ہیں کہ:
من معان دقیقۃ من اسرار القرآن یخطر علی قلب المتجردین

للذكر والفكر يخلو عنها كتب التفاسير ولا يطّلع
عليها فاضل المفسرين۔

یعنی قرآن کے ایسے بہت سے دقائق و اسرار جن سے تفسیر کی کتابیں خالی ہوتی ہیں اور بڑے بڑے مفسروں کو ان کی خبر نہیں ہوتی، ان لوگوں کے دلوں پر کھلتے ہیں جو ہمہ تن قرآن کے ذکر اور فکر میں محو ہو جاتے ہیں۔

ابتدائی اعتراض کا جواب

(قرآن مجید میں مزید تفسیر کی گنجائش باقی ہے۔)

اوپر کے بیان سے غالباً اس بات میں کچھ شبہ نہ رہا ہو گا کہ باوجود بے شمار تفسیروں کے جو گزشتہ تیرہ سو برس میں لکھی گئی ہیں، قرآن کی تفسیر سے ابھی استغنا نہیں ہوا۔ بہت سے مقامات اس میں اب بھی ایسے موجود ہیں جن کے معنی متعین نہیں ہوئے اور بہت سے عجائب اور دقائق و اسرار ایسے باقی ہیں جو امت پر ہنوز منکشف نہیں ہوئے اب صرف یہ دیکھنا باقی ہے کہ جن مقامات کی نسبت شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ اجماع امت سے یہ فیصلہ نہیں ہوا کہ وہاں الفاظ اپنے حقیقی معنوں میں بولے گئے ہیں یا مجازی معنوں میں آیا عندالضرورت اجماع امت کے خلاف اُن مقامات میں خوض کرنا اور ان متشابہ الفاظ کے معنی متعین کرنا مناسب ہے یا نہیں؟ اور اگر مناسب ہے تو اسلام کو اب ایسی ضرورت درپیش ہے یا نہیں کہ خرق اجماع پر مبادرت کی جائے اور جن متشابہات کی تاویل سے اب تک سکوت کیا گیا ان کے معنی صاف صاف بیان کیے جائیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدائے اسلام سے اس قاعدے پر برابر عمل ہوتا چلا آیا ہے کہ بعض ضرورتیں ممنوعات کو مباح و جائز کر دیتی ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ صحابہ اور تابعین کسی مسئلہ پر رائے اور قیاس سے گفتگو کرنے کو

نہایت مکروہ جانتے تھے۔ چنانچہ ابن مسعودؓ سے کسی نے کوئی مسئلہ پوچھا، چوں کہ اُن کو اُس کے متعلق کوئی حدیث معلوم نہ تھی، انھوں نے کہا:

"میں مکروہ جانتا ہوں اس بات کو کہ تیرے لیے حلال کر دوں جس کو خدا نے حرام کیا ہے، اور حرام کر دوں جس کو خدا نے حلال کیا ہے۔"

ابن عمرؓ نے جابر بن زید فقیہہ بصرہ سے کہا کہ:

"قرآن و حدیث کے بغیر کوئی فتویٰ نہ دینا اگر تو نے ایسا کیا تو خود بھی ہلاک ہو گا اور اوروں کو بھی ہلاک کرے گا۔"

ابوسلمہؓ جب بصرہ میں آئے تو انھوں حسن بصریؒ سے کہا:

"میں نے سنا ہے کہ تم اپنی رائے سے فتویٰ دیتے ہو، سو کبھی بغیر قرآن و حدیث کے فتویٰ نہ دینا۔"

شعبیؒ سے کسی نے پوچھا کہ "جب تم سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تھا تو تم کیا کرتے تھے؟" انھوں نے کہا:

"جب ہمارے مجمع میں سے کسی سے کوئی سوال پوچھا جاتا تھا وہ دوسرے کی طرف اشارہ کرتا تھا کہ اس کے سوال کا جواب دو۔ اور دوسرا تیسرے کی طرف۔ یہاں تک کہ پھر اول شخص تک سوال کی نوبت پہنچتی تھی۔"

یعنی جب کسی کو اُس مسئلہ کے متعلق کوئی روایت معلوم نہ ہوتی تھی تو سب جواب دینے سے سکوت کرتے تھے اور قیاس کو بالکل دخل نہ دیتے تھے۔

مگر آخر کار ضرورتوں نے قیاس کو ایسا ضروری چیز بنا دیا کہ وہ کتاب و سنت کا ہم پلّہ اور دلائل شرعیہ میں سے ایک دلیل قرار دیا گیا۔

ایک زمانہ تھا کہ قدر کے مسئلہ پر گفتگو کرنا ممنوع سمجھا جاتا تھا کیونکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اس زمانے کی مصلحت کے موافق اس مسئلے میں خوض کرنے سے منع فرمایا تھا اور

لوگوں کو قدر کے متعلق بحث کرتے ہوئے دیکھ کر نہایت غیظ و غضب میں ارشاد کیا تھا کہ ابھذا امرتم أم بھذا أرسلت۔ مگر جب ضرورت داعی ہوئی تو علماء کو چار ناچار اس پر بحث کرنی پڑی۔

بنی امیہ کے عہد میں جب استحکام سلطنت کے لیے سخت خونریزیاں ہونے لگیں اور ارکانِ سلطنت سے لوگوں نے متعجب ہو کر پوچھا کہ کیوں مسلمان قتل کئے جاتے ہیں؟ تو ان کو یہ جواب ملا کہ القدر خیرہ و شرہ من اللہ تعالیٰ۔ آخر کار علماء کو یہ عقدہ حل . . . . کرنا پڑا، اور قدر کے معنی بتانے پڑے اور یہ مسئلہ علم کلام کا ایک نہایت اہم اور ضروری مسئلہ قرار دیا گیا۔

چوتھی صدی ہجری تک اسلام میں تقلید شخصی کا بالکل وجود نہ تھا۔ عوام کو جب کوئی واقعہ پیش آتا تھا تو وہ جس عالم سے چاہتے تھے مسئلہ پوچھتے تھے اور خواص کو جب احادیث نبوی یا آثار صحابہ و تابعین میں کوئی بات اطمینان کے قابل نہ ملتی تھی تو جس فقیہ کے قول کو چاہتے تھے اختیار کرتے تھے، خواہ اہلِ مدینہ سے ہو یا اہلِ کوفہ سے مگر اس کے بعد وقتاً فوقتاً ایسے اسباب پیدا ہوتے گئے کہ رفتہ رفتہ تقلید شخصی قرین مصلحت سمجھی گئی۔ حالاں کہ صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین کا اس امر پر ہمیشہ اجماع رہا کہ وہ نہ خود کسی خاص شخص کا ہر ایک بات میں اتباع کرتے تھے اور نہ اوروں کا ایسا کرنا پسند کرتے تھے۔ مگر زمانے کی ضرورتوں نے مجبور کیا کہ ہر شخص آئمہ اربعہ[1] میں کسی امام کو تمام احکام میں اپنا مقتدا قرار دے۔ ورنہ اسلام میں طرح طرح کے فتنے پیدا ہوں گے، اور جس کا جو جی چاہے گا سو کرے گا۔ چناں چہ آج تک تمام ممالک اسلامیہ میں تقلید شخصی کی پابندی برابر چلی آتی ہے، اور کوئی شخص علی الاعلان اس پابندی سے آزاد نہیں ہو سکتا۔

---

[1] ائمہ اربعہ سے مراد حضرت امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالک اور امام احمد بن حنبل ہیں جن کی نسبت سے اسلام کے چار فرقے حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی کہلاتے ہیں۔

متشابہات کی تاویل میں جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے جب تک شک اور وسوسہ کا زمانہ نہیں آیا کسی نے دم نہیں مارا۔ مگر آخر کار اس زمانے کی ضرورتوں کے موافق علماء کو تاویل پہ مبادرت کرنی پڑی اور یہ بات کچھ قرآن مجید ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ تمام الہامی کتابیں اور صحیفے جو انبیائے بنی اسرائیل پر نازل ہوئے چوں کہ ان میں کثرت سے آیات متشابہات وارد ہوئی تھیں، اس لیے اگرچہ ایک مدت دراز تک لوگ ان کو حقیقی معنوں پہ محمول کرتے رہے مگر جس قدر علم انسانی ترقی کرتا گیا اسی قدر ان کے مجازی معنی جو اصل مقصود تھے، منکشف ہوتے گئے۔ یہودی جیسا کہ ملل و النحل شہرستانی سے ظاہر ہوتا ہے زمانہ دراز تک متشابہات توریت کو جن کی چند مثالیں ہم اوپر لکھ چکے ہیں، عموماً ان کے حقیقی معنوں پر محمول کرتے تھے مگر آخر کار علمائے یہود میں سے وقتاً فوقتاً ایسے لوگ اٹھنے شروع ہوئے جنھوں اس بات کو ظاہر کیا کہ تمام آیات متشابہات اول ہیں۔ چناں چہ فرقۂ یوذعانیہ اور موشکانیہ اور دونوں فرقوں کی بہت سی شاخیں جملہ متشابہات توریت کی تاویل کرتے ہیں اور برخلاف عامہ یہود کے ذات باری کو اوصاف بشری سے منزّہ جانتے ہیں۔

قرآن مجید میں جو آیتیں یا الفاظ اب تک ایسے موجود ہیں جن کی نسبت بقول شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے یہ فیصلہ نہیں ہوا کہ ان کے حقیقی معنی مقصود ہیں یا مجازی۔ اگر یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے کہ ان کے حقیقی معنی متعین کرنے کا وقت اب آپہنچا ہے تو اس کے سوا کچھ چارہ نہیں کہ فوراً یہ پردہ اٹھا دیا جائے۔ اور جو معنی اصول عربیت کے موافق قرار پائیں جن سے کوئی اعتراض جو قدیم تفسیروں پر وارد ہوتا ہے رفع ہو جائے تو بلا تامل وہی معنی اختیار کیے جائیں، اگرچہ تیرہ سو برس میں کسی مفسر نے وہ معنی نہ لکھے ہوں۔

مگر سوال یہ ہے کہ آیا ایسی ضرورت سردست درپیش ہے جو محظورات کو مباح کر دیتی ہے؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ:

جو لوگ زمانے کے حال سے بے خبر ہیں اور جن کے کان میں کوئی مخالف آواز نہیں پہنچی، ان کے نزدیک تو اس کے سوا کسی چیز کی بھی ضرورت نہیں کہ جو شخص جمہور کے خلاف ایک حرف زبان سے نکالے اس کو فوراً دائرہ اسلام سے خارج کر دیا جائے۔

آن حال پر تو یہ شعر صادق آتا ہے ؎

آفاتِ بحر سے ہیں ناواقف آشنا سب
ہنستے ہیں ناخدا ابر روتا ہے ناخداجب

مگر وہ لوگ جو اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں کہ مغربی تعلیم جس قدر دنیا میں زیادہ پھیلتی جاتی ہے، اسی قدر مذہبی عقائد اور مذہبی خیالات لوگوں کے دلوں سے کافور ہوتے جاتے ہیں، اُن کو وہ ضرورت روز روشن کی طرح نظر آتی ہے، وہ خوب جانتے ہیں کہ جس ضرورت نے حکمائے اسلام یعنی قدیم متکلمین کو سلف صالح کے برخلاف تاویل متشابہات پر مجبور کیا تھا، وہ ضرورت ہمارے زمانے میں حد غایت کو پہنچ گئی ہے۔ اس زمانے میں حکمت اور فلسفہ خاص کر علماء و مصنفین کے گروہ میں محدود تھا جو معقولات کو زیادہ تر منقولات کی تقویت اور دین کی حمایت کے لیے حاصل کرتے تھے، مگر اس زمانے میں مغربی تعلیم ضروریاتِ زندگی میں داخل ہوگئی ہے۔ ہر شخص عام اس سے کہ نوکری پیشہ ہو، تاجر ہو، یا اہلِ حرفہ ہو، مجبور ہے کہ اولاد کو مغربی تعلیم دلوائے اور اس لیے مغربی علوم کی تعلیم مذہب کے حق میں بہ نسبت یونانی علوم کے زیادہ خطرناک ہوگئی ہے، اس لیے جو شبہات ان سے مذہب کی نسبت پیدا ہوتے تھے ان کے دفعیہ کے لیے اکثر حالتوں میں صرف لا نسلّم کہہ دینا کافی تھا۔ مگر اس زمانے میں علم کی بنیاد تجربہ اور مشاہدہ اور استقرار پر رکھی گئی ہے اور اس لیے جو شکوک اب مذہب کی نسبت پیدا ہو سکتے ہیں وہ صرف لا نسلّم کہہ دینے سے رفع نہیں ہو سکتے۔

غرضکہ گزشتہ اور موجودہ صدی میں علم و حکمت نے بے انتہا ترقی کی ہے۔ ہزاروں باتیں جو پہلے معلوم نہ تھیں اب معلوم ہوئی ہیں۔ بہت سی باتیں جو پہلے صحیح مانی جاتی تھیں، اب غیر ممکن الوقوع مانی جاتی ہیں، یہاں تک کہ علوم قدیمہ اور علوم جدیدہ میں زمین و آسمان کا فرق ہو گیا ہے۔

اگرچہ ممکن ہے کہ آئندہ کوئی ایسا زمانہ آئے کہ زمانۂ حال کے اکثر مسلمات غلط ثابت ہو جائیں۔ لیکن چوں کہ حال کی تحقیقات کا مدار صرف قیاسی اور ظنّی باتوں پر نہیں، بلکہ زیادہ

تر تجربہ اور مشاہدہ پر ہے اور اس لیے بہت کم احتمال اس بات کا ہے کہ جو علوم اور مسائل سائنس کے درجے کو پہنچ گئے ہیں ان میں آئندہ کسی قسم کی تبدیلی واقع ہو۔ پس جو باتیں قرآن میں بظاہر زمانۂ حال کی تحقیقات کے خلاف معلوم ہوتی ہیں، جب تک کہ اس تحقیقات کو غلط ثابت نہ کیا جائے، ضرور ہے کہ یا تو قرآن کو حقائق محققہ کے برخلاف تسلیم کریں اور یا اُس کے ایسے معنی بیان کریں جو زمانۂ حال کی تحقیقات کے برخلاف نہ ہوں۔ مگر ہم قرآن میں بہت سی ایسی آیات متشابہات پاتے ہیں کہ اگر اُن کو مجازی معنوں پر محمول کیا جائے تو ہم کو اصول عربیت کے خلاف تکلفات لایعنی کرنے پڑتے ہیں اور نہ قرآن کے اسلوب بیان سے تجاوز کرنا لازم آتا ہے اور باوجود اس کے زمانۂ حال کے شبہات جو اُن آیتوں کی قدیم تفسیر پہ وارد ہوتے ہیں بالکل رفع ہو جاتے ہیں اور اس لیے کوئی وجہ نہیں ہے کہ ان آیتوں کو صرف اس خیال سے کہ جمہور مفسرین نے اُن کو ہمیشہ حقیقی معنوں پر مقصود رکھا ہے، ہم مجازی معنوں پر محمول نہ کریں۔

جو لوگ سرسید کی تفسیر کی نسبت کہتے ہیں کہ:

"جو معنی قرآن کے انھوں نے لکھے ہیں نہ وہ خدا کو سوجھے نہ رسولؐ کو" سو شاید سرسید کی بعض تاویلات کی نسبت یہ کہنا صحیح ہو مگر ان کی تمام تفسیر کی نسبت ایسا کہنا محض ستم ظریفی ہے۔

یہ بات تو خدا ہی کو معلوم ہے کہ جو معنی سرسید نے قرآن کے بیان کئے ہیں وہ خدا اور خدا کے رسول کو سوجھے تھے یا نہیں؟ مگر اس میں شک نہیں کہ ان معنوں کا اس زمانے میں جبکہ قرآن نازل ہوا مخاطبین پر ظاہر کرنا شارع کے مقصود کے بالکل برخلاف تھا۔

ہم اوپر بحوالۂ تفسیر کبیر اور حجۃ اللہ البالغہ کے لکھ چکے ہیں کہ قرآن میں انسان کی سیدھی سادی سمجھ کے موافق (جو علم و حکمت تک پہنچنے سے پہلے اس کی خلقت میں ودیعت تھی) خطاب کیا گیا ہے اور بہت سے حقائق مجازو .... استعارہ و تمثیل کے پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں تاکہ جب تک مخاطبین اپنی عقل طبعی سے ترقی کر کے علم و حکمت کے اعلیٰ درجے تک نہ پہنچیں اس وقت تک جو معنی ان الفاظ سے بظاہر متبادر ہوں انھیں پر قانع رہیں مگر جوں جوں حقائق اشیا ان پر منکشف ہوتے جائیں اسی قدر ان الفاظ کے معنی مقصود ان پر کھلتے جائیں۔ پس جو معنی قرآن کے اب آئندہ ایسے بیان کئے جائیں جو

اصول عربیت اور اصول قرآن کے خلاف نہ ہوں اور باوجود اس کے اُن کے اختیار کرنے سے کوئی اعتراض جو قدیم تفسیروں پر وارد ہوتا ہے بخوبی رفع ہوتا ہو اُن کی نسبت صرف اس بناپر کہ نزول قرآن کے وقت ان کو شارع نے بیان نہیں کیا، یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ معنی خدا کو سوجھے نہ رسولؐ کو۔

قرآن مجید میں بہت سی آیتیں جبر پر اور بہت سی قدر پر دلالت کرتی ہیں مگر آنحضرت صلعم نے مسئلہ جبر و قدر کی نسبت اس کے سوا کبھی کچھ نہیں فرمایا، بلکہ لوگوں کو اس پر بحث کرتے ہوئے دیکھ کر نہایت ناراضی ظاہر کی اور اس پر بحث کرنے سے منع فرمایا، باوجود اس کے جب ضرورت داعی ہوئی تو صحابہ ہی کے وقت میں اس پر بحث شروع ہو گئی، چناں چہ عمرو بن عاصؓ اور ابو موسیٰ اشعریؓ میں جو اس مسئلہ کے متعلق گفتگو ہوئی وہ ملل والنحل شہرستانی میں مذکور ہے اور پھر مفسرین اشاعرہ نے بمقابلہ معتزلہ کے اُن آیات کی تفسیر میں جو جبر یا قدر پر دلالت کرتی ہیں اس مسئلہ کے متعلق کوئی تیر اپنے ترکش میں باقی نہیں چھوڑا۔ پھر کیا کوئی اشعری یہ کہہ سکتا ہے کہ جو معنی ان آیتوں کے ہمارے علماء اور آئمہ نے بیان کئے ہیں وہ خدا کو سوجھے نہ خدا کے رسولؐ کو۔

یہاں تک جو کچھ ہم نے بیان کیا اس سے صرف اس قدر ثابت کرنا مقصود تھا کہ قرآن مجید میں باوجود بے شمار تفسیروں کے جو گزشتہ تیرہ سو برس میں لکھی گئیں اب تک نئی تفسیر کی گنجائش باقی ہے۔ اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ:

سرسید نے جن آیتوں کی تفسیر جمہور مفسرین کے خلاف لکھی ہے، وہ کہاں تک اصول عربیت اور اسلوب قرآن کے موافق ہے؟

جن اعتراضات کے رفع کرنے کی غرض سے انھوں نے جمہور سے اختلاف کیا ہے ان کے رفع کرنے کی فی الواقع ضرورت ہے یا نہیں؟

جو معیار قرآن کے الہامی ہونے کا انھوں نے قرار دیا ہے اس کے سوا کوئی دوسرا معیار قرار پا سکتا ہے یا نہیں؟

ان عنوانوں پر ہم آئندہ اپنے خیالات ظاہر کریں گے۔ وما توفیقی الا باللہ۔

۲۳۔ قرونِ اولیٰ کی حق گوئی وحق پسندی

(از رسالہ معارف، پانی پت بابت ستمبر ۱۹۱۱ء جلد ۳ نمبر ۹ صفحہ ۲۶۵ تا ۲۷۲)

اگرچہ وحشیانہ آزادی دنیا کی عرب عرباکی طبیعتوں میں قدیم سے متوارث چلی آتی تھی مگر اسلام کی تعلیم سے (جب تک کہ خود مختار سلطنتوں کے سیلاب نے اس گدلا اور مکدر نہیں کیا) ان کی یہ جبلی خصلت تہذیب وشائستگی کے زیور سے آراستہ ہوگئی تھی اور آزادی کا جوہر حق گوئی وحق پسندی کے قالب میں ڈھل گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ خلفا کی غلطیوں پر گرفت کی جاتی تھی اور وہ معقول اعتراض سن کر خاموش ہو جاتے تھے۔

عمر فاروقؓ پر جب کوئی اعتراض کرتا تھا اور کہتا تھا کہ "اے عمر! خدا سے ڈر" تو وہ اس کا شکریہ ادا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ:

"خدا اس کا بھلا کرے، جس نے ہمارے عیب سے ہم کو آگاہ کیا۔"

ایک دفعہ انھوں نے ایک معمر آدمی کو جب کہ وہ اپنے گھر کے اندر شراب و نغمہ میں مشغول تھا، جا پکڑا اور اس کو سخت نفریں کی۔ اس نے کہا:

"اے امیر المومنین! تیری حرکت اس سے بھی زیادہ قابل نفریں ہے۔
تو نے تجسس کیا، حالانکہ خدا تجسس سے منع کرتا ہے۔ پھر تو گھر میں بغیر
اذن کے چلا آیا، حالانکہ خدا نے اس کی ممانعت کی ہے۔"

عمر فاروقؓ نے کہا:

"بے شک، تو سچ کہتا ہے۔"

اور وہاں سے نہایت ندامت اور افسوس کے ساتھ یہ کہتے ہوئے نکلے

ثکلت عمر امہ ان لم یغفر لہ۔

یعنی عمر کی ماں اس کو رو دیو۔ اگر خدا اس کا قصور معاف نہ کرے۔

مسلمان عورتوں کی بہادری وحق گوئی کی چند مثالیں

قرونِ اولیٰ کی تاریخ میں اس قسم کی مثالیں شمار واحصار سے خارج ہیں، اور جس طرح مردوں کی آزادی وحق کی مثالیں جا بجا ملتی ہیں اسی طرح عورتوں کی بھی ایسی مثالوں کی کچھ کمی نہیں ہے۔ یہاں ہم کتاب عقد الفرید سے چند حکایتیں ان عورتوں کی نقل کرتے ہیں جو "جنگ صفین" میں ہاشم کی طرفدار تھیں اور جنگ کے خاتمے کے بعد جب حضرت امیر معاویہؓ سے اُن کی گفتگو ہوئی تو انھوں نے نہایت آزادی کے ساتھ اپنے دلی خیالات ظاہر کئے اور جس بات کو وہ اپنے نزدیک حق جانتی تھیں اس کے ظاہر کرنے سے امیر شام کا رعب ودبدبہ ان کو مانع نہیں آیا۔

ازآں جملہ شعبی سے روایت ہے کہ بنی ہلال کی ایک عورت بکارہ نامی نے حضرت امیر معاویہؓ کے روبرو (جب کہ وہ مدینہ میں تھے) حاضر ہونے کی اجازت چاہی۔ چناں چہ اس کو اجازت دی گئی۔ بکارہ اس وقت معمّر ہو گئی تھی۔ اس کی بینائی میں فرق آگیا تھا۔ قویٰ ضعیف ہو گئے تھے اور بدن میں رعشہ تھا۔ دو خادم اس کو تھام کر امیر کے سامنے لائے۔ بکارہ نے سلام کیا اور بیٹھ گئی۔

امیر نے سلام کا جواب دیا اور مزاج پوچھا اور کہا:

"افسوس کہ زمانے نے تمھارا حال دگرگوں کر دیا۔"

بکارہ نے کہا "بے شک اس کی گردشیں ایسی ہی ہیں۔"

مروان نے بطورِ سعایت کے کہا "اے امیر المومنین! تم نے اس کا کلام بھی سُنا ہے یہ کہتی ہے ؎

اتری ابن هند لی لخلافۃ مالکا ... هیهات ذالک وان أراد بعید

منتک نفسک فی الخلاء ضلالۃ ... اغواک عمرو ولا شفاء سعید

یعنی کیا ہم ابن ہند (یعنی معاویہؓ) کو خلافت کا مالک سمجھیں؟ یہ اور از قیاس ہے۔ اور اگر وہ ایسا چاہے تو اس کے مرتبے سے بالا تر ہے (اے معاویہ) تیرے نفس نے گمراہی سے یہ آرزو تیرے دل میں ڈالی ہے اور عمرو بن العاص اور سعید بن العاص نے تجھ کو بدبختی کے لیے ورغلایا ہے۔

جب مروان یہ اشعار پڑھ چکا تو سعید بن العاصؓ نے کہا کہ اس نے یہ اشعار بھی کہے ہیں ؎

قد کنت اں اطمع ان اموت ولا اری	فوق المنابر من امیة خاطبا
فالله اخر مدتی فتطاولت	حتی رایت من الزمان عجائبا
فی کل یوم للزمان خطیبهم	بین الجمیع لآل احمد غائبا

یعنی "میری آرزو تھی کہ مرجاؤں اور بنی امیہ میں سے کسی کو منبر پر خطبہ پڑھتا ہوا نہ دیکھوں، مگر خدا نے میری رسی دراز کر دی اور یہاں تک کہ زمانے کے عجیب عجیب کرشمے میری نظر سے گزرے ہیں۔ برابر خطیبوں سے علی الاعلان آل احمدؐ کی برائیاں سنتی رہی۔

مروان وغیرہ جب یہ چھیڑ کرنے کے بعد خاموش ہوئے تو بکارہ بولی:

"اے معاویہ! بے شک یہ میرا کلام ہے جو انھوں نے اس وقت پڑھا اور جو کلام ابھی تجھ پر ظاہر نہیں کیا گیا وہ اس سے بہت زیادہ ہے۔"

امیر کو یہ سن کر ہنسی آگئی اور کہا یہ امر تمھاری حاجت برآری کرنے سے مجھ کو مانع نہیں آسکتا۔ تم اپنی حاجت بیان کرو۔

اس غیرت مند عورت نے کہا:

"بس! اب اس بے لطفی کے بعد ایسا نہیں ہو سکتا" اور وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔

شعبی نے بنی امیہ کی ایک جماعت سے روایت کی ہے کہ ایک دن رات کو جب کہ امیر معاویہؓ کے پاس عمرو، سعید، عتبہ اور ولید موجود تھے، عدی بن قیس ہمدانی کی بیٹی زرقا کا ذکر چلا جو اپنی قوم کے ساتھ جنگ صفین میں شریک تھی۔ امیر نے کہا "تم میں سے کسی کو اس کا کلام یاد ہے؟" اُن میں سے بعض نے کہا:

"ہاں! اے امیرالمومنین! ہم کو یاد ہے۔"

امیر نے کہا:

"مجھ کو مشورہ دو کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟"

بعضوں نے کہا اس کو قتل کر دیا جائے۔ امیر نے کہا:

"تم نے بہت بُرا مشورہ دیا۔ کیا مجھ کو زیبا ہے کہ میں اپنی نسبت لوگوں سے یہ کہلواؤں کہ ایک عورت کو جب کہ وہ قابو میں آگئی قتل کر ڈالا؟"

اس کے بعد امیر نے کوفہ کے عامل کو (جہاں زرقا رہتی تھی) لکھا کہ زرقا کو اس کے چند معتبر محرموں اور قبیلے کے سرداروں کے ہمراہ عمدہ ساز و سامان کے ساتھ اور معقول سفر خرچ دے کر ہمارے پاس روانہ کر دو۔

عامل نے زرقا کو طلب کیا اور امیر کا خط پڑھوا دیا۔ زرقا نے کہا:

"اگر امیر نے میرا وہاں جانا میری مرضی پر منحصر رکھا ہے تو میں جانا نہیں چاہتی، اور اگر حتمی حکم ہے تو بہر حال جانا پڑے گا۔ فرمانبرداری ضروری ہے۔"

آخر عامل نے جیسا کہ اس کو حکم تھا، بہت تزک و احتشام کے ساتھ روانہ کیا۔

جب وہ معاویہؓ کے پاس پہنچی تو امیر نے اس کو بہت خاطر داری اور اعزاز کے ساتھ لیا اور پوچھا کہ سفر کس طرح طے ہوا؟ کہا "جس طرح لڑکی ماں کی گود میں پرورش پاتی ہے یا بچہ گہوارے میں سوتا ہے۔"

امیر نے کہا "ہم نے اسی طرح عامل کو ہدایت کی تھی۔"

پھر زرقا سے پوچھا "تم کو معلوم ہے کہ تم کیوں بلائی گئی ہو؟"

اس نے کہا "جو راز مجھ پر ظاہر نہیں کیا گیا اس کو میں کیونکر جان سکتی ہوں۔"

امیر نے کہا:

"اے زرقا! کیا تو سرخ اونٹ پر سوار جنگِ صفین کے مجمع میں موجود نہ تھی اور کیا تو اپنے خطبوں سے آتشِ حرب کو نہیں بھڑکا رہی تھی اور لوگوں کو مقابلے پر برانگیختہ نہیں کر رہی تھی؟ آخر کار اس جوش کا کیا سبب تھا۔؟"

زرقا نے کہا:

"اے امیر المومنین! سر مر چکا، اور دُم کٹ چکی، اور جو کچھ جاتا تھا جا چکا، زمانہ پشیاں کھانے والا ہے اور حوادث و واقعات کا سلسلہ برابر جاری ہے۔"

امیر نے کہا "اے زرقا! تجھ کو اپنا اس دن کا خطبہ یاد ہے؟"

اس نے کہا "لا واللہ، مجھ کو بالکل یاد نہیں رہا۔"

امیر نے کہا "تجھ کو نہیں تو مجھ کو یاد ہے، تیری اس تقریر کا کیا کہنا ہے، جو تو اس وقت کہہ رہی تھی کہ:

"اے لوگو! باز آؤ اور پلٹ جاؤ، تم اس فتنہ میں پڑ گئے ہو جس نے تم پر ظلم کے پردے ڈال دیے ہیں اور تم کو راہ راست سے برگشتہ کر دیا ہے، یہ کیسا اندھا اور بہرا اور گونگا فتنہ ہے کہ نہ ہانکنے والے کی آواز سنتا ہے نہ کھینچنے والے کی مرضی پر چلتا ہے۔ دیکھو! چراغ آفتاب کے سامنے روشن نہیں ہوتا اور ستارے چاند کے سامنے ماند رہتے ہیں، اور لوہے کو لوہا ہی کاٹ سکتا ہے ــــ دیکھو! جو ہم سے راہ پوچھے گا ہم اس کو راہ بتائیں گے، اور جو ہم سے سوال کرے گا ہم اس کو جواب

لہ عربی کی یہ مثل کہ "مات الراس و بتر الذنب" ایسے موقعوں پر بولی جاتی ہے جیسے ہم کہتے ہیں "گزشتہ را صلوات" یا "الماضی لا یذکر۔"

دیں گے۔ لوگو! حق اپنی کھوئی ہوئی چیز کو ڈھونڈ رہا تھا سو وہ اس کو مل گئی ـــ پس اے مہاجرین! غم و غصہ پر صبر کرو۔ تفرقہ کا رخنہ بند ہو گیا ہے اور کلمۂ حق پر سب متفق ہو گئے ہیں اور سچائی نے ظالموں کا سر توڑ دیا ہے ـ یاد رکھو! عورتوں کی آرائش مہندی سے ہے اور مردوں کی زیبائش خون سے ہے۔"

غرض کہ جس قدر امیر کو اس کے فقرے یاد تھے، پڑھ کر کہا:

اے زرقاؑ! جو خون علیؓ نے بہائے ان میں تو بھی شریک تھی؟"

زرقاء نے کہا:

"خدا تیرا بھلا کرے اور تجھے سلامت رکھے۔ تُو نے ایک مژدہ سنا کر اپنی جلیس کو (یعنی مجھ کو) خوش کر دیا۔"

امیر نے کہا:

"کیا اس بات سے کہ سفکِ دماء میں تو علیؓ کے ساتھ شریک تھی تجھ کو خوشی ہوئی؟"

کہا "بیشک! اور اب تجھ کو میرے خیالات کا بخوبی اندازہ ہو گیا ہو گا؟"

امیر یہ سن کر ہنسا اور کہا:

"واللہ، علیؓ کے ساتھ تمہاری وفاداری اس کی وفات کے بعد زیادہ عجیب ہے بہ نسبت اس محبت و ولا کے جو اس زندگی میں تو اس کے ساتھ رکھتی تھی۔ اے زرقاء، اب تو اپنی حاجت بیان کر، میں اس کو پورا کروں گا۔"

زرقاء نے کہا:

"میں نے قسم کھائی ہے کہ جن کے برخلاف میں نے کوشش کی ہے، ان سے کبھی سوال نہ کروں گی، ہاں اگر تو بغیر طلب اور خواہش کے کچھ دے تو تجھ کو اختیار ہے۔"

امیر نے کہا "ٹھیک ہے۔" اور اس کو اور اس کے ہمراہیوں کو انعام و اکرام اور خلعت دے کر رخصت کیا۔

سعید ابن حذاذ سے منقول ہے کہ مروان نے (جب کہ مدینہ کی ولایت اس کے نامزد تھی) ایک لڑکے کو کسی قصور پر قید کر دیا۔ جب اس کے گھر خبر پہنچی تو اس کی دادی ام سنان بنت جشمہ مروان کے پاس گئی اور اپنے پوتے کے باب میں کچھ گفتگو کی۔ مروان نے نہایت سخت جواب دیا۔ وہ اس پر سیدھی امیر معاویہؓ کے دربار میں پہنچی اور اپنا حسب ونسب بیان کیا۔

امیر نے اس کو پہچان لیا اور کہا:

"اے بنت جشمہ! بہت اچھا ہوا کہ تو آئی۔ مگر یہاں قدم رنجہ کرنے کا کیا باعث ہوا؟ مجھ کو خوب معلوم ہے کہ تو ہم پر تبرا کرتی تھی اور ہمارے دشمنوں کو ہمارے مقابلے میں برانگیختہ کرتی تھی۔"

ام سنان نے کہا:

سن اے معاویہؓ! عبد مناف کی اولاد کو اخلاقِ پاکیزہ اور حلم وسیع دیا گیا ہے، وہ واقف ہو کر انجان نہیں بنتے، اور حلم اختیار کر کے سفاہت اختیار نہیں کرتے، اور عفو کے بعد انتقام نہیں لیتے، اور اپنے اسلاف کے قدم بہ قدم چلنا سب سے زیادہ تجھ کو سزاوار ہے۔"

امیر نے کہا "ہاں بے شک ہم ایسے ہی ہیں۔"

اس کے بعد امیر نے ام سنان کے چند اشعار پڑھے جن میں علی مرتضیٰؓ کی مدح وثنا اور اُن کے مخالفین پر تعریض کی گئی تھی۔ ام سنان نے اقرار کیا کہ بے شک یہ اشعار میرے ہیں۔ مگر میں امید کرتی ہوں کہ تو ہمارے لیے (علی مرتضیٰؓ کے بعد) اچھا جانشین ہوگا۔

امیر کے ایک جلیس نے ام سنان کے کچھ اور اشعار پڑھے جن سے امیر کی طبیعت پر اس کی نسبت برا اثر ہوا۔ ام سنان نے کہا:

"اے امیر المومنین! مسلمانوں کے دل میں تیری دشمنی پیدا ہونے کے یہی لوگ باعث ہیں۔ ان کی باتوں کو حقیر جان، اور ان کو اپنا مقرب نہ بنا۔ اگر تو ایسا کرے گا تو خدا کا قرب اور مومنوں کی محبت تیرے ساتھ زیادہ ہوگی۔ تو ہماری رائے اور ہمارے دلی خیالات سے واقف ہے۔ واللہ اعلم۔"

کو ہم تجھ سے زیادہ محبوب رکھتے تھے، لیکن تجھ کو بھی اور لوگوں سے زیادہ محبوب رکھتے ہیں۔"

امیر نے پوچھا "کن سے؟" کہا "مروان بن الحکم اور سعید بن العاص سے۔"

امیر نے پوچھا "میں اس محبت کا مستحق تیرے نزدیک کیوں کر ہوا؟"

کہا اپنے وسعت علم اور عفو و درگذر کے سبب۔

امیر نے پوچھا۔ "یہاں کیوں کر آنا ہوا؟"

کہا "مروان نے مدینہ میں ایسے قدم جمائے ہیں کہ گویا وہاں سے کبھی نہ ٹلے گا۔ نہ وہ انصاف کے ساتھ حکومت کرتا ہے اور نہ شریعت کے موافق فیصلہ کرتا ہے۔ مسلمانوں کی لغزشیں ڈھونڈتا رہتا ہے اور اُن کے پردے فاش کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ اُس نے ابھی میرے پوتے کو قید کیا ہے۔ میں اس کے پاس گئی تھی۔ اُس نے کہا تُو نے ایسا کیا اور تُو نے ویسا کیا (یعنی بنی امیہ کے خلاف کارروائیاں کیں) میں نے بھی اس کو پتھر سے زیادہ کرخت اور حنظل سے زیادہ کڑوے جواب دیے اور اپنے تئیں ملامت کی، اور دل میں کہا کہ میں کیوں نہ اپنا معاملہ اُس شخص کے پاس لے جاؤں جس سے بہ نسبت مروان کے زیادہ عفو و درگذر کی امید ہے۔ پس میں تیرے پاس آئی ہوں، تاکہ تُو میرے معاملہ پر غور کرے۔"

امیر نے کہا "تُو سچ کہتی ہے۔ میں تجھ سے تیرے پوتے کی صفائی کے متعلق کچھ پوچھنا نہیں چاہتا۔" اور کاتب کو اشارہ کیا کہ رہائی کا حکم لکھ کر دے دو، اور پانچ ہزار درہم زادِ راہ کے لیے اور اونٹ سواری کے لیے اس کو دے کر رخصت کیا۔

ابو بکر ہذلی نے عکرمہ[۱] سے روایت کی ہے کہ اطرش ابن رواحہ کی بیٹی اپنے عصا

---

۱ یہ عکرمہ ابو جہل کے بیٹے نہیں، بلکہ عبد اللہ بربری کے لڑکے، حضرت عباس کے غلام (باقی صـ۲۵۳ پر)

کے سہارے سے امیر معاویہؓ کے دربار میں آئی اور یہ کہہ کر کہ "السّلام علیک یا امیرالمومنین"! بیٹھ گئی۔

امیر نے کہا۔" اے عکرشہ! کیا اب میں تیرے نزدیک امیرالمومنین ہوگیا؟

عکرشہ نے کہا "ہاں! کیوں کہ اب علیؓ زندہ نہیں رہے"۔

اس کے بعد امیر نے کہا۔" کیا تو تلوار حمائل کئے صفین میں خطبہ نہیں پڑھ رہی تھی؟

اور چند فقرے جو اس خطبے میں یاد رہ گئے تھے، پڑھے، جن میں یہ الفاظ بھی شامل تھے کہ

"اے مہاجرین و انصار! معاویہؓ ناسمجھ عربوں کو جو نہ ایمان کو جانتے ہیں اور نہ شریعت کو سمجھتے ہیں، ساتھ لے کر تم سے لڑنے آیا ہے۔ اُن کو دُنیا کا لالچ دیتا ہے، سو وہ لالچ میں آگئے ہیں اور اُن کو باطل کی طرف پکارا ہے، سو وہ اس کی طرف دوڑ پڑے ہیں"؟ پھر امیر نے کہا "میں اس وقت تجھ کو دیکھ رہا تھا کہ تو گویا اسی عصا کے سہارے کھڑی تھی اور دونوں لشکر بالاتفاق کہہ رہے تھے کہ یہ اطرش بن رواحہ کی بیٹی عکرشہ ہے۔ اگر اس وقت تیرے اختیار میں ہوتا تو تو اہلِ شام کا قلع قمع کر ڈالتی۔ مگر جو خدا کو منظور ہوتا ہے وہی ظہور میں آتا ہے۔ آخر اس جوش کا کیا سبب تھا؟"

عکرشہ نے کہا:۔

" اے امیرالمومنین! صدقات میں ہمارا حق تھا جو کہ ہمارے مقدور والوں سے لیے جاتے تھے اور ہمارے بے مقدوروں پر تقسیم کیے جاتے تھے۔ سو یہ حق ہمارے ہاتھ سے جاتا رہا تھا۔ نہ ہمارے شکستہ حالوں کی خبر جاتی تھی، نہ ہمارے محتاجوں کی دستگیری کی جاتی تھی۔ پس اگر یہ تیری رائے سے ہوا تھا تو تجھ کو غفلت سے ہوشیار ہونا اور اپنی رائے سے رجوع کرنا چاہئے تھا۔ اور اگر

صہ ۲۵۲ سے آگے: اور بڑے عالم، فقیہہ، محدث اور مفسر ہیں ۱۰۲ھ (۲۰،۷ء) میں وفات پائی۔

تیری رائے کے خلاف تھا تو تجھ کو زیبا نہیں تھا کہ خائنوں سے مدد لے اور ظالموں کو کام سپرد کرے۔"

امیر نے کہا "اے عکرشہ! ہم کو رعیت کے معاملات میں ایسے امور پیش آ جاتے ہیں جن کی روک تھام کرنا اور سمیٹنا مشکل ہو جاتا ہے۔"

عکرشہ نے کہا "خدا نے ہمارے لیے کوئی حق ایسا مقرر نہیں کیا جس میں دوسرے کا ضرر ہو۔" آخر امیر نے اس کی خواہش کے موافق حکم دے دیا۔

ابو سہیل تمیمی سے روایت ہے کہ معاویہؓ ابن ابی سفیان نے موسم حج میں بنی کنانہ کی ایک عورت کا حال پوچھا جو حجونیہ میں آ کر اترا کرتی تھی اور جس کو دارمیہ حجونیہ کہتے تھے اور جو نہایت سیہ فام اور فربہ تھی۔ لوگوں نے کہا وہ موجود ہے۔ امیر نے اس کو بلا بھیجا۔ جب وہ آئی تو اس سے پوچھا "اے دارمیہ! تو جانتی ہے کہ تجھ کو کیوں بلایا گیا ہے؟" اس نے کہا:

"غیب کا علم تو خدا ہی کو ہے۔"

امیر نے کہا "میں نے تجھ سے یہ پوچھنے کو بلایا ہے کہ تو کس لیے علیؓ سے محبت اور مجھ سے بغض رکھتی تھی؟" اس نے کہا "تو مجھ کو معاف کرے گا؟" امیر نے کہا "نہیں" اس نے کہا "اگر تو نے معافی سے انکار کیا ہے تو سن!

میں علیؓ کو اس لیے دوست رکھتی تھی کہ وہ رعیت کے ساتھ انصاف کرتا تھا۔ سب کو استحقاق کے موافق حقوق دیتا تھا۔ مسکینوں سے محبت رکھتا تھا اور دینداروں کی تعظیم کرتا تھا، اور تجھ سے اس لیے بغض رکھتی تھی تو اپنے سے افضل کے ساتھ لڑا، اور جس کا تو مستحق نہ تھا اس حق کا طالب ہوا۔ تو نے خونریزی کرائی، فیصلوں میں ناانصافی کی۔ ہوائے نفس کے موافق حکومت کی۔"

امیر نے کہا "نیک بخت! تو نے علیؓ کو دیکھا بھی ہے؟" کہا "کیوں نہیں"۔ "تو نے اس کو کیسا پایا؟" کہا "واللہ! اس کو حکومت نے تیری طرح فتنے میں نہیں ڈالا، اور دولت نے تیری طرح اس کو غافل نہیں کیا"۔ امیر نے پوچھا تو نے اس کا کلام بھی سنا ہے؟

کہا "کیوں نہیں، اس کا کلام تاریکی سے دلوں کو اس طرح جلا کرتا تھا جیسے تیل برتن کا زنگ چھڑا دیتا ہے۔"

امیر نے کہا "بیشک تو سچ کہتی ہے، اگر تجھ کو کوئی حاجت ہو تو بیان کر۔" اُس نے کہا "کیا تو اُسے پورا کرے گا؟" امیر نے کہا "ضرور" اُس نے کہا "مجھ کو سو اونٹنیاں سرخ رنگ کی دے جن کے ساتھ ان کا ساربان بھی ہو۔"

امیر نے کہا "اگر میں یہ اونٹنیاں تجھ کو دوں تو بھی میری جگہ تیرے دل میں علیؓ کے برابر ہو گی یا نہیں؟"

دارمیہ نے کہا "سبحان اللہ! کیا اُس کے سوا دوسرے شخص کی جگہ؟"

امیر نے اس کے جواب میں یہ دو شعر پڑھے ؎

اذا لم اعد بالحلم منی علیکم فمن ذا الذی بعدی یؤمل بالحلم

خذیھا ھنیئاً واذکری فعل ماجد جزاک علی حرب العداوۃ بالسلم

یعنی "اگر میں تیرے ساتھ فراخ حوصلگی سے پیش نہ آؤں تو پھر میرے بعد کون ہے جس سے امید کی جائے؟ لے یہ اونٹنیاں تجھ کو مبارک ہوں اور یاد رکھ اُس شخص کو جس نے تیرے ساتھ عداوت کی لڑائی کا معاوضہ صلح کے ساتھ کیا ہے۔" اس کے بعد امیر نے کہا "واللہ! اگر علیؓ زندہ ہوتا تو ان میں سے ایک اونٹنی بھی تجھ کو نہ دیتا۔" وہ بولی:

"واللہ! اونٹنی تو اونٹنی وہ ایک بال کا تجھ بھی مسلمانوں کے مال سے دینے والا نہ تھا۔"

شعبی سے روایت ہے کہ معاویہؓ نے کوفے کے والی کو لکھا کہ ام الخیر بنت حریش ابن سراقہ کو سوار کرا کر عزت و احترام کے ساتھ ہمارے پاس بھیج دے۔ والی نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور ام الخیر بہت آرام کے ساتھ معاویہؓ کے پاس پہنچی۔ معاویہؓ نے اس کو اپنے محل میں اتارا، اور چوتھے روز جب کہ جلیس و مصاحب جمع تھے، اس کو بات چیت کے لیے بلایا۔ ام الخیر نے آتے ہی کہا:

"السلام علیک یا امیر المومنین! و رحمۃ اللہ برکاتہ۔"

امیر نے سلام کا جواب دیا اور تعریضاً اس بات کا شکریہ ادا کیا کہ تو نے مجھے امیر المومنین کے

لفظ سے یاد کیا۔ اُم الخیر نے کہا "اے امیرالمومنین! لکل اجل کتاب یعنی ہر چیز کی مدت معین ہے"۔

امیر نے کہا "سچ ہے"۔ پھر اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے پوچھا کہ عمار یاسرؓ کے قتل کے وقت تُو نے کیا خطبہ پڑھا تھا؟ کہا "نہ میں نے اس کو پہلے سے بنایا تھا اور نہ اس موقع کے بعد کسی کو سنایا۔ یہی چند جملے تھے جو صدمے کے سبب ٹپک پڑے تھے، لیکن اگر اس کے سوا کوئی اور کلام تو سننا چاہے تو میں سناؤں"۔ امیر یہ سن کر مصاحبوں کی طرف ملتفت ہوا اور پوچھا: "تم میں سے کسی کو اس کا وہ کلام یاد ہے؟ ایک نے ان میں سے کہا "اے امیرالمومنین! مجھ کو کچھ کچھ اس میں سے یاد ہے"۔ اور اُس نے اُس بلیغ خطبے کے چند فقرے امیر کے سامنے پڑھے، جن میں لوگوں کو علی مرتضیٰؓ کے فضائل و مناقب کا ذکر کر کے ان کا ساتھ دینے اور اہلِ شام سے لڑنے کی ترغیب نہایت پُرزور الفاظ میں دی گئی تھی۔ امیر نے ان فقروں کو سن کر ام الخیر سے کہا "ظاہر ہے اُس کلام سے تیرا مطلب میرے قتل کے سوا اور کچھ نہ تھا، پس اگر میں تجھ کو قتل کرا دوں تو اس میں کوئی حرج نہیں معلوم ہوتا"۔

ام الخیر نے کہا "واللہ مجھ کو ہرگز شاق نہیں کہ میرا قتل اس شخص کے ہاتھ سے ظہور میں آئے جس کی شقاوت سے میری سعادت متصوّر ہے"۔

امیر نے کہا "اے فضول گو! عثمان بن عفانؓ کے باب میں تو کیا کہتی ہے؟"

ام الخیر نے کہا "لوگوں نے جب اس کو خلیفہ کیا تو اس سے راضی تھے اور جب اس کو قتل کیا اُس سے ناراض تھے"۔

امیر نے کہا "اے ام الخیر! مدح ایسی ہی ہوتی ہے؟"

وہ بولی "خدا گواہ ہے اور اس کی گواہی کافی ہے۔ میرا مطلب اس سے عثمانؓ کی تنقیص نہیں ہے، بلکہ وہ سابقین اولین میں سے تھا اور بیشک آخرت میں اس کا درجہ بلند ہوگا"۔

امیر نے کہا "اچھا زبیرؓ کے باب میں تو کیا کہتی ہے؟" کہا "بھلا میں رسول اللہ صلعم کی پھوپی کے بیٹے اور اُن کے حواری کے حق میں کیا کہہ سکتی ہوں جن کی نسبت خود رسول مقبولؐ نے جنتی ہونے کی شہادت دی ہے"۔ اس کے بعد ام الخیر نے کہا "اے معاویہؓ تو قریش میں حلم اور اس مشہور ہے۔ میں تجھ کو خدا کی قسم دیتی ہوں کہ مجھے ان سوالات سے معذور رکھ اور ان کے سوا جو تیرا

تیرا جی چاہے سو پوچھ"

امیر نے سوالات موقوف کئے اور اُس کو معقول رخصتانہ دیکر عزت و احترام کے ساتھ رخصت کیا۔

مذکورہ بالا حکایتوں سے قطع نظر اس کے قرون اولی کی عورتوں کی راستبازی اور حق گوئی کا حقہ ثابت ہوتی ہے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ:

وہ جنگ کے معرکوں میں شریک ہوتی تھیں۔

اپنے جتھوں کا ساتھ دیتی تھیں۔

فریق مخالف کے برخلاف لوگوں کو اُکسانے کے لیے نہایت فصیح و بلیغ اور پُرزور خطبے انشاء کر کے پڑھتی تھیں۔

خلیفہ کے دربار میں بے حجابانہ حاضر ہوتی تھیں۔

بھرے مجمع میں آزادانہ اور بے باکانہ گفتگو کرتی تھیں۔

سب سے بڑھ کر ان حکایتوں سے امیر معاویہؓ کے تحمل اور فراخ حوصلگی کا ثبوت ملتا ہے کہ باوجود ہر طرح کے اقتدار و اختیار کے رعیت کے ضعیف ترین فرقے کی ایسی تلخ اور ناگوار باتیں برداشت کی جاتی تھیں اور اعیان دربار کے سامنے اُن کو اپنے اوپر اعتراض اور خردہ گیری کرنے کا موقع دیا جاتا تھا۔ امیر کا یہ قول مشہور ہے کہ النساء یغلبن الکرام و یغلبھن اللئام یعنی عورتیں شریفوں پر غالب اور کمینوں سے مغلوب رہتی ہیں" اور اس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ امیر کا اغماض اور تحمل شاید عورتوں کے ساتھ مخصوص ہو لیکن معلوم ہوتا ہے کہ امیر کا یہ برتاؤ عورتوں اور مردوں کے ساتھ برابر تھا چنانچہ ابو عمر نے ہمدان کے ایک شخص سے روایت کی ہے کہ معاویہؓ نے ضرار اسدی سے کہا کہ "میرے سامنے علیؓ کے کچھ اوصاف بیان کر" اُس نے جناب مرتضویؓ کے عدل، انصاف، علم و حکمت، دنیا سے نفرت، شب بیداری، ذکر و فکر، قناعت، مسکینوں پر شفقت، اہلِ دین کی تعظیم، قوی اور کمزور کے ساتھ یکساں برتاؤ اور اسی قسم کی بہت سی خصلتیں بیان کیں۔" معاویہؓ پر اس ذکر سے رقت طاری ہو گئی اور کہا "ابو الحسن پر خدا کی رحمت

ہو، واللہ وہ ایسا ہی تھا"۔

پھر ضرار سے پوچھا کہ تجھ پر اُس کے غم میں کیا گذرتی ہے؟ ضرار نے کہا "جو اس عورت پر گزرتی ہے جس کا اکلوتا بیٹا اس کی گود میں ذبح کیا گیا ہو"۔

ظاہر ہے کہ امیر معاویہؓ کا جو معاملہ جناب مرتضوی کے ساتھ رہا تھا اس کو ہر شخص خوب جانتا تھا۔ باوجود اس کے لوگ آپ کے فضائل و مناقب بے دھڑک امیر کے سامنے بیان کرتے تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس وقت اسلام کی تعلیم کا اثر جو اُس نے عرب عرباء کی آزاد طبیعتوں پر کیا تھا زائل نہیں ہوا تھا اور وہ باوجود ہر طرح کی قدرت اور کمنت کے حق کی تلخ اور ناگوار باتیں جو ان کی طبیعت اور مرضی کے خلاف کہی جاتی تھیں گوارا کرتے تھے۔ اگر چہ خلافت راشدہ کے تیس برس (جن کی رسول مقبولؐ نے پیشین گوئی فرمائی تھی) گزر چکے تھے اور ملک عضوض کا دور دورہ شروع ہو گیا تھا۔ مگر آزادی جو عرب کی خاک کا اصلی جوہر تھا اور اسلام کی تعلیم نے اس کو جلا دی تھی، اس میں ابھی تک کچھ فرق نہیں آیا تھا۔

مذکورہ بالا حکایتوں کا مضمون ہم نے بطور خلاصے کے بیان کیا ہے خصوصاً اُن خطبوں میں سے جو صفین میں امیر معاویہؓ کے برخلاف پڑھے گئے۔ صرف معدودے چند جملوں کا ترجمہ کیا گیا اور بعض حکایتیں جو صاحب عقد الفرید نے اسی باب میں عورتوں کے متعلق نقل کی ہیں بالکل چھوڑ دی گئی ہیں۔ ورنہ نتائج مذکور الصدر کے سوا اور بھی بہت سے نتیجے ان حکایتوں سے استخراج ہو سکتے تھے، مگر بخوف تطویل صرف اسی خلاصے پر اکتفا کیا گیا۔

۴۲۔ ترجمۂ حالیؔ

"اپنی یہ مختصر سوانح عمری مولانا نے ۱۹۰۱ء میں نواب عماد الملک بہادر کی فرمائش پر لکھ کر حیدرآباد بھیجی تھی جن سے اُن کے کسی دوست نے لندن سے مولانا کے حالات منگائے تھے۔ مولانا نے ان حالات کی ایک نقل اپنے قلم سے اپنے مستعملہ "دیوان حالی" کے ابتدائی اوراق پر لکھی تھی وہیں سے یہ نقل لے کر یہاں درج کی جاتی ہے۔"

ولادت

میری ولادت تقریباً ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء میں بمقام قصبہ پانی پت جو شاہجہاں آباد (دہلی) سے جانب شمال ۵۳ میل کے فاصلے پر ایک قدیم بستی ہے، واقع ہوئی۔

سلسلۂ نسب

اس قصبے میں کچھ کم سات سو برس سے قوم انصار کی ایک شاخ جس سے راقم الحروف کو تعلق ہے چلی آتی ہے۔ ساتویں صدی ہجری اور تیرھویں صدی عیسوی میں جب کہ غیاث الدین بلبن[1] تخت دہلی پر متمکن تھا شیخ الاسلام خواجہ عبد اللہ انصاری[2] معروف بہ پیر ہرات کی اولاد

---

[1] غیاث الدین بلبن۔ خاندان غلامان کا نواں بادشاہ اور بڑا منتظم، لائق، منصف، متقی اور پرہیزگار انسان تھا۔ شمس الدین التمش نے بطور ایک غلام کے خریدا تھا۔ پھر اپنی بیٹی اس سے بیاہ دی تقدیر نے ۶۶۴ھ (۱۲۶۶ء) میں دہلی کے تخت پر بٹھا دیا۔ نہایت کامیابی اور امن وامان کے ساتھ ۲۰ سال ہندوستان پر حکومت کرنے کے بعد ۸۰ برس کی عمر میں ۶۸۶ھ (۱۲۸۷ء) میں انتقال کیا۔

[2] خواجہ عبد اللہ انصاری۔ ہرات کے نہایت مقدس اور صاحب علم وفضل بزرگ تھے یہ بہت سی کتابوں کے مصنف اور بڑے صوفی منش انسان تھے۔ آل سلجوق کے زمانے میں ۹ شعبان ۳۹۶ھ (۱۰۰۶ء) کو پیدا ہوئے ۸۵ برس کی عمر (۴۸۱ھ / ۱۰۸۸ء) میں اس دار فانی سے رحلت فرمائی۔

ہیں سے ایک بزرگ خواجہ ملک[۱] علی نام جو علوم متعارفہ میں اپنے عام معاصرین سے ممتاز تھے۔ ہرات سے ہندوستان میں وارد ہوئے۔ جن کا سلسلۂ نسب ۲۶ واسطے سے حضرت ابوایوب[۲] انصاری تک اور ۱۸ واسطے سے شیخ الاسلام تک

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ۱۰ واسطے سے ملک محمود شاہ انجو ملقب بہ آق خواجہ تک جو غزنوی دور میں فارس و کرمان و عراقِ عجم کا فرمانروا تھا پہنچا تھا۔

آباواجداد کا ہندوستان آنا

چوں کہ غیاث الدین بلبن اس بات میں نہایت مشہور تھا کہ وہ قدیم اشراف خاندانوں کی بہت عزت کرتا ہے اور اس کا بیٹا سلطان[۳] محمد علماء و شعراء اور دیگر اہلِ کمال کا حد سے زیادہ قدر دان تھا، اس لیے اکثر اہلِ علم اور عالی خاندان لوگ ایران و ترکستان سے ہندوستان کا قصد کرتے تھے۔ اسی شہرت نے خواجہ ملک کو سفر ہندوستان پر آمادہ کیا تھا۔

چناں چہ سلطان غیاث الدین چند عمدہ اور سیرحاصل دیہات پرگنہ پانی پت میں اور متصل بہ آراضی سواد قصبہ پانی پت میں بطور مدد معاش کے

---

۱ خواجہ ملک علی۔ یہی بزرگ تھے جو انصاریوں میں سب سے پہلے پانی پت میں وارد ہوئے۔ ۷۱۶ھ ان کا سال وفات ہے۔

۲ حضرت ابوایوب انصاریؓ۔ آنحضرتؐ کے جلیل القدر صحابی ہیں ۴۷ھ (۶۶۸ء) میں قسطنطنیہ کی دیواروں کے نیچے انتقال فرمایا، جہاں آپ جہاد کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ آپ کا مزار آج بھی زیارت گاہ عوام ہے۔

۳ محمد سلطان غیاث الدین کا بیٹا اور ملتان اور سندھ کا صوبیدار تھا نہایت علم دوست اور فاضل شخص تھا۔ اس کا دربار ہمیشہ علماء و فضلا سے بھرا رہتا تھا۔ شیخ سعدی کو ایران سے طلب کیا مگر وہ آنہ سکے، البتہ انھوں نے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی گلستان کا ایک نسخہ ہدیتہً بھیجا افسوس کہ یہ شاہزادہ مغلوں سے ایک لڑائی کے دوران میں ۶۸۳ھ میں مارا گیا۔

اور بہت سی زمین اندرونِ آبادی ۔ ۔ ۔ قصبہ پانی پت واسطے سکونت کے اُن کو عنایت کی اور منصب قضا و صدارت و تشخیص نرخ بازار اور تولیت مزاراتِ ائمہ جو سواد پانی پت میں واقع ہیں اور خطبات عیدین ان کے متعلق کر دی۔

پانی پت میں جو اب تک ایک محلہ انصاریوں کا مشہور ہے وہ انھیں کی اولاد سے منسوب ہے۔

میں باپ کی طرف سے اسی شاخ سے علاقہ رکھتا ہوں، اور میری والدہ سادات کے ایک معزز گھرانے کی جو یہاں "سادات شہدا پور" کے نام سے مشہور ہیں، بیٹی تھیں۔

خاندان کا ذریعۂ معاش

اگرچہ خواجہ ملک علی کی اولاد میں بہت سے لوگوں نے سلطنت مغلیہ کے عہد میں، اور پھر شاہانِ اودھ کی سرکار میں نہایت درجے کا امتیاز حاصل کیا، مگر زیادہ تر یہ لوگ اسی ملکِ معاش پر قانع رہے جو سلاطینِ اسلام کی طرف سے وقتاً فوقتاً ان کو عطا ہوتی رہی۔

میرے آبا و اجداد نے جہاں تک معلوم ہے ظاہرا کوئی خدمت دلّی یا لکھنؤ میں اختیار نہیں کی۔ سب سے پہلے میرے باپ نے سرکار انگریزی کی نوکر سررشتہ پرمٹ میں اختیار کی تھی۔

والد کا انتقال اور بھائی کی سرپرستی

میری ولادت کے بعد میری والدہ کا دماغ مختل ہو گیا تھا اور میرے والد نے (۴۰ برس کی عمر میں) سنِ کہولت میں انتقال کیا جب کہ میں نو برس کا تھا، اس لیے میں نے ہوش سنبھال کر اپنا سرپرست بھائی بہنوں کے سوا کسی کو نہیں پایا۔

تعلیم

انھوں نے اول مجھ کو قرآن حفظ کرایا۔ اس کے بعد اگرچہ تعلیم کا شوق خود بخود میرے دل میں حد سے زیادہ تھا مگر باقاعدہ اور

مسلسل تعلیم کا کبھی موقع نہیں ملا۔

ایک بزرگ سید جعفر علی مرحوم جو میر ممنون دہلوی کے بھتیجے تھے اور نیز داماد بھی تھے اور بوجہ تعلق زناشوئی کے پانی پت میں مقیم تھے اور فارسی لٹریچر، تاریخ اور طب میں ید طولیٰ رکھتے تھے، ان سے دو چار فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، اور ان کی صحبت میں فارسی لٹریچر سے ایک نوع کی مناسبت پیدا ہو گئی۔

پھر عربی کا شوق پیدا ہوا۔ انہیں دنوں میں مولوی حاجی ابراہیم حسین انصاری مرحوم لکھنؤ سے امامت کی سند لے کر آئے تھے ان سے صرف و نحو پڑھی۔

شادی

چند روز بعد بھائی اور بہن نے جن کو میں بمنزلہ والدین کے سمجھتا تھا تاہل پر مجبور کیا۔ اس وقت میری عمر سترہ برس کی تھی، اور زیادہ تر بھائی کی نوکری پر سارے گھر کا گزارہ تھا کہ یہ جوا میرے کندھے پر رکھا گیا۔

تعلیم کا شوق دہلی لے گیا

اب بظاہر تعلیم کے دروازے چاروں طرف سے مسدود ہو گئے۔ سب کی یہ خواہش تھی کہ میں نوکری تلاش کروں۔ مگر تعلیم کا شوق غالب تھا، اور بیوی کا میکا آسودہ حال۔ میں گھر والوں سے روپوشی ہو کر دلی چلا گیا اور قریب ڈیڑھ برس کے وہاں رہ کر کچھ صرف و نحو اور کچھ ابتدائی کتابیں منطق کی مولوی نوازش علی مرحوم سے جو وہاں مشہور واعظ اور مدرس تھے، پڑھیں۔

انگریزی نہ پڑھنے کے وجوہات

اگرچہ اس وقت قدیم دہلی کالج خوب رونق پر تھا، مگر جس سوسائٹی میں، میں نے نشو و نما پائی تھی، وہاں علم صرف عربی اور فارسی زبان میں منحصر سمجھا جاتا تھا۔ انگریزی تعلیم کا خاص کر پانی پت میں اول تو کہیں ذکر ہی سننے میں نہیں آتا تھا۔ اور اگر اس کی نسبت لوگوں کا کچھ خیال تھا تو صرف اس قدر کہ وہ سرکاری نوکری کا ایک ذریعہ ہے، نہ یہ کہ اس سے کوئی علم حاصل ہوتا ہے

بلکہ برخلاف اس کے انگریزی مدرسوں کو ہمارے علما، مجہلہ[1] کہتے تھے۔

دلّی پہنچ کر جس مدرسے ..... میں مجھ کو شب و روز رہنا پڑا وہاں سب مدرس اور طلبہ کالج کے تعلیم یافتہ لوگوں کو محض جاہل سمجھتے تھے۔ غرض کبھی کبھی بھول کر بھی انگریزی تعلیم کا خیال دل میں نہ گزرتا تھا۔

ڈیڑھ برس تک دلّی میں رہنا ہوا، اس عرصے میں کبھی کالج کو جا کر آنکھ سے دیکھا تک نہیں، اور نہ ان لوگوں سے (اس زمانے میں) کبھی ملنے کا اتفاق ہوا جو اُس وقت کالج میں تعلیم پاتے تھے۔ جیسے مولوی ذکاء اللہ، مولوی نذیر احمد، مولوی محمد حسین آزاد وغیرہ وغیرہ۔

دلّی سے جبری واپسی

میں نے دلّی میں شرح سلّم، ملا حسن اور میبذی پڑھنی شروع کی تھی کہ سب عزیزوں اور بزرگوں کے جبر سے چار و ناچار مجھ کو دلّی چھوڑنا، اور پانی پت واپس آنا پڑا۔ یہ ذکر ۱۸۵۵ء کا ہے۔ دلّی سے آکر برس ڈیڑھ برس تک پانی پت سے کہیں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ یہاں بطور خود اکثر بے پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا۔

ملازمت

۱۸۵۶ء میں مجھے ضلع حصار میں ایک قلیل تنخواہ کی اسامی صاحب کلکٹر کے دفتر میں مل گئی۔

۱۸۵۷ء کا غدر اور ملازمت کا چھوٹ جانا

۱۸۵۷ء میں جب کہ سپاہ باغی کا فتنہ ہندوستان میں برپا ہوا اور حصار میں بھی اکثر سخت واقعات ظہور میں آئے اور سرکاری عمل داری اٹھ گئی تو میں وہاں سے پانی پت چلا آیا اور قریب چار برس کے پانی پت میں بیکاری کی حالت میں گزرے۔

دوبارہ تعلیم کا آغاز

اس عرصے میں پانی پت کے مشہور فضلا

---

[1] یعنی جہالت کی جگہ

مولوی عبدالرحمٰن۔ مولوی محب اللہ اور مولوی قلندر علی مرحومان سے بغیر کسی ترتیب اور نظام کے کبھی منطق یا فلسفہ کبھی حدیث کبھی تفسیر پڑھتا رہا اور جب ان صاحبوں میں سے کوئی پانی پت میں نہ ہوتا تھا تو خود بغیر پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا اور خاص کر علم ادب کی کتابیں شروح اور لغات کی مدد سے اکثر دیکھا کرتا تھا، اور کبھی کبھی عربی نظم و نثر بھی بغیر کسی اصلاح یا مشورے کے لکھتا تھا مگر اس پر اطمینان نہ ہوتا تھا۔ میری عربی اور فارسی کا منتہا صرف اسی قدر ہے جس قدر اوپر ذکر کیا گیا۔

مرزا غالب کی خدمت میں باریابی

جس زمانے میں میرا دلی جانا ہوا تھا مرزا اسد اللہ خاں غالب مرحوم کی خدمت میں اکثر جانے کا اتفاق ہوتا تھا، اور اکثر اُن کے اُردو اور فارسی دیوان کے اشعار جو سمجھ میں نہ آتے تھے اُن کے معنی اُن سے پوچھا کرتا تھا، اور چند فارسی قصیدے اُنھوں نے اپنے دیوان میں سے مجھے پڑھائے بھی تھے۔

اُن کی عادت تھی کہ وہ اپنے ملنے والوں کو اکثر فکر شعر کرنے سے منع کیا کرتے تھے، مگر میں نے جو ایک آدھ غزل اُردو یا فارسی کی لکھ کر ان کو دکھائی تو انھوں نے مجھ سے یہ کہا کہ:

"اگرچہ میں کسی کو فکر شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا۔
لیکن تمھاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر
نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے۔"

مگر اس زمانے میں ایک دو غزل سے زیادہ دلی میں شعر لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

نواب مصطفٰے خاں شیفتہ سے تعلق

غدر کے بعد جب کئی برس پانی پت میں بے کاری کی حالت میں گزر گئے تو فکر معاش نے گھر سے نکلنے پر مجبور کیا۔ حسن اتفاق سے نواب مصطفٰے خاں مرحوم[۱] رئیس دہلی و تعلقہ دار جہانگیر آباد، ضلع بلند شہر سے جو فارسی میں حسرتی اور اُردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے اور شاعری کا اعلیٰ درجے کا مذاق رکھتے تھے شناسائی ہوگئی اور آٹھ سات برس تک بطور مصاحبت اُن کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا۔

نواب صاحب جس درجے کے فارسی اور اُردو زبان کے شاعر تھے اُس کی بہ نسبت ان کا مذاقِ شاعری بمراتب بلند تر اور اعلیٰ تر .. واقع ہوا تھا۔ انھوں نے ابتدا میں اپنا فارسی اور اُردو کلام مومن[۲] خاں کو دکھایا تھا مگر ان کے مرنے کے بعد وہ مرزا غالب سے مشورہ سخن کرنے لگے تھے۔ میرے وہاں جانے سے اُن کا پرانا شعر و سخن کا شوق جو مدت سے افسردہ ہو رہا تھا تازہ ہوگیا اور اُن کی صحبت میں میرا طبعی میلان جو اب تک مکروہات کے سبب اچھی طرح ظاہر نہ ہونے پایا تھا چمک اُٹھا۔ اسی زمانے میں اُردو اور فارسی کی اکثر غزلیں نواب صاحب مرحوم کے ساتھ لکھنے کا اتفاق ہوا۔ انھیں کے ساتھ میں بھی جہانگیر آباد سے اپنا کلام مرزا غالب کے پاس بھیجتا تھا۔ مگر در حقیقت مرزا کے مشورے و اصلاح

۱ے شیفتہ بہت متین، سنجیدہ اور مہذب بزرگ تھے۔ ۱۸۰۶ء بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ عربی و فارسی کے عالم اور متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ حکیم مومن خاں مومنؔ سے فن شعر میں شاگرد تھے۔ ان کا تذکرہ شعرائے اُردو "گلشن بے خار" بہت مشہور ہے ۱۸۶۹ء میں انتقال کیا۔

۲ے حکیم مومن خاں مومنؔ کشمیری الاصل اور خاندانی طبیب تھے۔ دہلی میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی۔ پچھلے دور کے نہایت مشہور شاعروں میں شمار ہوتے ہیں وہ ھ (۱۸۰۰ء) میں پیدا اور ۱۲۶۹ھ (۱۸۵۲ء) میں اتفاقیہ کوٹھے سے گر کر مر گئے۔ صرف ۵۲ سال کی عمر پائی۔

سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا جو نواب مرحوم کی صحبت سے ہوا۔ وہ مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے، اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی اور سچی باتوں کو محض حسنِ بیان سے دلفریب بنانا، اسی کو منتہائے کمالِ شاعری سمجھتے تھے۔ چھچھورے اور بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب دونوں متنفر تھے۔

نواب شیفتہ کے مذاق کا اندازہ اس ایک واقعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ ایک روز انیس کے مرثیہ کا ذکر ہو رہا تھا، انھوں نے انیس کے مرثیے کا یہ پہلا مصرعہ پڑھا ع

آج شبّیر پہ کیا عالمِ تنہائی ہے

اور کہا کہ انیسؔ نے ناحق مرثیہ لکھا، یہی ایک مصرعہ بجائے خود ایک مرثیہ کے برابر تھا۔

اُن کے خیالات کا اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا اور رفتہ رفتہ ایک قسم کا مذاق پیدا ہو گیا۔

گورنمنٹ بک ڈپو کی ملازمت

نواب شیفتہ کی وفات کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو (لاہور) میں ایک اسامی مجھ کو مل گئی جس میں مجھے یہ کام کرنا پڑتا تھا کہ جو ترجمے انگریزی سے اُردو میں ہوتے تھے اُن کی اُردو عبارت درست کرنے کو ملتی تھی۔ تقریباً چار برس میں نے یہ کام لاہور میں رہ کر کیا۔ اس سے انگریزی لٹریچر کے ساتھ فی الجملہ مناسبت پیدا ہو گئی اور نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی اور خاص کر عام فارسی لٹریچر

لہ انیس۔ میر حسن دہلوی کے پوتے۔ زبردست شاعر اور اُردو میں مرثیہ گوئی کی ایک خاص طرز کے موجد ہیں۔ صفائی کلام۔ خوبی بیان۔ لطف محاورہ، اور سوز و گداز ان کے کلام کی خاص خصوصیات ہیں۔ ۲۹ شوال ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء کو ۷۲ سال کی عمر میں لکھنؤ میں انتقال کیا۔

کی وقعت دل سے کم ہونے لگی۔

لاہور میں ایک نئی قسم کے مشاعرے کا انعقاد

لاہور ہی میں کرنیل ہالرائڈ ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب کے ایماء سے مولوی محمد حسین[1] آزاد نے اپنے پرانے ارادے کو پورا کیا یعنی ۱۸۷۴ء میں ایک مشاعرہ کی بنیاد ڈالی جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نیا تھا اور جس میں بجائے مصرع طرح کے کسی مضمون کا عنوان شاعروں کو دیا جاتا تھا کہ اس مضمون پر اپنے خیالات جس طرح چاہیں نظم میں ظاہر کریں۔

میں نے بھی اسی زمانے میں چار مثنویاں ایک —— برسات پر دوسری امید پر تیسری انصاف پر اور چوتھی حب وطن پر لکھیں۔

اینگلو عربک اسکول دہلی کی مدرسی مسدس اور بعض دیگر نظموں کی تصنیف

اس کے بعد لاہور سے دہلی میں اینگلو عربک اسکول کی مدرسی پر بدل آیا۔ یہاں آکر میں نے ایک آدھ نظم بطور خود اسی طرز کی جس کی تحریک لاہور میں ہوئی تھی لکھی۔ پھر سرسید احمد خاں مرحوم نے ترغیب دلائی کہ مسلمانوں کی موجودہ پستی و تنزل کی حالت اگر نظم میں بیان کی جائے تو مفید ہوگی۔

چناں چہ میں نے اول "مسدس مدوجزر اسلام" اور اس کے اور نظمیں جو چھپ چھپ کر بار بار شائع ہو چکی ہیں لکھیں۔

---

[1] شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد۔ دہلی کے رہنے والے مولوی باقر علی کے بیٹے اور محمد ابراہیم ذوق کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ بہت سی ادبی اور تاریخی کتابوں کے مصنف اور زبردست انشاء پرداز تھے۔ افسوس ہے کہ آخر عمر میں مجنوں ہو گئے تھے اور اسی حالت میں ۲۰ سال مبتلا رہنے کے بعد ۲۲۔ جنوری ۱۹۱۰ء کو لاہور میں انتقال فرمایا۔

تریاق مسموم کا لکھنا

نظم کے سوا میں نے نثر اُردو میں بھی چند کتابیں لکھی ہیں۔

سب سے پہلے غالباً ۱۸۶۷ء میں ایک کتاب "تریاقِ مسموم" ایک نیو ٹرسپچن کی کتاب کے جواب میں جو میرا ہم وطن تھا، اور مسلمان سے عیسائی ہو گیا تھا، لکھی تھی جس کو اسی زمانے میں لوگوں نے میگزینوں میں شائع کر دیا تھا۔

علم طبقات الارض پر ایک کتاب کا ترجمہ

اس کے بعد لاہور میں ایک عربی کتاب کا جو جیولوجی میں تھی اور جو فرنچ سے عربی میں کسی مصری فاضل نے ترجمہ کی تھی، اُردو میں ترجمہ کیا اور اس کا کاپی رائٹ (حق تصنیف) بغیر کسی معاوضے کے پنجاب یونی ورسٹی کو دے دیا۔ جہاں جب ڈاکٹر لائٹنر کے زمانے میں اس کو یونی ورسٹی نے چھاپ کر شائع کر دیا تھا۔ مگر اول تو وہ اصل کتاب پچاس ساٹھ برس پہلے کی لکھی ہوئی تھی، جبکہ جیولوجی (علم طبقات الارض) کا علم ابتدائی حالت میں تھا، دوسرے مجھ کو اس فن سے محض اجنبیت تھی، اس لیے اصل اور ترجمہ دونوں غلطیوں سے خالی نہ تھے۔

مجالس النساء کی تصنیف

لاہور ہی میں ایک کتاب عورتوں کی تعلیم کے لیے قصے کے پیرایہ میں موسوم بہ مجالس النساء لکھی تھی۔ جس پر گورنمنٹ ہالرائڈ نے ایک ایجوکیشنل دربار میں بمقام دہلی مجھے لارڈ نارتھ بروک[1] کے ہاتھ سے چار سو روپیہ کا انعام دلوایا تھا اور جو اودھ و پنجاب کے مدارس نسواں میں مدت تک جاری رہی اور شاید اب بھی کہیں کہیں جاری ہو۔

---

[1] لارڈ نارتھ بروک ہندوستان کا وائسرائے تھا جس نے ۱۸۷۲ء سے ۱۸۷۶ء تک یہاں حکومت کی ہے۔ اس کے عہد میں سب سے پہلے پرنس آف ویلز ۱۸۷۵ء میں ہندوستان کی سیاحت کے لیے آئے۔

حیات سعدی کا لکھنا پھر دلی میں سعدی شیرازی کی لائف اور ان کی نظم ونثر پر ریویو لکھ کر شائع کیا جس کا نام "حیات سعدی" ہے اور جس کے دس بارہ اڈیشن اب سے پہلے شائع ہو چکے ہیں۔

مقدمہ شعر وشاعری اور دیوان کا شائع کرنا پھر شاعری پر ایک مبسوط اِتے (مضمون) لکھ کر بطور مقدمے کے اپنے دیوان کے ساتھ شائع کیا۔

یادگار غالب کی تصنیف اس کے بعد مرزا غالب مرحوم کی لائف جس میں ان کی فارسی اور اردو نظم ونثر کا انتخاب بھی شامل ہے اور نیز ان کی شاعری پر ریویو بھی کیا گیا ہے 'یادگار غالب' کے نام سے لکھ کر شائع کی۔

حیات جاوید اب سر سید احمد خاں مرحوم کی لائف موسوم بہ 'حیات جاوید' جو تقریباً ہزار صفحے کی کتاب ہے لکھی، جو امید ہے کہ مارچ یا اپریل میں شائع ہو جائے گی۔

صرف ونحو کے متعلق چند کتابیں ان کے سوا اور بھی بعض کتابیں گریمر وغیرہ میں لکھی ہیں، جو چنداں ذکر کے قابل نہیں ہیں[1]۔

مختلف مضامین اس کے علاوہ تیس بتیس مضمون بھی مختلف عنوانوں پر مختلف اوقات میں لکھے جو تہذیب الاخلاق علی گڑھ

---

[1] فارسی گریمر میں مولانا نے ایک کتاب "اصول فارسی" کے نام سے لکھی تھی مگر اس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔

گزٹ اور دیگر اخبارات و رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔

فارسی نظم و نثر

نیز اردو کے علاوہ فارسی میں کسی قدر زیادہ اور عربی میں کم میری نظم و نثر موجود ہے جو ہنوز شائع نہیں ہوئی[۱]۔ جب سے ان دونوں زبانوں کا رواج ہندوستان میں کم ہونے لگا ہے اُس وقت سے ان کی طرف توجہ نہیں رہی۔

سب سے اخیر فارسی و اُردو نظم

میری سب سے اخیر فارسی نظم ترکیب بند ہے جو سرسید کی وفات پر میں نے ۱۸۹۸ء میں لکھا تھا[۲]۔ اور اُردو میں سب سے اخیر وہ نظم ہے جو حال میں ایمپرس وکٹوریہ کی وفات پر لکھی ہے اور علی گڑھ گزٹ میں شائع ہو چکی ہے[۳]۔

حیدرآباد سے وظیفہ کا تقرر اور ملازمت سے علیحدگی

۱۳۰۵ھ میں جب کہ میں اینگلو عربک اسکول دہلی میں مدرس تھا نواب سر آسمان جاہ بہادر مرحوم مدار المہام سرکار عالی نظام اثنائے سفر شملہ میں علی گڑھ محمڈن کالج کے ملاحظہ کے لیے سرسید احمد خاں مرحوم کی کوٹھی واقع علی گڑھ میں فروکش ہوئے تھے اور میں بھی اُس وقت گیا ہوا تھا۔ نواب صاحب ممدوح نے بصیغۂ امداد مصنفین ایک وظیفہ تعدادی پچھتر روپے ماہوار کا میرے لیے مقرر فرمایا اور ۱۳۰۹ھ میں جبکہ میں سرسید مرحوم کے ہمراہ بشمول دیگر ممبران ڈیپوٹیشن ٹرسٹیان محمڈن کالج علی گڑھ حیدرآباد گیا تھا، اس وظیفہ میں پچیس روپیہ ماہوار کا اضافہ کر کے سو روپیہ سکۂ حالی کا وظیفہ میرے لیے مقرر کر دیا جو اب تک مجھ کو ماہ بماہ سرکار عالی سے ملتا ہے اور اسی وقت سے میں نے اینگلو عربک اسکول دہلی کا تعلق قطع کر دیا ہے۔

---

[۱] عربی و فارسی نظم و نثر کا مجموعہ مولانا کی وفات سے چند ماہ پیشتر اگست ۱۹۱۴ء میں شائع ہو چکا تھا۔

[۲] سرسید کا یہ فارسی مرثیہ مولانا کی شائع کردہ کلیات نظم میں موجود ہے۔

[۳] یہ دل گداز اور پُر درد نظم "کلیات نظم حالی اُردو" میں موجود ہے۔

۲۵۔ ہماری معاشرت کی اصلاح کیونکر ہوسکتی ہے؟

(از رسالہ عصرِ جدید، میرٹھ، بابت اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۲۱ تا ۳۰۰)

ہماری معاشرت کی اصلاح کے ضروری ہونے پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے، جس کے بعد زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ اب صرف یہ دیکھنا ہے کہ قوم کی موجودہ حالت میں یہ اصلاح کیونکر ہوسکتی ہے؟

بے شک آج کل کے خیالات کے موافق اس قسم کی اصلاحوں کے لیے قومی انجمنیں قائم کرنا، ناول یا ڈرامے لکھنا عموماً مفید خیال کیا جاتا ہے، لیکن جب تک کچھ لوگ ان تدبیروں کے موافق عمل کرنے والے اور خود مثال بن کر اوروں کو ریس دلانے والے پیدا نہ ہوں، یہ سب تدبیریں سردست بے کار معلوم ہوتی ہیں۔ ان تدبیروں کا اثر جہاں تک دیکھا جاتا ہے زیادہ تر انھیں لوگوں تک محدود رہتا ہے جو خود انجمنیں قائم کرتے، اسپیچیں دیتے، مضامین لکھتے اور ناول وغیرہ تصنیف کرتے ہیں، ان کے سوا شاذ و نادر ہی کسی کے دل پر ان چیزوں کا اثر ہوتا ہے .... کیوں کہ انسان فطرتاً جیسا .... دوسرے کی مثال کی تقلید کرنے والا ہے، ایسا خالی نصیحتوں اور ہدایتوں پر، اگرچہ وہ کیسی ہی مدلل اور موجّہ ہو، عمل کرنے والا نہیں ہے۔

کچھ کم سات سو برس کا زمانہ گزرا جب کہ ایک افریقہ کے سائل نے حلب کے بازار میں بزازوں سے مخاطب ہوکر کہا تھا:۔

"اے خداوندانِ نعمت! اگر شمارا انصاف بودے و
مارا قناعت، رسم سوال از جہاں برخاستے۔"

فی الواقع بھیک مانگنے کے انسداد کا کوئی طریقہ اس سے بہتر نہیں ہو سکتا جو سات سو برس پہلے اس افریقی سائل نے بتایا تھا۔ مگر چوں کہ باوجود اس قدر طول طویل زمانہ گزرنے کے نہ دولت مندوں میں انصاف پیدا ہوا اور نہ سوال کرنے والوں میں قناعت۔ اس لیے سوال کی وہی مذموم رسم جو آج تک دنیا میں برابر چلی جاتی ہے۔ بس کیسی ہی سچی اور معقول بات کیوں نہ ہو جب تک اُس پر عمل کرنے والے پیدا نہ ہوں کچھ اثر نہیں رکھتی۔

آریہ سماج کے ممبروں کی تعداد جو روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ اس کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ اتنا کہتے نہیں جتنا کرتے ہیں۔ چناں چہ اسی وجہ سے وہ بہت سی ایسی قدیم رسموں کے ترک کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں جن پر مذہب کا گہرا رنگ چڑھا ہوا تھا اور جن کا موقوف ہونا بظاہر محال معلوم ہوتا تھا۔

مگر حق یہ ہے کہ آریہ سماج کو اپنی اصلاحات میں چند سہولتیں ایسی میسر ہیں جو مسلمان مصلحوں کو میسر نہیں ہیں اور جن کی بدولت یہ آریہ فرقہ کے لوگ جس اصلاح کا ارادہ کرتے ہیں اس میں آسانی سے کامیاب ہو جاتے ہیں۔

آریہ سماج درحقیقت ایک مذہبی سوسائٹی کا نام ہے جس کے تمام ممبر اپنے تئیں ایک جدید اصلاح شدہ قدیم مذہب کا پابند خیال کرتے ہیں اور آریہ سماج کی ہر ایک تجویز یا اصلاح کو مذہبی احکام میں شمار کرتے ہیں اور چونکہ ایک جدید مذہبی فرقہ بہ نسبت قدیم فرقوں کے زیادہ جوشیلا اور زیادہ جذبیلا ہوتا ہے اس لیے وہ نہایت جوش و خروش کے ساتھ ہر وقت سماج کے حکم کی تعمیل پر آمادہ اور کمربستہ رہتے ہیں۔

برخلاف مسلمان مصلحوں کے جو زیادہ تر نئے تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔ پرانے

خیالات کے مسلمانوں میں تو ان کی وقعت اس لیے نہیں کہ وہ تعلیم یافتہ یا دوسرے لفظوں میں نیچری کہلاتے ہیں۔ اور نئے خیالات والوں نے درحقیقت آج تک کوئی ایسی سوسائٹی قائم نہیں کی جس کو ایک مذہبی جماعت کہا جاسکے اور جس کے ممبروں میں اس قسم کا جوش پایا جائے جو مثلاً آریہ سماج کے ایک جدید مذہبی فرقہ میں ہونا چاہیے۔

یہی وجہ ہے کہ نہ تو مسلمان مصلحوں کا منتر پرانے خیالات والوں پر چلتا ہے اور نہ خود ان میں اس قدر جوش پایا جاتا ہے کہ وہ کم سے کم اپنے محدود دائرے ہی میں اپنی اصلاحیں جاری کر سکیں۔ اسی لیے ہمارے نزدیک (خاص کر پرانے خیالات کے مسلمانوں سے) اصلاح معاشرت کی امید اسی وقت کی جا سکتی ہے جب کہ ہمارے علماء اور واعظین اس ضروری کام کی طرف متوجہ ہوں۔

ہم ہمیشہ سُنتے ہیں کہ فلاں گاؤں یا قصبہ میں فلاں مولوی صاحب کا وعظ ہوا، اور وہاں کے باشندوں نے یک قلم بہت سی بُرائی اور بے ہودہ رسمیں ترک کر دیں۔ انہیں دنوں کیتھل ضلع کرنال کا یہ واقعہ سُنا گیا کہ ایک مولوی صاحب کے وعظ سے وہاں کے جُلاہوں اور تیلیوں نے تمام شادی اور غمی کی رسمیں ہمیشہ کے لیے اپنی اپنی قوم سے موقوف کر دیں۔

بات یہ ہے کہ مسلمانوں پر کوئی نصیحت یا ترغیب یا تحریص کارگر نہیں ہوتی جب تک کسی ثواب اُخروی کی امید یا عذاب اُخروی کا خوف اس میں شامل نہ ہو۔ اس لیے وہ کسی رسم یا رواج کی اصلاح پر رضامند نہیں ہو سکتے۔ جب تک کہ ہمارے علماء اور واعظین اپنے وعظ و ترغیب و ترہیب کو قوم کی اصلاح حال پر وقف نہ کر دیں اور وعظ و تذکیر کا سب سے زیادہ اہم اور ضروری مقصد قوم کی طرز معاشرت کی اصلاح نہ قرار دیں۔

آریہ سماج میں اکثر وہ قومیں داخل ہوتی ہیں جو تجارت پیشہ ہیں اور [illegible] طبیعت میں کفایت شعاری اور جزرسی پڑی ہوئی ہے۔ پس جس قدر رسمیں اصول کفایت

شعاری . . . . کے برخلاف
قوم میں جاری ہیں جس وقت سماج میں ان کی برائی بیان کی جاتی ہے فوراً اُن کے دل میں نشین ہو جاتی ہے اور مذہبی جوش کے ساتھ طبعی میلان شامل ہو کر تمام سماج کو ان رسموں کی بیخ کنی پر آمادہ کر دیتی ہے۔

اسی لیے ہمارے نزدیک محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اس سیکشن (صیغہ) کو جو کہ اس نے اصلاحِ معاشرت کے لیے قائم کیا ہے، اپنے کام کا آغاز اول مسلمان تاجروں سے کرنا چاہیے۔ مثلاً:

جو رسالہ یا اخبار اس مقصد کے لیے جاری کیا جائے اس کو جہاں تک ممکن ہو تاجروں میں زیادہ متداول کیا جائے۔

جو دورے ملک میں اس غرض سے کئے جائیں ان میں ان لوگوں کو خصوصیت کے ساتھ مخاطب کیا جائے۔

اسپیچوں میں زیادہ اُن رسموں کی برائی پر زیادہ زور دیا جائے جن کے ترک کرنے سے فضول خرچی اور اسراف کا انسداد مقصود ہے۔

ایک اور سہولت آریہ سماج کو ہندو عورتوں کی حالت کے سبب سے ہے جو مسلمان عورتوں کی حالت سے بالکل مختلف ہے، ہندو عورتوں میں اور خاص کر ان عورتوں میں جو آریہ سماج کے ممبروں سے تعلق رکھتی ہیں، زمانہ حال کی تعلیم زیادہ رواج پاتی جاتی ہے۔

برخلاف مسلمان عورتوں کے جن میں اگر کچھ تعلیم ہے بھی تو صرف قدیم طریقے کی مذہبی تعلیم ہے جس سے کسی قدر اُردو نوشت و خواند کی لیاقت یا نماز روزہ وغیرہ کے مسائل سے فی الجملہ واقفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ باقی جو خیالات متعلق بہ اصلاح رسوم و عادات ان کے رشتہ دار مردوں کے دماغ میں گشت کرتے رہتے ہیں، اُن سے وہ ویسی ہی بے خبر اور اجنبی ہوتی ہیں: جیسی محض جاہل عورتیں۔ اس لیے آریہ فرقہ کے لوگ جس رسم یا رواج کی اصلاح یا انسداد

کرنا چاہتے ہیں، بہت آسانی سے اس میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ پرانی رسموں کی محبت اور اُن کی پابندی عموماً مردوں کی نسبت عورتوں میں زیادہ ہوتی ہے۔ پس جس قدر عورتوں کی طرف سے مزاحمت کم ہوتی ہے اسی قدر مردوں کو اصلاح میں زیادہ آسانی ہوتی ہے۔

اس کے سوا جن قوموں میں پردہ کا رواج ہوتا ہے، ان میں عورتیں بیاہ شادی اور دیگر رسمیات پر زیادہ شیفتہ اور فریفتہ ہوتی ہیں۔ کیوں کہ ان کی تمام خوشیاں اور امنگیں اور چاؤ انھیں باتوں پر منحصر ہوتے ہیں کہ کنبے یا برادری کی عورتوں کو کسی حیلہ یا بہانے سے اپنے گھر بلا کر ایک دو روز ان کے ساتھ ملنے جُلنے، ہنسنے بولنے اور ان کی خاطر تواضع کرنے سے اپنا اور ان کا دل خوش کریں۔ اسی بنیاد پر ہمیشہ ایسی تقریبیں ڈھونڈتی رہتی ہیں، جن میں ان کو اپنی زیادہ ہم جنسوں سے ملنے کا موقع ملے۔ اگر بیاہ، شادی کا موقع نہیں ملتا تو چھٹی، مونڈن، ختنہ، بسم اللہ وغیرہ ہی کے بہانے سے اپنے دل کا ارمان نکال لیتی ہیں۔

جس قوم میں عورتوں کی تمام خوشیاں اور اُمنگیں انھیں باتوں پر منحصر ہوں، ان کے مرد کیوں کر اصلاح معاشرت میں کامیاب ہو سکتے ہیں؟ وہ بغیر اس کے کہ عورتوں پر جبر کریں اور اپنے گھر کو دوزخ کا نمونہ بنائیں، نہایت مشکل ہے کہ کسی قسم کی اصلاح کر سکیں۔

پس تا وقتیکہ عورتوں میں زمانۂ حال کی تعلیم رواج نہ پائے، اور ہمارے واعظین زبانی مجلسوں میں قرآن اور حدیث کی رو سے بیہودہ فضول رسموں کی بُرائیاں ان کے ذہن نشین نہ کریں، بہت ہی کم امید ہے کہ ہماری طرز معاشرت میں کوئی معتد بہ اصلاح ہو سکے۔

باوجود ان تمام مشکلات کے جو ہماری معاشرت کی اصلاح میں حائل ہیں ہمت اور استقلال سے ان سب پر غالب آنا ممکن ہے۔

سرسید مرحوم کو جو مشکلات انگریزی تعلیم کے پھیلانے میں درپیش تھیں۔ اصلاح معاشرت میں ویسی مشکلات درپیش نہیں ہیں۔ باوجود اس کے وہ اپنے استقلال سے تمام مشکلات پر غالب آئے اور ایسی نمایاں کامیابی اپنے مقاصد میں حاصل کی، جس کی اُمید نہ تھی۔ اسی طرح جو کوشش محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبۂ اصلاح تمدن نے شروع کی ہے اگر وہ صبر اور استقلال کے ساتھ برابر جاری رہی تو ضرور کبھی نہ کبھی سرسبز اور بارور ہوگی۔

۲۶۔ قومی جلسوں میں نظموں کی بھرمار

(قلمی مسودے سے نقل کیا گیا)

مذکورہ بالا عنوان سے ایک نوٹ ہفتہ وار پیسہ اخبار مورخہ ۱۶ را پریل ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا ہے جس کو پڑھ کر ہم کو اپنے وہ خیالات ظاہر کرنے کا موقع ملا ہے جو بہت دن سے اس معاملہ کے متعلق ہمارے دماغ میں گشت کر رہے تھے۔

اگر چہ یہ بات وثوق کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی کہ اس بدعت کی بنیاد ہمارے قومی جلسوں میں کب اور کس کی تحریک سے پڑی ؟ لیکن یہاں تک خیال کیا جاتا ہے اس کے محرک اور بانی خود نظمیں لکھنے والے اور اپنی نظمیں سنانے کی خود تقریبیں ڈھونڈنے والے معلوم ہوتے ہیں۔

چوں کہ ایک مدت سے قدیم طرز کی شاعری متروک ہوتی جاتی ہے اور اس کے مشاعرے بند ہوتے جاتے ہیں اس لیے ان لوگوں کے لیے جو قدیم طرز کی شاعری سے متنفر ہو گئے ہیں، سوائے قومی جلسوں کے اپنے کلام کی داد لینے کا کوئی اور موقع باقی نہیں رہا۔ بس ضرور ہے کہ وہ اپنا کمال ظاہر کرنے اور اس کی داد لینے کے لیے ایک دوسرا میدان تلاش کریں۔

ہم نہ قدیم شاعری کے مخالف ہیں اور نہ جدید شاعری کے مزاحم بلکہ ایک لحاظ سے جدید شاعری کے زیادہ مویّد ہیں لیکن ہماری رائے میں نئی شاعری کو ترقی دینے کا مقام بجائے قومی جلسوں کے نئی طرز کے مشاعروں کو جن کا نمونہ

ایک دفعہ پہلے لاہور میں قائم ہو چکا ہے[1] قرار دینا چاہیے۔

نئی طرز کی شاعری سے ہماری مراد یہ ہے کہ قدیم دستور کے موافق اس میں شعرا کو مصرع طرح نہ دیا جائے بلکہ کسی مضمون کا عنوان دے کر اس پر نظمیں لکھوانی چاہئیں اور اس بات کا اختیار کہ وہ کس بحر یا کس صنف میں ترتیب دی جائیں خود شعرا کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔

نئی طرز کی شاعری میں سوا اس کے کہ لوگوں نے کہیں کہیں مسلمانوں کے تنزل کا رونا رویا ہے اور مضامین کی طرف بہت ہی کم توجہ کی گئی ہے حالاں کہ نیچرل مضامین کا ایک وسیع و ناپیداکنار میدان موجود ہے جس میں ہمارے شعرا طبیعت کی جولانیاں اور فکر کی بلند پروازیاں دکھا سکتے ہیں۔

برخلاف اس کے قومی جلسوں میں اگر مقتضائے مقام کے موافق کسی مضمون پر نظم لکھی جائے تو سوا اس کے کہ وہی قومی ترقی یا تنزل کا راگ بار بار گایا جائے اور کیا لکھا جا سکتا ہے۔ اور اگر غیر متعلق مضامین پر نظمیں ترتیب دے کر ان جلسوں میں پڑھی جائیں تو ایسا کرنا صرف بے موقع و بے محل ہی نہ ہوگا بلکہ اہلِ جلسہ کے لیے جو درحقیقت شعر و سخن سننے کے لیے نہیں، بلکہ قومی مقاصد پر غور کرنے کے لیے آتے ہیں بارِ خاطر اور ناگوارِ طبع ہوگا۔

قومی مقاصد کے لیے جو جلسے آج کل ہندوستان میں ہوتے ہیں یہ درحقیقت اہلِ مغرب کی تقلید ہے۔ مگر ہم نے آج تک نہیں سنا کہ اہلِ مغرب کے قومی جلسوں میں سوائے اسپیچوں اور لکچروں کے شعرا کو بھی نظمیں پڑھنے کا موقع دیا جاتا ہو۔

---

[1] یہ اس مشاعرے کی طرف اشارہ ہے جس کی بنیاد کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب کے ایما پر شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد نے ۱۸۷۴ء میں لاہور میں ڈالی تھی۔
اس مشاعرے میں شاعروں کو بجائے مصرع طرح دینے کے ... کوئی مضمون دے دیا جاتا تھا کہ اس پر طبع آزمائی کریں۔

اہلِ مغرب کو جانے دو۔ ہمارے ملک میں جو قومیں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ اور باخبر ہیں، جیسے بنگالی، مرہٹی اور پارسی، ان کے ہاں بھی جہاں تک ہم کو معلوم ہے، ایسے جلسوں میں نظمیں نہیں پڑھی جاتیں، اور اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو تو آریہ سماج اور ستن دھرمیوں کے جلسوں میں بھی سوائے بھجن گانے کے جو مذہبی خیالات پر نہایت عمدہ اثر رکھتے ہیں، نظمیں پڑھے جانے کا دستور نہیں ہے۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ سر سید احمد خاں مرحوم نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں میں ایک حد تک نظمیں پڑھنا جائز رکھا تھا، مگر اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ نظمیں پڑھوانے کو کانفرنس کے حق میں درحقیقت کچھ مفید سمجھتے تھے، بلکہ اس زمانے میں جب کہ مسلمان ایسے جلسوں سے بالکل غیر مانوس اور ان کے نتائج سے بالکل بے خبر تھے، ضرور تھا کہ ایجوکیشنل کانفرنس میں کچھ ایسا سامان بھی مہیا کیا جائے جس سے مسلمان بالطبع مانوس ہوں اور کانفرنس میں نہایت شوق اور رغبت سے آکر شریک ہوں۔

لیکن اب مسلمانوں کی وہ حالت نہیں ہے۔ ان میں قومی کاموں کا مذاق پیدا ہو گیا ہے اور ان قومی جلسوں میں بلانے کے لیے اس بات کی ضرورت اب باقی نہیں رہی کہ ان کی دلگی کے لیے کانفرنس میں شاعروں کی چند جوڑیاں بلائی جائیں، اس لیے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں اب نظموں کا پڑھا جانا سوائے اس کے کہ اس کو مسلمانوں کی جہالت اور وحشت کی ایک یادگار قرار دیا جائے اور کچھ معنی نہیں رکھتا۔

ہاں بلا شبہ انجمن حمایتِ اسلام کی کانفرنس کی حالت سے بالکل مختلف ہے کیوں کہ کانفرنس میں اول تو اطراف ہندوستان سے صرف تعلیم یافتہ لوگ یا کم سے کم نئے خیالات اور جدید مذاق کے لوگ آتے ہیں جو قومی مقاصد پر بحث اور گفتگو کرنے کی بخوبی لیاقت رکھتے ہیں۔

دوسرے کانفرنس کے اجلاسوں کا اصل مقصد چندہ جمع کرنا نہیں ہے بلکہ جو مسائل مسلمانوں کی تعلیم وغیرہ کے متعلق تصفیہ طلب ہوتے ہیں ان کی نسبت جو بات اتفاق یا کثرت رائے سے قرار پائے اس سے مسلمان پبلک کو آگاہ کرنا اصل مقصد کانفرنس کا ہے۔

برخلاف اس کے :۔

انجمن حمایت اسلام میں جو سالانہ جلسہ ہوتا ہے اس کا اصل مقصد چندہ جمع کرنا ہے جس پر زیادہ تر انجمن کے قیام و دوام کا دارو مدار ہے۔

دوسرے اس جلسے میں تعلیم یافتہ لوگوں کے علاوہ کثرت سے ایسے لوگ بھی جمع ہوتے ہیں جن کی دلچسپی کے لیے کم و بیش نظموں کا پڑھا جانا سردست فائدے سے خالی نہیں معلوم ہوتا۔

پس ہمارے نزدیک رائے صواب یہ ہے کہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں تو نظموں کا سلسلہ بالکل منقطع ہو جانا چاہیے، لیکن انجمن حمایت اسلام میں ابھی اس سلسلہ کا بالکل منقطع ہونا خلاف مصلحت معلوم ہوتا ہے، لیکن جیسی کہ پیسہ اخبار کی رائے ہے وہاں بھی اس دستور کو بتدریج گھٹانا چاہیے اور بجائے نظموں کے مذہبی وعظوں اور مفید لیکچروں کو رفتہ رفتہ ترقی دینی چاہیے۔

موجودہ مذہبی مناظرے

(از رسالہ عصر جدید میرٹھ، جلد۵ نمبر۳ بابتہ مارچ ۱۹۰۷ء صفحہ ۸۰تا۸۹)

امام غزالی نے احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ مناظرے سے چند کمینہ خصلتیں خواص علماء میں پیدا ہو جاتی ہیں جیسے حسد، تکبر، کینہ، غیبت، خود پسندی، عیب جوئی، شماتت، نفاق، حق بات سے انکار اور باطل پر اصرار وغیرہ وغیرہ اور سفہا و جہلا میں اکثر گالی گلوج اور جوتی پیزار تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔

بلاشبہ جیسی کہ احیاء العلوم میں تشریح کی گئی ہے مناظرہ کرنے والوں میں یہ اور اسی قسم کے بہت سے رذائل مناظرے کے متعارف طریقے سے پیدا ہونے چاہئیں لیکن ہمارے نزدیک اگر مذہبی مناظرے کے مضر نتیجے جو اوپر بیان کئے گئے، صرف مناظرہ کرنے والوں ہی تک محدود نہیں رہتے اور ان کی آنچ دور دور نہ پہنچتی تو چنداں نقصان نہ تھا۔ مگر افسوس یہ ہے کہ یہ نتائج اصل مناظرے تک ہی محدود نہیں رہتے بلکہ وبائے عام کی طرح تمام قوم میں پھیل جاتے ہیں۔ قوم میں جدا جدا دھڑے اور فریق بندھ جاتے ہیں۔ ہر فریق دوسرے فریق کا دشمن ہو جاتا ہے اور اس طرح قوم میں پھوٹ اور نااتفاقی پھیل جاتی ہے۔

انسان کی طبیعت نزاع و خلاف اور جنگ و جدل پر مجبول ہوتی ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے وکان الانسان اکثر شیئً جدلا۔ اس کو فطرۃً سلوک اور ملاپ میں وہ لطف حاصل نہیں ہوتا جو خصومت اور جھگڑے میں حاصل ہوتا ہے پس جو اہل علم اس حضرت رساں سلسلہ کو چھیڑتے ہیں، وہ درحقیقت ابنائے جنس کے اس فطری مادہ کو مشتعل کرتے ہیں جو ذرا سی اشتعالک سے بھڑک اٹھتا ہے اور پھر کسی طرح بجھائے نہیں بجھتا۔

ہندوستان کے سنّی، شیعوں میں مذہبی مناظرے کی ابتدا کچھ شک نہیں کہ اہلِ سنت کی طرف سے ہوئی۔ تفضیل الشیخین۔ ازالۃ الخفا اور تحفہ اثنا عشریہ سے پہلے جہاں تک ہم کو معلوم ہے کوئی چھیڑ چھاڑ شیعوں کی جانب سے نہیں ہوئی۔

ان کتابوں کی اشاعت سے پہلے دونوں فریق ہر ایک موقع پر شیر و شکر رہتے تھے۔

سنّی مجالس عزا میں برابر شریک ہوتے تھے۔

سنّیوں کی لڑکیاں شیعہ لڑکوں سے، اور شیعوں کی لڑکیاں سنّی لڑکوں سے بیاہی جاتی تھیں۔

سنّی قاضی شیعوں کے نکاح پڑھتے تھے۔

دونوں فریق کے آدمی ایک مسجد میں نمازیں ادا کرتے تھے۔

مگر جب سے مذکورہ بالا کتابیں شائع ہوئیں، اور مذہبی مناظرے دونوں فرقوں میں شروع ہوئے تب سے وہ تمام میل جول جاتا رہا اور باہمی اتحاد و یگانگت نفرت اور مغائرت کے ساتھ بدل گئی۔

ہر چند کہ شیعوں نے ان کتابوں کی تردید کرتے وقت دل کے بخارات خوب دل کھول کر نکالے ہیں، مگر چوں کہ ابتدا اہلِ سنت کی طرف سے ہوئی ہے اس لیے شیعوں کو زیادہ الزام نہیں دیا جا سکتا۔

میں نے سنا ہے کہ مولانا عبد العلی بحر العلوم نے تحفہ کو دیکھ کر افسوس کیا تھا کہ اس کتاب سے یہاں کے شیعہ سنّیوں میں سخت تفرقہ پڑ جائے گا۔

اگر یہ خبر صحیح ہے تو افسوس ہے کہ مولانا کی پیشین گوئی پوری ہو گئی۔ دونوں فرقوں کا اختلاف منجر بہ عناد و دشمنی ہو گیا اور رفتہ رفتہ تمام روابط منقطع ہو گئے۔

ہر سال ہندوستان کے کسی نہ کسی شہر یا قصبہ میں دو چار ناگوار واقعات ایسے سننے میں آتے ہیں جن کا عدالت کو فیصلہ کرنا پڑتا ہے جن میں فریقین کا ہزار ہا روپیہ صرف ہو جاتا ہے اور دونوں کی تفضیح اپنے پرائے کی نظر میں جدا ہوتی ہے۔

(اس قسم کے تمام جھگڑوں ہیں) جب بنائے مخاصمت کی تفتیش کی جاتی ہے تو ہمیشہ اسی قسم کی کوئی بات نکلتی ہے کہ "محمد شاہ کی داڑھی بڑی ہے یا احمد شاہ کی؟"

جو معرکہ آج کل نہ صرف ہندوستان میں بلکہ تمام دنیا میں سائنس اور مذہب کے درمیان گرم ہو رہا ہے اس کے مقابلے میں اہلِ مذہب کے یہ باہمی مناظرے نزاع لفظی سے زیادہ کچھ وقعت نہیں رکھتے۔

مغربی تعلیم سے تو اب دنیا کو کسی طرح مفر نہیں، اور اس کا لازمی نتیجہ مستثنیٰ صورتوں کے سوا یا تو مذہب سے قطعی انکار کرنا اور دلوں میں اس کی وقعت کا باقی نہ رہنا یا کم سے کم اس میں شکوک و شبہات کا پیدا ہونا اور مذہبی یقین کا متزلزل ہو جانا ہے۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ اس وقت مذہب کا سب سے مقدم فرض یہ ہے کہ آپس کے جھگڑوں کو چھوڑ کر ان شکوک و شبہات کو دفع کرنے میں کوشش کریں جو مغربی تعلیم کے اثر سے پلیگ کے کیڑوں کی طرح ملک میں ترقی کر رہے ہیں۔

چنانچہ یورپ میں مسیحی مشنریوں نے اب اسلام اور دیگر مذاہب کی تردید کو چھوڑ کر ملحدوں اور دہریوں کی تردید پر اپنی ہمتیں متصور کر لی ہیں اور ان کی زیادہ تر تصنیفات اثبات واجب الوجود، توحید باری تعالیٰ، بقائے روح، حدوث مادہ کے اثبات اور جزا و سزا کے برحق ہونے پر شئی اور دیکھی جاتی ہیں۔

ہمارے نزدیک علمائے اسلام کو بھی اگر وہ اسلام اور مسلمانوں کے خیرخواہ ہیں یہی چاہیے کہ وہ آپس کے جھگڑوں کو خیرباد کہیں، اور مغربی تعلیم جو اندر ہی اندر مذہب کی جڑ کاٹ رہی ہے، اُس کے مضر نتائج سے قوم کے نوجوانوں کو بچائیں اور اپنے ہتھیاروں کو جو اب تک خانہ جنگی ہی میں صرف ہوتے رہے ہیں، ملحدوں اور دہریوں کے مقابلے میں استعمال کریں۔

آپس کے مذہبی مناظروں سے اگر اُن کا مقصد یہ ہے کہ جس مذہب کے خلاف وہ کتابیں یا رسالے لکھتے ہیں ان مذہب والوں کو اپنے مذہب کی حقیقت کا یقین دلائیں۔

سو اس مقصد میں تو ان کا کامیاب ہونا قریب ناممکن کے ہے۔ کیوں کہ جس طرح مذہب کا یقین عموماً دلیل و برہان سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ بچپن کے الف و عادات اور والدین کی عملی تعلیم و تلقین سے پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ کسی دلیل و برہان سے زائل بھی نہیں ہوتا۔ الّا ماشاء اللہ!

اور اگر ان کا مقصد صرف اپنے ہم مذہبوں کی تشفی اور اطمینان زیادہ کرنا اور ان کو مذہب پر ثابت قدم رکھنا ہے تو بلاشبہ اس میں کما حقہٗ کامیابی ہو سکتی ہے۔ یہ نہایت شریف و اعلیٰ مقصد ہے جو ہر مذہب کے علماء کا نصب العین رہنا چاہیے۔ مگر اس غرض کے لئے صرف اپنے مذہب کی حقیقت ثابت کرنا اور اس کو دلائل و براہین سے تقویت دینا کافی ہے۔ دوسرے مذہب کی توہین یا تنقیص کرنا اور فریق مقابل کا دل دکھانا ضرور نہیں ہے۔

اگرچہ مناظرہ اپنے اصلی معنوں کے لحاظ سے فی نفسہٖ نہایت مفید چیز ہے کیونکہ مناظرہ کے اصل معنی یہ ہیں کہ دو گروہ یا دو شخص کسی مسئلہ کو اس نظر سے دیکھیں کہ اس کا کون سا پہلو صحیح ہے اور کون سا غلط؟ اور جو نسا پہلو صحیح ثابت ہو اس کو دونوں فریق بلا تامل تسلیم کر لیں۔ لیکن ایسے مناظرے کی مثالیں بہت ہی کم سننے میں آئی ہیں۔ ہمیشہ یہی دیکھا جاتا ہے کہ ہر ایک فریق کا مقصد دوسرے فریق کو مغلوب کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا اور اسی وجہ سے مناظرہ کا نتیجہ ہمیشہ بُرا ہوتا ہے۔

آج کل ہندوستان میں جس قدر قحط اور وبا کے انسداد کی ضرورت ہے، اُس سے بہت زیادہ نااتفاقی کے انسداد کی ضرورت ہے۔ اس وقت ہر ایک قوم بمقابلہ دیگر قوموں کے اپنا وزن قائم رکھنے کے لیے اور تمام ہندوستان کی قومیں گورنمنٹ کی نظر میں اپنی عزت اور وقار قائم رکھنے کے لیے باہمی اتفاق و اتحاد کی محتاج ہیں۔

خصوصاً مسلمانوں کو بہ نسبت دیگر اقوام کے اتفاق کی زیادہ ضرورت ہے۔ کیونکہ ہندوستان میں آرین نسل کی جتنی قومیں آباد ہیں سب غلطی سے مسلمانوں کو ایک اجنبی اور بیگانہ قوم تصور کرتی ہیں۔ حالاں کہ وہ خود بھی بمقابلہ اصلی باشندوں کے

اس ملک میں ویسے ہی بے گانے ہیں جیسے کہ مسلمان۔

پس تاوقتیکہ یہ غلطی رفع نہ ہو اور آریہ قومیں مسلمانوں کو بھی دل سے اپنا وطنی بھائی نہ سمجھنے لگیں اس وقت تک مسلمان اس ملک میں بغیر اسلامی اخوت کے اپنا وزن قائم و برقرار نہیں رکھ سکتے۔

اور اس اخوت و اتحاد کا سب سے بڑا اور قوی مانع مذہبی مناظرہ یا مجادلہ ہے جو کتابوں، رسالوں اور اخباروں کے ذریعے سے [illegible] تعصب کی آگ بھڑکاتا رہتا ہے۔

اگرچہ مسلمانوں میں اور بھی بہت سے فرقے ایسے ہیں جن میں بحث و مباحثہ ہمیشہ جاری رہتا ہے مگر سب سے زیادہ مضر اور خطرناک اور تمام قوم میں نااتفاقی کی جڑ مضبوط کرنے والے وہ مناظرے ہیں جو سُنّی اور شیعوں میں اب تک ہوتے رہے ہیں۔

ان (مناظروں۔ مباحثوں اور مجادلوں) کی بدولت بعض اصحاب کی یہ رائے ہو گئی ہے کہ ہندو مسلمانوں میں تو اتحاد ممکن ہے مگر سُنّی و شیعہ میں اتحاد کا ہونا امکان سے خارج ہے۔

اگرچہ میں اس رائے کو صحیح نہیں سمجھتا کیونکہ میرے نزدیک جس قدر مسلمان زمانے کی ضرورتوں سے واقف ہوتے جائیں گے، اور جس قدر ہندوستان میں مذہبی تعصبات قومی اور ملکی تعصبات سے بدلتے جائیں گے اور جس قدر مذہبی مناظرے فضول اور بے سود بلکہ مضر ثابت ہوتے جائیں گے اسی قدر اسلامی فرقوں میں اتفاق و اتحاد بڑھتا جائے گا۔

اس مقام پر اس بحث سے قطع نظر کر کے فریقین سے التجا کرتا ہوں کہ وہ مناظرے کے متعارف طریقہ کو یک قلم خیرباد کہہ دیں اور بجائے اس کے کہ ایک دوسرے کے مذہب پر رد و قدح کریں اسلام کی جڑ مضبوط کرنے میں کوشش کریں جس کو دہریوں اور ملحدوں کے شکوک و شبہات متزلزل

کررہے ہیں۔

اس مقام پر ہم ایک شاعر کے چار مصرعے نقل کرنے مناسب سمجھتے ہیں جن میں لامذہبوں کے خیالات کی تصویر کھینچی گئی ہے جو مسلمانوں کے باہمی جھگڑوں کی نسبت ان کے دل میں گزر سکتے ہیں ؎

کہتا تھا کل اک منکر قرآن و خبر
"کیا لیں گے یہ اہل قبلہ باہم لڑکر
کچھ دم ہے تو میدان میں آئیں ورنہ
کتا بھی ہے شیر اپنی گلی کے اندر"

۲۸۔ دیوان حافظ کی فالیں

(قلمی مسودہ سے نقل کیا گیا)

خواجہ حافظ کے دیوان میں فال دیکھنے کا رواج اور اس کی فالوں کے سچا ہونے کا اعتقاد جیسا کہ ہندوستان یا ایران کے مسلمانوں میں پایا جاتا ہے، ایسا ہی کم و بیش ان تمام ممالک اسلامیہ میں سُنا گیا ہے جہاں فارسی زبان بولی یا پڑھی پڑھائی جاتی ہے۔

خواجہ حافظ کی عموماً یہ کرامت سمجھی جاتی ہے کہ ان کے دیوان کو بند کر کے جب ایک خاص طریقے سے کھولا جاتا ہے تو جو شعر صفحے کے سرے پر نکلتا ہے وہ صراحتاً یا کنایتاً اس امر کے متعلق جس میں تردد ہے صاف خبر دیتا ہے کہ وہ امر واقع ہو گا یا نہیں۔ یا اس کا نتیجہ خواہش کے موافق ہو گا یا مخالف؟ یا فال دیکھنے والے کا خیال اس کی نسبت صحیح ہے یا غلط؟ چناں چہ اسی بنا پر دیوان مذکور کو لسان الغیب کے لقب سے ملقب کیا گیا ہے۔

دیوان حافظ کی بعض فالیں

جو سچی نکلیں

صدہا واقعات کی نسبت مشہور ہے کہ دیوان مذکور میں فال دیکھی گئی اور اُسی کے مطابق ظہور میں آیا۔

شیخ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ جلال الدین اکبر اور سکندر لودھی کی لڑائی سے پہلے دیوان حافظ میں فال دیکھی گئی کہ لڑائی کا انجام کیا ہو گا؟ اُس میں یہ شعر نکلا۔

سکندر را نمے بخشند آبے   بزور و زر میسر نیست ایں کار

چناں سکندر کو شکست ہوئی اور اکبر فتحیاب ہوا۔

ایک تعجب انگیز واقعہ مشہور ہے کہ کوئی قیمتی جواہر یا زیور گم ہو گیا تھا رات کے وقت اُسے چراغ کی روشنی میں تلاش کر رہے تھے کہ دیوان حافظ میں فال دیکھی گئی تو سرِ صفحہ پر یہ بیت برآمد ہوئی ؎

بفروغِ چہرہ زلفت رہِ دیں زند ہمہ شب
چہ دلاور ست دزدے کہ بکف چراغ دارد

چناں چہ جس خادم کے ہاتھ میں چراغ تھا اسی کے پاس سے وہ گم شدہ جواہر برآمد ہوا۔

اسی قسم کے بعض واقعات ہم نے ایسے معزز ذریعوں سے سُنے ہیں جن میں بناوٹ کا مطلق احتمال نہیں ہو سکتا۔

میرے بڑے بھائی کو جب کہ وہ پولیس میں ملازم تھے اکثر بیمار رہنے کے سبب سروس (ملازمت) کے پورا ہونے سے پہلے پنشن لینے اور ڈاکٹر کا معائنہ کرانے پر مجبور کیا گیا تھا مگر وہ یہ چاہتے تھے کہ جب سروس پوری ہو جائے اس وقت خود درخواست کر کے پنشن مل جائے۔ چنانچہ ڈاکٹری معائنہ کی تاریخ میں سے ایک دن پہلے انھوں نے دیوان کو دیں فال دیکھی تو صفحہ کے سرے پر یہ بیت نکلی ؎

ہر چند پیر خستہ دل و ناتواں شدم
ہر گہ کہ روئے خوب تو دیدم جواں شدم

انھوں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ ڈاکٹر میری خواہش کے موافق رائے دے گا۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا۔

بعض فالیں ایسی بھی سُنی گئی ہیں جن سے اگرچہ زمانۂ مستقبل کی نسبت کوئی پیشین گوئی مفہوم نہیں ہوتی، مگر فال دیکھنے والے کی سرگزشت اور زمانہ ماضی کے برتاؤ کی طرف ایک لطیف اشارہ مستنبط ہوتا ہے۔

ایک نہایت باخدا اور صاحب نسبت امیر نے اپنی سرگزشت خود مجھ سے بیان کی کہ عنفوان شباب کی غفلت و بدمستی کے زمانے میں کبھی کبھی اپنی حالت پر سخت افسوس اور انفعال ہوتا تھا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد وہی غفلت کا پردہ عقل پر پڑجاتا تھا۔ ایک روز ساری رات لہو ولعب میں گزری، جب صبح ہوئی تو سخت ندامت و انفعال دامن گیر ہوا، اور یہ خیال دل میں گزرا کہ آخر کبھی اُس سے نجات بھی ہوگی یا نہیں ؟ اس بے چینی میں دیوان حافظ کو کھول کر دیکھا تو اُس میں پہلا شعر یہ نکلا ؎

وظیفۂ شب دوشیں مگر زیادت رفت
کہ بامداد لبطرز دگر برآمدۂ

سب سے زیادہ عجیب وہ فال ہے جو شیخ علی حزیں کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ شیخ غزل میں اپنے نزدیک خواجہ حافظ کا تتبع کرتا تھا۔ مشہور ہے کہ ایک دن اس بات کے دریافت کرنے کو کہ مجھے اس تتبع میں کہاں تک کامیابی ہوئی ہے، اُس نے دیوان حافظ میں فال دیکھی، اس میں چھوٹتے ہی یہ بیت نکلی ؎

کے شعر ترا انگیزد خاطر کہ حزیں باشد
یک نکتہ ازیں دفتر گفتیم وہمیں باشد

یہ اور اسی قسم کی بے شمار فالیں مشہور ہیں جو خواجہ حافظ کی کرامت سے منسوب کی جاتی ہیں۔ ہم ان لوگوں کے اعتقاد پر جو خواجہ حافظ کی اس کرامت کے قائل ہیں۔ اعتراض کرنا نہیں چاہتے اور نہ اس موقعے پر ہمارا یہ مقصد ہے کہ نفس کرامت کے امکان یا امتناع پر بحث کریں۔ بلکہ صرف یہ دکھانا منظور ہے کہ جن اسباب سے خواجہ حافظ کے کلام کو یہ درجہ حاصل ہوا ہے ان میں کوئی غیر معمولی کرشمہ نہیں ہے۔

خواجہ حافظ کی غزلیات میں اعلیٰ درجے کے حسنِ بیان کے علاوہ سب سے

بڑی چیز جس نے ان کو مقبولِ خاص و عام بنا دیا ہے وہ عشقِ حقیقی کو عشقِ مجازی کے پیرایہ میں ادا کرنا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ کتاب کی صورت میں مرتب ہو کر ملک میں شائع ہوئیں تو باوجود یکہ اشاعت کے ذریعے اس وقت نہایت محدود تھے، تاہم تمام ملک میں گھر گھر اس کے نسخے پھیل گئے اور ہر طبقے نے اس کو حرزِ جاں بنا لیا جس طرح آزاد طبع نوجوان قہوہ خانوں اور تفریح کے جلسوں میں اس سے صحبتیں گرم کرتے تھے۔ اسی طرح مشائخ اور اہل اللہ حال و قال کی مجلسوں پر وجد کرتے تھے۔ جس طرح وہ درویشوں کا مونس و ہمدم تھا، اسی طرح بادشاہوں اور امیروں کا تعویذ بازو تھا۔

ظاہر ہے کہ انسان کی طبیعت میں آئندہ کا حال قبل از وقت دریافت کرنے کی طرف قدرتی میلان ہے اور اس قدرتی میلان کا نتیجہ ہے کہ اس نے نجوم و رمل وغیرہ اور رفال اور شگون اور بعض دیگر وسائل مستقبل کا حال دریافت کرنے کے لیے بہم پہنچائے ہیں۔

اسی کے ساتھ اس کی فطرت میں دوسری خاصیت یہ ہے کہ جس چیز یا جس شخص کے ساتھ اس کو عقیدت ہوتی ہے، اس سے خود بخود دل میں غیر معمولی کرشمے ظاہر ہونے کی توقع ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس سے جو کچھ عادتِ مستمرہ کے موافق ظہور میں آتا ہے اس کو بھی وہ اکثر خوارق العادت کرشموں پر محمول کر لیتا ہے۔

خواجہ حافظ کا دیوان چونکہ متصوفانہ کلام پر مشتمل ہے اس لیے اس میں مذہبی عقیدت کا ایک زبردست پہلو موجود تھا اور ہر طبقے کے لوگ اس کو ایک عارف کا کلام سمجھ کر متبرک خیال کرتے تھے، اس لیے ضرور کسی نہ کسی وقت دنیا داروں کے گروہ میں جو ہر وقت اپنی گوناگوں خواہشوں کے پورا ہونے کی دھن میں رہتے ہیں، خواجہ حافظ کے کلام سے تفاؤل کرنے کا خیال پیدا ہوا ہوگا، اور حسنِ اتفاق سے ایک دو بار جو کچھ فال میں نکلا اس کے مطابق ظہور میں آیا ہوگا۔ لیکن یہاں تک کوئی بات ایسی نہ تھی جس کو ایک غیر معمولی کرشمہ ماننے کی ضرورت ہو۔ مگر چونکہ انسان بالطبع عجائب پسند ہے

اس لیے وہ ہمیشہ ایسے اتفاقات کو غیر معمولی کرشموں کی طرف کھینچ لے جاتا ہے۔

کچھ شک نہیں دیوانِ مذکور میں فال دیکھنے کی بنیاد اسی طرح پڑی ہے۔ مگر اس کے بعد خود اس کی شاعری اور طرزِ بیان نے اس خیال کو بہت کچھ مدد پہنچائی۔ وہ عام شعرا کی طرح ان مستثنیٰ حالتوں سے کبھی تعرض نہیں کرتا جو دنیا میں نادر الوقوع ہیں، بلکہ ہمیشہ نیچرل جذبات اور معمولی خواہشوں اور امیدوں اور عام معاملات اور واقعات کی تصویر کھینچتا ہے، اور اس کے الفاظ ایسے حاوی اور لچکدار ہوتے ہیں کہ ہر ایک شعر میں متعدد پہلو نکل سکتے ہیں۔

۲۹۔ مسلمانوں میں مسئلہ خیرات

(یہ مضمون مولانا نے ۱۳۲۶ھ میں "انجمن بہبود مسلمانان دہلی کے سکرٹیری کی درخواست پر تحریر فرمایا تھا۔)

بھیک مانگنے کی جس قدر مذمت اسلام میں کی گئی ہے، کسی اور مذہب میں اس کی اس قدر برائی نہ کی گئی ہوگی۔ کچھ کم ڈیڑھ سو روایتیں سوال کی مذمت میں حدیث کی مختلف کتابوں سے کنزالعمال میں نقل کی گئی ہیں۔

سوال کے انسداد کو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس قدر مہتم بالشان تصور فرماتے تھے کہ جس طرح آپؐ توحید اور نماز پنجگانہ کی تعلیم کو ضروری سمجھتے تھے اسی طرح لوگوں کو سوال سے ...... باز رکھنے میں ہمت عالی مصروف رکھتے تھے۔ چنانچہ عبدالرحمٰنؓ بن عوف بن مالک اشجعی سے روایت ہے کہ" ہم نو یا آٹھ یا سات آدمی آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر تھے کہ آپؐ نے ہم سے فرمایا" کیا تم خدا کے رسولؐ سے بیعت نہیں کرتے ؟" ہم نے فوراً ہاتھ بڑھایا۔ مگر چوں کہ ہم چند روز پہلے ہی بیعت کر چکے تھے، ہم نے عرض کیا" یا رسول اللہ! ہم تو ابھی بیعت کر چکے ہیں، اب آپؐ ہم سے کس بات پر بیعت لیتے ہیں ؟" آپؐ نے فرمایا" اس بات پر کہ خدا کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک مت کرو، اور احکام الٰہی بجا لاؤ" اور پھر آہستہ ارشاد فرمایا: "ولا تسألوا الناس شیئاً" (یعنی لوگوں سے کچھ نہ مانگو)

اس روایت کے بعد عبدالرحمٰنؓ کہتے ہیں کہ میں نے اس کے بعد ان لوگوں میں سے (جنھوں نے بیعت کی تھی) بعض کو دیکھا کہ اگر کسی کے ہاتھ سے سواری کی حالت میں کوڑا بھی گر جاتا تھا تو وہ اس خیال سے کہ کہیں یہ بھی سوال میں داخل نہ ہو کسی کسی راہ چلتے سے اپنا کوڑا نہ مانگتا تھا۔

سوال نہ کرنے کی اس قدر تاکید صرف اسی واسطے ہے کہ گداگری پیشہ نہ ہو جائے اور اُسے آج کل کی طرح ذریعۂ معاش نہ بنا لیا جائے، کیونکہ دوسری حدیثوں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ "ایک دوسرے کی مدد کرو" اور "اپنے کاموں میں دوسرے بھائیوں سے مشورہ لو" اور جیسے زکوٰۃ اور خیرات وغیرہ دینے کی حدیثیں ہیں، جیسے اس وقت بعض رقوم کو قوم سے وصول کر کے اسلام کی ضروری خدمات کے صرف کے واسطے بیت المال میں جمع رکھا جاتا تھا، اسی طرح اگر اب بھی قوم کی اہم ضروریات کے واسطے روپیہ فراہم کیا جائے تو یہ گداگری نہیں ہے اور نہ یہ "تسأل النَّاسَ شَيْئًا" میں آسکتا ہے ورنہ اگر "کچھ نہ مانگو" کے "مطلق معنی مراد لیے جائیں تو دُنیا کا سارا معاملہ درہم برہم ہو جاتا ہے۔

اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بیعت مذکور کا اصل مقصد خاص کر سوال کرنے والوں کا بعد بیعت کے سوال سے اس قدر بچنا بھی اسی بات پر دلالت کرتا ہے کہ بیعت کا اصل مقصد صرف سوال کرنے کی ممانعت تھی اور بس!

بے شمار روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلعم سائل سے نہایت نفرت کرتے، اور جو شخص بغیر اضطراری حالت کے سوال کے ذریعے سے کچھ وصول کرتا تھا اس کو اس کے حق میں حرام سمجھتے تھے۔

جو شخص ایک وقت کی بھی خوراک موجود ہونے پر سوال کرے اس کی نسبت فرماتے ہیں کہ "وہ اپنے لیے کثرت سے آتشِ دوزخ طلب کرتا ہے"

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار فرمایا ہے کہ:۔

> "تم میں سے جو شخص اپنی رسی لے کر پہاڑ پر جائے اور وہ وہاں سے لکڑیوں کا گٹھا باندھ کر اپنی پشت پر لائے۔ اس کو فروخت کرے تاکہ خدا تعالیٰ اس کی حاجت رفع کر دے۔ یہ اس کے حق میں بہت بہتر ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ وہ لوگوں سے بھیک مانگے پھر وہ اس کو کچھ دیں یا دھتکار دیں"

عائذ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ:

"اگر تم لوگ جانو کہ سوال کرنے کے کیا نتائج
ہیں تو کوئی شخص سوال کرنے کے لیے دوسرے کی
طرف رُخ نہ کرے"

اگر کوئی فلاسفر یا اکانومسٹ (ماہر اقتصادیات) اس مطلب کو بیان کرتا تو زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا تھا کہ:-

"جس قدر قوم میں بھیک مانگنے والوں کی کثرت زیادہ
ہوتی جاتی ہے اسی قدر قوم کی دولت محنت و جفاکشی میں
عزت و حمیت میں، ہمت و اولالعزمی میں گھاٹا ہوتا جاتا
ہے مفلسوں کو کاہلی اور بے غیرتی کی ترغیب ہوتی ہے اور
دولت مندوں کا بہت سا روپیہ ایسی جماعت کی تعداد
بڑھانے اور تقویت دینے میں صرف ہوتا ہے جس کا وجود
سوسائٹی کے حق میں سمِ قاتل کا حکم رکھتا ہے"

مگر جو جامعیت مذکورہ بالا حدیث نبویؐ میں پائی جاتی ہے وہ اس فلاسفر یا اکانومسٹ کے اس لمبے چوڑے بیان میں ہرگز نہیں پائی جاتی۔

حدیث کے الفاظ جس طرح مذکورہ بالا سوشل (معاشرتی) اور مورل (اخلاقی) خرابیوں کو شامل ہیں اسی طرح ان تمام روحانی آفتوں اور بیماریوں پر حاوی ہیں جو سوال کی مذموم عادت سے سائل کو عارض ہوتی ہے۔

سائل خدا کو بھیک مانگنے کا ایک اوزار جانتا ہے جس کی نسبت آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ "ملعونٌ من سال لوجہ اللہ"

اس کے دل میں نبی کی عظمت اس سے زیادہ نہیں ہوتی کہ جب خدا کے ساتھ رسول کا بھی واسطہ دیا جاتا ہے تو ہر مسلمان آدمی کو خواہ مخواہ کچھ نہ کچھ دینا ہی پڑتا ہے۔

وہ قیامت کے معنی شاید اس کے سوا کچھ نہیں سمجھتا کہ خیرات دینے والے کو وہاں ایک کے عوض ستر ستر ملیں گے۔

سائل اپنے اندوختہ کو جو بھیک کے ذریعے سے اس نے پیدا کیا ہے چھپاتا ہے اور باوجود استطاعت کے اپنی ناداری کا اظہار کرتا ہے اور اس طرح کفرانِ نعمت دروغ گوئی اور مکاری کے سخت ترین گناہوں کو اپنی کامیابی گردانتا ہے۔

پس جن جامع الفاظ میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیک مانگنے کی مذمت فرمائی ہے اس سے زیادہ جامع الفاظ سمجھ میں نہیں آسکتے۔ یہاں ایک بات قابلِ غور ہے۔ یعنی یہ کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کرنے پر تو اس قدر لے دے کی ہے کہ بے شمار مرفوع حدیثیں سوال کی مذمت کے متعلق کتب احادیث میں موجود ہیں مگر غیر مستحق سائلوں کا سوال پورا کرنے والوں کی مدح یا ذم کہیں صراحت کے ساتھ نہیں فرمائی۔ اس کی وجہ ذرا تامل سے معلوم ہو سکتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات مقدسہ (جیسا کہ محققین نے بیان کیا ہے) دو قسم کی تھیں۔

ایک وہ تعلیم تھی جس کی نسبت آپ کو حکم تھا:

بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ۔

(یعنی اے رسول پہنچا دے لوگوں کو وہ احکام جو خدا کی طرف سے تجھ پر نازل ہوئے ہیں اور اگر تو نے ان کو نہ پہنچایا تو خدا کے پیغام کی کچھ تبلیغ نہ کی)

یہ تعلیم تو ایسی لازمی اور لابدی تھی کہ کسی حالت میں کسی مصلحت کے مقتضا سے اس میں سکوت یا کوتاہی نہیں ہو سکتی تھی۔

دوسری تعلیم وہ تھی جو دنیوی مصالح سے علاقہ رکھتی تھی اور جس کی نسبت آپؐ نے ارشاد فرمایا تھا کہ:

اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْیَاكُمْ (یعنی تم اپنے دنیوی معاملات کو مجھ سے زیادہ جانتے ہو)

اس تعلیم میں ملکی اور قومی مصلحتوں کے لحاظ سے ممکن تھا کہ سکوت یا تاخیر کی جائے یا بجائے تصریح کے کنایتہً ادا کیا جائے۔

چونکہ غیر مستحق سائلوں کا سوال پورا کرنا زیادہ تر سوشل و معاشرتی خرابیوں کا موجب تھا اور سوال پورا کرنے والوں کی مدح یا ذم تبلیغ رسالت سے کچھ علاقہ نہ رکھتی تھی اس لیے رسول خدا صلعم نے جس صراحت کے ساتھ سوال کی مذمت فرمائی ویسی صراحت کے ساتھ غیر مستحق سائلوں کا سوال پورا کرنے والوں کی مذمت نہیں فرمائی۔

علاوہ ازیں اس وقت عرب کے عام خیالات کے لحاظ سے سائل کا سوال رد کرنا (خواہ وہ مستحق ہو یا غیر مستحق، غائت درجہ کی دنائت سمجھی جاتی تھی اور یہ بات نبوت کی شان سے بعید تھی کہ جو امر قوم میں اس قدر حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہو، اور اسکے متعلق کچھ کہنا یا نہ کہنا تبلیغ رسالت سے کچھ علاقہ نہ رکھتا ہو۔ قوم کو علی الاعلان اس کی ترغیب دی جائے۔

بایں ہمہ اگرچہ آپؐ نے علی الاعلان غیر مستحق سائلوں کا سوال رد کرنے کی تاکید نہیں فرمائی، لیکن خود سوال کرنے کی اس قدر مذمت کرنے سے صاف پایا جاتا ہے کہ آپؐ ملک میں سائلوں کی تعداد بڑھنے کو نہایت مکروہ جانتے تھے، اور ظاہر ہے کہ کوئی چیز سائلوں کی تعداد بڑھانے والی ایسی نہیں ہے جیسے ہر مستحق و غیر مستحق سائلوں کا سوال پورا کرنا۔

اس کے سوا متعدد روایتوں کے فحوائے کلام سے پایا جاتا ہے کہ آپؐ غیر مستحق سائلوں کا سوال پورا کرنے سے خوش نہ ہوتے تھے۔

چنانچہ ابو سعید سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"قسم ہے خدا کی جو سائل میرے پاس سے اپنا مطلب حاصل کرکے جاتا ہے وہ مطلب نہیں ہے اس کے حق میں، مگر ایک آگ۔"

یہ سن کر حضرت عمرؓ نے عرض کیا:

"آپ کیوں اس کا مطلب پورا کرتے ہیں؟"

آپؐ نے فرمایا:

"کیا کیا جائے، لوگ تو مانتے نہیں، اور خدا تعالیٰ ردِ سوال کو مجھ سے پسند نہیں کرتا۔"

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی کا سوال رد نہ کرنے کو آپؐ اپنی خصوصیات میں شمار کرتے تھے اور قرآن مجید کی متعدد آیات جیسے:

وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ اور اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ اور فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۔ اس خصوصیت پر دلالت کرتی ہیں۔

پس عامہ امت کو اس خاص معاملہ میں، آپؐ کا اتباع کرنا گویا اپنے تئیں آنحضرتؐ کی خصوصیات میں شریک گردانتا ہے۔

لیکن اس باب میں سب سے عمدہ مشکوٰۃ کی وہ حدیث ہے جس میں آنحضرتؐ نے سائل کے ساتھ برتاؤ کرنے کا طریقہ تعلیم فرمایا ہے۔ یعنی انصار میں سے ایک شخص آپؐ کی خدمت میں کچھ مانگنے کے لئے حاضر ہوا۔ آپؐ نے پوچھا، کیا تیرے گھر میں کچھ بھی نہیں؟ اس نے عرض کیا، کیوں نہیں، ایک موٹی سی کمبلی ہے، اسے کچھ اوڑھتا ہوں، کچھ بچھاتا ہوں، اور ایک پیالہ ہے جس میں پانی پیتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا، دونوں کو میرے پاس لے آ۔ وہ دونوں چیزیں لے کر حاضر ہوا۔

آپؐ نے ان کو ہاتھ میں لے کر لوگوں سے فرمایا۔ ان کو کوئی خریدتا ہے؟

ایک شخص بولا میں ایک درہم کو خریدتا ہوں۔

پھر آپؐ نے دو یا تین بار فرمایا۔ کوئی ایک درہم سے زیادہ دے سکتا ہے؟

ایک شخص نے کہا۔ میں دو درہم دیتا ہوں۔

آپؐ نے کمبلی اور پیالہ اُسے دے کر دو درہم لے لیے اور اس انصاری سے فرمایا کہ ایک درہم کا تو کھانا لے جا کر اپنے گھر میں پہنچا اور دوسرے درہم کی کلہاڑی خرید کر میرے پاس لا۔ وہ کلہاڑی خرید لایا۔ آپؐ نے اپنے دستِ مبارک سے ایک لکڑی کا

دستہ اس میں ٹھونک دیا اور فرمایا:

"جا، لکڑیاں کاٹ کر بیچ۔ اب میں تجھ کو پندرہ دن تک نہ دیکھوں۔"

وہ شخص چلا گیا اور لکڑیاں کاٹ کاٹ کر بیچنے لگا۔ پندرہ دن بعد آنحضرت کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہوا، تو اس کے پاس دس درہم جمع ہو گئے تھے۔ اس نے ان میں سے کچھ کا تو کپڑا خریدا اور کچھ سے کھانے کا سامان مول لیا۔

آپؐ نے فرمایا:

"یہ تیرے لیے اس سے بہتر ہے کہ جب تو قیامت کے دن آئے تو تیرے چہرے پر بھیک مانگنے کا داغ ہو۔ دیکھ سوال کرنا صرف اس شخص کو حلال ہے جو سخت محتاج ہو، یا جس کے ذمہ بھاری تاوان ہو، یا جس کی گردن پر خون بہا ہو۔"

اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سائل کو سوال کرنے سے روکا جائے اور سوال کرنے کی برائی اور محنت و مشقت کرنے کی خوبی اس کے ذہن نشین کی جائے۔ مگر اس زمانے کے سائلوں کی بے غیرتی اور ڈھٹائی اس حد سے گزر گئی ہے کہ کسی کی فہمائش یا ملامت کا ان پر کچھ اثر نہیں ہو سکتا اور نیز عام آدمیوں کی فہمائش میں وہ تاثیر پیدا ہونی محالات سے ہے جو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی دل سوزی اور شفقت بھری نصیحتوں میں ہوتی تھی، لہذا اس وقت اس طریقہ پر عمل نہیں ہو سکتا۔

نظر بہ حالات موجودہ ہم کو اس کے سوا کچھ چارہ نہیں کہ غیر مستحق سائلوں کی داد و دہش سے یک قلم ہاتھ روک لیا جائے اور جہاں تک ہو سکے مستحقین کی امداد کی جائے جو باوجود استحقاق کے کسی سے سوال نہیں کرتے یا جو سخت مجبوری اور ناداری کی حالت میں سوال کرتے ہیں۔

غیر مستحق سائلوں کے ساتھ کوئی سلوک اور کوئی بھلائی اس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتی کہ ان کو اس بے غیرتی اور بے شرمی کے پیشے سے باز رکھا جائے۔

ملک و قوم کے حق میں کوئی احسان اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا کہ بھیک مانگنے کا بدترین پیشہ جو مرض متعدی کی طرح افراد قوم میں سرایت کرتا جاتا ہے اور جس سے روز بروز بھیک منگوں کی تعداد زیادہ ہوتی جاتی ہے، رفتہ رفتہ اس کی بیخ کنی کی جائے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ آنحضرت صلعم کے بعد مدت دراز تک ممالک اسلامیہ میں سوال کرنا مذموم سمجھا جاتا تھا اور طرح طرح سے اس کا انسداد کیا جاتا تھا۔

روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک سائل کی آواز سنی اور یہ سمجھ کر کہ بھوکا ہے اس کو کھانا کھلانے کا حکم دیا۔ تھوڑی دیر میں اس کی آواز پھر سنائی دی۔ معلوم ہوا کہ یہ وہی سائل ہے اور کھانا کھانے کے اب پھر مانگتا ہے۔ آپؓ نے اس کو بلوایا اور دیکھا کہ اس کی جھولی روٹیوں سے بھری ہے۔ آپؓ نے جھولی کا ایک سرا پکڑ کر اس کو اونٹوں کے آگے جھاڑ دیا اور فرمایا۔" تو سائل نہیں ہے تاجر ہے۔"

علامہ مقری تاریخ اندلس میں لکھتے ہیں کہ: " اندلس میں جس سائل کو تندرست اور کام کے لائق دیکھتے ہیں اس کو نہایت ذلیل کرتے اور سخت و سست کہتے ہیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ یہاں اپاہج اور معذور آدمی کے سوا کوئی سائل نظر نہیں آتا۔"

مگر افسوس اور نہایت ہی افسوس ہے کہ اس زمانے میں ہر ایک جگہ جس قدر مسلمان بھیک مانگتے نظر آتے ہیں اس قدر اور کسی قوم کے آدمی نظر نہیں آتے۔

پس سب سے پہلے مسلمانوں کا فرض ہے کہ اپنے اپنے حدود اور اختیارات میں جہاں تک ان کی دسترس ہو اس نالائق اور کمینہ رسم کا انسداد کریں۔

خاص کر ہمارے علماء اور واعظین کو لازم ہے کہ نہایت آزادی اور بے باکی کے ساتھ وعظ کی مجلسوں میں سوال کی مذمت جو حدیثوں میں وارد ہوئی ہے اور بد نتیجے سائلوں کی کثرت سے قوم کے حق میں پیدا ہوتے ہیں اور اسراف اور فضول خرچی کی برائی جو قرآن مجید میں جا بجا بیان ہوئی ہے، عام مسلمانوں کے ذہن نشین کریں۔

خاص کر زنانی مجلسوں میں عورتوں کو جو ہر فقیر کو مستجاب الدعوات اور اس کی آواز کو غیب کی آواز سمجھتی ہیں۔ ان لوگوں کے مکر و فریب سے آگاہ کرنا

چاہیے۔

ان کے دلوں میں بٹھا دیا جائے کہ ہٹے کٹے۔ ۔ ۔ بھیک مانگنے والوں کو کچھ دینا بجائے نیکی اور بھلائی کرنے کے اُلٹا گناہ کا مرتکب ہونا ہے۔ کیوں کہ جس قدر ایسے لوگوں کو دیا جاتا ہے، اسی قدر مستحق بیواؤں، یتیموں اور ہمسایوں کی حق تلفی ہوتی ہے، اسی قدر بھیک مانگنے کا ناپسندیدہ طریقہ زیادہ رواج پاتا ہے، اور اسی قدر قوم میں کام کے آدمیوں کی کمی ہوتی ہے۔

۳۰۔ تقی الدین ابن تیمیہ حرانی

یہ مضمون مولانا کے اپنے ہاتھ کے لکھے قلمی مسودے سے نقل کیا گیا ہے۔ مسودے سے یہ معلوم نہ ہوسکا کہ مولانا نے یہ مضمون کس سنہ میں لکھا تھا۔ نیز سخت افسوس ہے کہ مضمون ناتمام ہے اور مولانا نہ معلوم کس وجہ سے اس کو مکمل نہ لکھ سکے۔ بہرحال جس قدر مولانا کے ہاتھ کا لکھا ہوا مسودہ تھا پیش خدمت ہے۔

خاندان

حرّان جو بلاد شام میں ایک شہر ہے۔ وہاں چھٹی اور ساتویں ہجری میں ایک نامور خاندان اہل علم کا گزرا ہے جس میں چھ جلیل القدر اور متبحر عالم" ابن تیمیہ" کے نام سے مشہور ہوئے ہیں۔ ان میں سب سے پہلے شیخ فخرالدین ابوعبداللہ بن ابی القاسم کا نام" ابن تیمیہ" رکھا گیا ہے۔ جن کی اولاد میں سے ایک تقی الدین ابن تیمیہ" ہیں، جن کا ہم کو یہاں حال لکھنا منظور ہے اور جن پر اسلامی دنیا میں سب سے زیادہ ابن تیمیہ کا اطلاق کیا جاتا ہے۔

ولادت

شیخ الاسلام احمد بن عبدالحلیم بن عبدالسلام تقی الدین ابن تیمیہ ربیع الاول ۶۶۱ھ ہجری کی دسویں یا بارھویں کو" حرّان" میں پیدا ہوئے جہاں اس وقت تاتاریوں کا زور تھا۔

والدین کی ہجرت اور ابن تیمیہ کا دمشق آنا

ان کی عمر چھ سات برس سے زیادہ نہ تھی جب کہ ان کے والد مع اہل وعیال، تاتاریوں کے بڑوس سے تنگ آکر دمشق میں چلے آئے تھے۔

بچپن میں تحصیل علوم

دمشق جو اس وقت بلاد اسلامیہ میں علوم دینیہ کا مرکز تھا۔ وہاں شیخ زین الدین مقدسی کے حلقۂ درس میں شریک ہو کر ابن تیمیہ حدیث کی سماعت کرنے لگے۔

لکھا ہے کہ ابن تیمیہ کے شیوخ جن سے انھوں نے حدیث کی سماعت کی ہے تعداد میں ۲۰۰ سے زیادہ ہیں۔ سب سے پہلے انھوں نے حدیث ہی کی طرف توجہ کی اور سالہا سال حدیث کی سماع میں بسر کئے۔ پھر خوشنویسی، حساب اور حفظ قرآن کے بعد فقہ کی طرف متوجہ ہوئے اور ایک مدت تک عربیت کی کتابیں پڑھیں۔ خصوصاً "سیبویہ" کی "کتاب النحو"۔ جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ کسی علم میں ایسی عمدہ کتاب نہیں لکھی گئی، خصوصیت کے ساتھ دیکھی۔ پھر تفسیر اور اصول فقہ کی طرف خاص توجہ کی اور ان سب فنون میں معاصرین سے سبقت لے گئے حالانکہ ابھی ان کی عمر بیس برس سے بھی کم تھی۔

ذہانت، پرہیزگاری اور شوق علم

اس زمانے کے فضلا ابن تیمیہ کی ذہانت اور قوت حافظہ اور سرعت انتقال دیکھ کر حیران تھے اور اسی کے ساتھ اخلاق فطرتاً نہایت اعلیٰ درجے کے پائے تھے۔ پارسائی، تقویٰ، خدا پرستی، کھانے پہننے میں میانہ روی، والدین کی اطاعت، عبادت الٰہی کا شوق، ہر وقت خدا کی طرف لو لگائے رکھنا، حدود الٰہی سے کبھی تجاوز نہ کرنا، نیک باتوں کی ترغیب دینا اور بری باتوں سے روکنا۔ یہ سب خوبیاں پوری پوری ان کی ذات میں پائی جاتی تھیں علم سے ان کی کبھی سیری نہیں ہوتی تھی اور مطالعہ کی پیاس کبھی نہ بجھتی تھی۔ ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ انھوں نے کسی مضمون کی طرف توجہ کی ہو اور غیب سے فتحیابی نہ ہوئی ہو۔

قوتِ مناظرہ

وہ بچپن سے علمی مجلسوں میں شریک ہو کر اہلِ علم سے بحث اور مناظرہ کرتا تھا اور بڑے بڑے علماء کو ساکت کر دیتا تھا اور اکثر ایسی باتیں اس کے منہ سے نکل جاتی تھیں جن کو سن کر حاضرین حیران رہ جاتے تھے۔

بچپن میں فتویٰ نویسی

وہ سترہ برس کی عمر میں فتویٰ لکھنے لگا تھا اور اسی وقت سے ان کو جمع اور ترتیب کرنے لگا تھا۔

باپ کا انتقال اور ابن تیمیہ کا حلقۂ درس

جب اس کے باپ شیخ عبدالسلام نے جو حنبلیوں میں امام کا درجہ رکھتا تھا۔ انتقال کیا تو ابن تیمیہ نے باپ کی جگہ طلبار کو درس دینا اور باپ کے فرائض ادا کرنے شروع کیے، اس وقت اس کی عمر اکیس سال کی تھی۔ چند روز میں اس کی شہرت دُور دُور پہنچ گئی۔ انھیں دنوں میں اس نے قرآن مجید کی تفسیر کا درس ہر جمعہ کو بغیر مدد کتاب کے کہنا شروع کیا، آواز بہت بلند تھی، درس کی حالت میں کہیں نہیں اٹکتا تھا۔

حج۔ ۶۹۱ھ میں اس نے حج کیا جب کہ اس کی عمر تیس برس کی تھی۔

شہرت اور مقبولیت

اب وہ بہ لحاظ اپنے کمالات علمی و عملی اور اعلیٰ درجے کے اخلاق وخصائل کے اور زہد و ورع اور نفع رسانی خلائق کے نواح شام میں مرجع خلائق اور امام وقت سمجھا جانے لگا۔ وہ دین مبین کی نصرت اور اعلان کلمۂ حق میں بمقابل اہل بدعت کے ننگی تلوار تھا۔

فضل وکمال

"ابوالحجاج کا قول ہے کہ:

"میں نے کسی کو اس کا مثل نہیں پایا اور اس نے بھی کسی کو اپنا نظیر نہ دیکھا ہوگا۔ کوئی شخص کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا اُس سے زیادہ جاننے والا اور اس سے بڑھ کر ان کی پیروی کرنے والا میری نظر سے نہیں گزرا۔"

"علامہ کمال الدین زملکانی" نے کہا ہے کہ "جس علم کے متعلق اس سے کوئی سوال کیا جاتا تھا تو سننے والے اس علم میں اس کا تبحر دیکھ کر یہ خیال کرتے تھے کہ شاید یہ اس علم کے سوا کوئی دوسرا علم نہ جانتا ہوگا۔ ہر مذہب کے فقہا جب تک کہ اس کے مذہب سے واقف نہ ہوتے تھے، اپنے اپنے مذہب کے متعلق اس سے استفادہ کرتے تھے تصنیف کا سلیقہ، حسنِ بیان اور حسنِ ترتیب گویا اس کا حصہ تھا۔

ایک بار تقسیم میراث کے متعلق اور دوسری بار حدود کے متعلق دو مسئلوں میں اس زمانے کے مفتیوں میں اختلاف واقع ہوا۔ اُس نے دونوں مسئلوں پر ایک ایک ضخیم کتاب

لکھی مگر کہیں اصل سوال کی حد سے قدم باہر نہیں رکھا۔ ہر ایک مسئلہ کے متعلق جو کچھ لکھا وہ ایسا ضروری معلوم ہوتا تھا کہ گویا بغیر اس کے بیان ناتمام تھا لیکن ہر ایک مسئلہ پر جو کچھ لکھا اس کا غالب حصہ ایسا تھا کہ کسی کے وہم وگمان میں بھی اس موقع کے متعلق وہ باتیں نہ گزری تھیں۔ اس میں اجتہاد کی تمام شرطیں جیسی کہ چاہئیں انھوں نے جمع کر دی تھیں"۔

ابوالحجاج کہتے ہیں کہ میں نے علامہ موصوف کے قلم کا لکھا ہوا جو انھوں نے تقی الدین ابن تیمیہ کی کتاب "رفع الاعلام عن آئمۃ الاسلام" پر لکھا تھا پڑھا۔

ابوالحجاج نے علامہ زملکانی کی وہ عبارت نقل کی ہے جو انھوں نے شیخ کی اس مشہور کتاب پر اپنے قلم سے لکھی تھی۔ اس میں شیخ کے بے شمار محامد بیان کرنے کے بعد وہ یہ اشعار لکھتے ہیں:-

مَاذَا یَقُولُ الْوَاصِفُونَ لَہٗ | وَصِفَاتُہٗ جَلَّتْ عَنِ الْحَصْرِ
ھُوَ حُجَّۃٌ لِلّٰہِ قَاھِرَۃٌ | ھُوَ بَیْنَنَا اُعْجُوبَۃُ الدَّھْرِ
ھُوَ آیَۃٌ فِی الْخَلْقِ ظَاھِرَۃٌ | اَنْوَارُھَا اُرْبَتْ عَلَی الْفَجْرِ

ابوالحجاج کہتے ہیں کہ وہ اس تعریف کا اس وقت مستحق ہو گیا تھا جب کہ اس کی عمر تیس برس سے زیادہ نہ تھی۔

اس کے شیوخ اور ہمعصر علماء کی جماعت کثیر نے بھی اس کی بے انتہا مدح و ثنا کی ہے جیسے شمس الدین ابن ابی عمرو شیخ تاج الدین فزاری، ابن منجا، ابن عبدالقوی قاضی جوئی، ابن دقیق العید اور ابن النحاس وغیرہم۔ اور یہ سب علماء شافعی المذہب ہیں۔ شیخ عماد الدین وسطی نے اس کو اتباع سنت اور ترک بدعت کے لحاظ سے خلفائے راشدین اور ائمہ مہدیین کا نمونہ قرار دیا ہے اور اس کی بے انتہا

---

[1] یعنی تعریف کرنے والے اس کی تعریف کیا بیان کریں گے جب کہ اس کی صفات غیر محصور ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی ایک حجت قاہرہ اور ہم میں ایک نادر روزگار انسان ہے وہ اس دنیا میں خدا کا ایک کھلا ہوا نشان ہے اور اس کی برکات طلوع فجر کی طرح نمایاں ہیں۔

تعریف کے بعد لکھتے ہیں کہ :

"کسی فن میں کوئی اس کی گرد تک نہ پہنچ سکتا تھا۔
جس وقت وہ قرآن کی تفسیر بیان کرتا تھا تو لوگ
اس کی یادداشت دیکھ کر مبہوت ہو جاتے تھے۔ وہ
مفسرین کے ہر قول پر جب ترجیح یا تضعیف یا ابطال
کا حکم لگاتا تھا تو حاضرین حیران رہ جاتے تھے۔
حالاں کہ وہ ایک زاہد و عابد اور ذاکر و شاغل آدمی
تھا، اور اس کا بہت سا وقت لوگوں کو خدا کی طرف
بلانے یعنی وعظ و تذکیر میں گزرتا تھا۔

۱۲۱۔ التماس

بخدمت برادرانِ وطن

متعلق مسئلہ حجاب

(قلمی مسودے سے نقل کیا گیا)

(یہ مضمون سنہ ۱۳۱۵ھ میں، مولانا نے اپنے پانی پت کے شرفا کے لیے لکھا تھا، مگر چھپا یا نہیں گیا، بلکہ قلمی شکل میں معززین شہر کے پاس فرداً فرداً بھیجا گیا تھا۔ .... یہ مضمون ہمیشہ کے لیے ناپید ہو جاتا، اور اس کا کچھ بھی پتہ نہ چلتا۔ مگر حسنِ اتفاق سے اس کی ایک نقل مولانا کے قدیمی دوست حافظ محمد یعقوب صاحب مجددی کے پاس نہایت احتیاط سے محفوظ تھی۔ میں حافظ صاحب کا نہایت ممنون ہوں کہ میری درخواست پر انھوں نے یہ مضمون مجھے مرحمت فرمایا، جس کو میں آج سب سے پہلی مرتبہ عام طور پر شائع کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔)

آپ سب صاحب واقف ہیں کہ پردہ کا حکم مسلمانوں کے ہاں ایسا ہی تاکیدی ہے جیسا اور فرائض اور واجبات کا۔

اور تمام دنیا کی قوموں میں صرف مسلمانوں ہی کو یہ فخر ہے کہ ان کے ننگ و ناموس کو نامحرموں کے سامنے آنے سے منع کیا گیا ہے۔

مگر انگریزی عملداری کی خاصیت سے آپ بخوبی واقف ہیں، کہ وہ پردہ نشینی کی دشمن ہے اور عورتوں کی آزادی اور خود مختاری کی حامی ہے۔ اگرچہ وہ جبراً کسی کے پردے میں دست اندازی نہیں کرتے، مگر چوں کہ آزادی اور بے قیدی ہمیشہ انسان کو مرغوب ہوتی ہے اور حکمران قوم کی پیروی کرنے کو ہر ایک کا جی چاہتا ہے، اس سبب سے ان کی دیکھا دیکھی ہندوستان کی اکثر پردہ نشین قوموں میں خود بخود پردہ کم ہوتا جاتا ہے۔

ہندوؤں کی بعض قومیں جنھوں نے مسلمانوں سے پردہ کی رسم سیکھی تھی، ان کے ہاں سے اب یہ رسم کم ہوتی جاتی ہے اور برہمو ہندو جو ایک جدید فرقہ ہندوستان میں پیدا ہوا ہے، وہ لوگ تمام ہندوستان میں کوشش کرتے پھرتے ہیں کہ یہ رسم بالکل اس ملک سے جاتی رہے۔ وہ برابر رسالوں اور اخباروں اور کتابوں میں پردے کے خلاف مضمون لکھ کر چھپواتے ہیں، اور پردے کی برائی پر بیسیوں دلیلیں پیش کرتے ہیں۔

مسلمانوں میں بھی بیسیوں قومیں ایسی ہیں جن کے ہاں پردہ کی رسم جاری نہیں ہے۔ صرف چار قومیں شیخ۔ سید مغل پٹھان، برائے نام پردے کی پابند رہ گئی ہیں، مگر شہروں میں ان کے پردے کی حقیقت یہ ہے کہ ڈولیوں میں، بہلیوں میں اور رتھوں میں بیٹھنے کا نام پردہ رہ گیا ہے۔ باقی بیاہ شادیوں کی مجلسوں میں اکثر پردہ بالکل اٹھ جاتا ہے۔

اس سے بڑھ کر شہروں اور قصبوں میں عموماً یہ خرابی پھیلی ہوئی ہے کہ شرعی محرموں کے سوا بیسیوں نامحرموں سے بھی پردہ نہیں کیا جاتا، بلکہ شہروں کے لوگ ایسا خیال کرتے ہیں کہ یہ خرابی قصبات میں بہ نسبت شہروں کے زیادہ پھیلی ہوئی ہے۔

دلی میں ایک روز ایک دوست کے مکان میں چند احباب جمع تھے، اور میں بھی وہاں موجود تھا۔ ایک شخص نہایت دریدہ دہن اور آزاد منش اتفاقاً وہاں وارد ہوا۔ اثنائے صحبت میں شہر کے بعض خاندانوں کی خرابی کا ذکر چلا اور

ایک صاحب نے قصبات کے لوگوں کے چال چلن کی تعریف کی۔

اس پر ایک شخص نے کہا کہ آپ قصبات کے حالات سے واقف نہیں ہیں۔ قصبات کا حال شہروں سے بدتر ہے اور خورجہ اور شاہجہاں پور کی چند مثالیں بیان کیں۔ اس کے بعد یہ کہا کہ قصبات جو زیادہ بدنام نہیں ہیں، اس کا یہ سبب ہے کہ وہاں ہر ایک خاندان کے مرد عورت ایک دوسرے کے سامنے آتے ہیں۔ اس لیے جو اندرونی خرابیاں وہاں پیدا ہوتی ہیں، ان کا اعلان بہت کم ہوتا ہے۔ اس پر میں نے یہ کہا کہ برا کام سات پردوں میں بھی کیا جائے گا۔ ممکن نہیں کہ آخر کار اس کی رسوائی اور تفضیح نہ ہو۔ پس نیک نام . . . . وہی خاندان اور وہی بستیاں رہ سکتی ہیں جو حقیقت میں ہر داغ اور دھبے سے پاک ہیں۔ اگر اندرونی خرابیوں کا اعلان کم ہوتا ہے تو کیا سبب ہے کہ قلعہ تمام دنیا سے زیادہ بدنام تھا۔ قلعہ میں تمام شاہی خاندان کے مرد عورت ایک دوسرے کے سامنے آتے تھے اور وہاں جس قدر خرابیاں تھیں وہ اندرونی تھیں۔ انھوں نے کہا کہ قلعہ کی بدنامی کا سبب یہ تھا کہ وہاں اندرونی اور بیرونی دونوں طرح کی خرابیاں انتہا درجے کو پہنچ گئی تھیں۔ قصبات میں بیرونی خرابیاں بالکل نہیں تھیں اور اندرونی خرابیاں بھی زیادہ نہیں بڑھیں۔ اس تقریر پر گفتگو ختم ہو گئی۔

اگرچہ بعض قصبات کی نسبت ان کا یہ قول بالکل صحیح تھا، مگر جہاں تک میرا علم ہے میں نہایت وثوق اور یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہمارا قصبہ آج تک ہر ایک داغ دھبے سے پاک رہا ہے۔ اور جیسی مذموم اور قبیح باتیں بڑے شہروں میں سنی جاتی ہیں ویسی ایک بات بھی یہاں کے شریف خاندانوں میں نہیں سنی گئی۔

لیکن اس میں شک نہیں کہ نامحرم رشتہ داروں کے سامنے آنے کا طریقہ قطع نظر اس کے کہ احکام خدا و رسول کے برخلاف ہے، اس زمانے کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر بالخصوص نہایت خطرناک معلوم ہوتا ہے۔

جس قدر شرم و حجاب شریف خاندانوں کے مرد و عورت میں آج سے تیس چالیس برس پہلے دیکھا جاتا تھا اب اس کا عشر عشیر بھی نہیں دیکھا جاتا۔ اس کے سوا پہلے عورتوں کے

لباس کی وضع ایسی سیدھی سادی تھی کہ نامحرم رشتہ داروں کے سامنے آنے سے کوئی برا خیال پیدا نہ ہوتا تھا۔ لیکن اب حالت اس کے بالکل برخلاف ہے۔ پہلے ہر ایک محلے میں آدمیوں کی کثرت تھی، کوئی گھر ایسا نہ تھا جس میں دس پندرہ آدمی مرد و عورت موجود نہ ہوں، اب گھر کے گھر سونے پڑے ہیں، کسی گھر میں ایک عورت رہتی ہے کسی میں دو عورتیں رہتی ہیں۔ اس کے سوا تمام شریف خاندانوں میں چرخہ کاتنے کا رواج تھا۔ مستورات جب گھر کے کاروبار سے فارغ ہوتی تھیں۔ چرخہ پونی اور اٹیرنوں میں مصروف رہتی تھیں۔ اب اس کا رواج بہت کم گھروں میں نظر آتا ہے۔ اور عورتوں کی فرصت کے اوقات پان کھانے اور چھالیاں کترنے میں صرف ہوتے ہیں۔ صرف بال بچوں والی عورتیں بچوں کی خبرگیری اور ان کے کھلانے پلانے، پہنانے اور نہلانے دھلانے میں کسی قدر مصروف رہتی ہیں، باقی سب بے کار رہتی ہیں اور بے کاری تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ ایسی حالت میں نامحرم رشتہ داروں کا گھر میں بلا حجاب آنا نہایت خطرناک ہے۔

اگر ابھی سے اس خطرناک رسم کا انسداد نہ کیا جائے گا تو آئندہ سخت دشواریاں پیش آئیں گی۔ کیونکہ؎

سرچشمہ شاید گرفتن بہ میل
چو پُر شد نشاید گذشتن بہ پیل

آپ نے سنا ہوگا کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو، جن کی طہارت و عفت پر خدائے پاک نے قرآن مجید میں گواہی دی ہے، ایک بار دیکھا کہ اپنے باپ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس تنہائی میں بیٹھی ہوئی کچھ باتیں کر رہی تھیں۔ آپؐ نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

"اے ابوبکر! کیا شیطان کو دور سمجھتے ہو کہ اس طرح مخلّی بالطبع ہوکر جوان بیٹی سے باتیں کر رہے ہو؟"

جائے غور ہے کہ جب ایسے پاک زمانے میں، اور ایسے باپ اور بیٹی کی نسبت آں حضرت کا ایسا خیال ہو تو اس ناپاک اور نجس زمانے میں نامحرموں کی نسبت کیوں کر عفت اور طہارت کے سوا، اور کوئی خیال نہیں ہو سکتا۔

شاید کوئی صاحب یہ خیال کریں کہ نامحرم رشتہ داروں کے سامنے آنا اس قصبہ میں قدیم سے جاری ہے، اور آج تک اس رسم سے کوئی قباحت یا خرابی پیدا نہیں ہوئی، ہاں بے شک یہ رسم قدیم سے یہاں چلی آتی ہے۔ لیکن اس زمانے میں، اور حال کے زمانے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اُس زمانے میں عورتیں محکوم تھیں اور مرد حاکم تھے، اِس زمانے میں مرد محکوم ہیں اور عورتیں حاکم ہیں۔ اُس زمانے میں بڑے سے بڑے گھر کی بیویاں جو لباس پہنتی تھیں، وہ آج کل لونڈی باندیوں کے بھی خاطر میں نہیں آتا۔ جس قدر آرائش و زیبائش کے سامان آج ایک پنہاری کو میسر آ سکتے ہیں، اُس وقت امیر زادیوں بھی نصیب نہ تھے۔ اُس زمانے میں اپنے قصبہ کی پوشش اور لباس یا چال چلن کے سوا کسی غیر شہر کا لباس یا چال چلن نہ کبھی آنکھوں سے دیکھا جاتا تھا نہ کانوں سے سُنا جاتا تھا، اب ہر روز نت نئی تراش خراش آنکھوں سے دیکھی جاتی ہے، اور دُنیا کے عجیب و غریب معاملات کانوں سے سُنے جاتے ہیں۔ اس کے قدیم اور حال کے زمانے میں اور بہت سے تفاوت اور امتیاز ہیں، جن کا بیان کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

پس آپ صاحبوں سے میری درخواست ہے کہ اس معاملہ کو خوب غور سے ملاحظہ فرمائیں۔ اس کے بعد اگر آپ کے نزدیک بھی یہ رسم موقوف کرنے کے قابل ہو تو مردانہ وار اس کے انسداد کے درپے ہو جائیں اور جہاں جہاں آپ کی دسترس ہو، وہاں اس رسم کو موقوف کرا دیں۔

اگرچہ کہیں کہیں اس رسم کے توڑنے میں دقتیں پیش آئیں گی لیکن وہ دقتیں ان خرابیوں سے بدرجہا بہتر ہوں گی جو اس رسم کے جاری رہنے سے خیال میں آتی ہیں جو قومیں پردے کی پابند نہیں ہیں، ان کو نہایت تعجب ہوتا ہے کہ مسلمان پردے کی دقتوں اور تکلیفوں کو کیوں کر برداشت کرتے ہیں؟ حالاں کہ ہم لوگوں کو کچھ بھی دقت معلوم نہیں ہوتی۔

پس، اگر یہ رسم بھی موقوف ہوجائے گی تو دقتیں اس کے برطرف کرنے میں اس وقت معلوم ہوتی ہیں وہ چند روز کے بعد عادت میں داخل ہوجائیں گی اور کوئی اشکال باقی نہ رہے گا۔

سب سے پہلے میں، اس رسم کو اپنے شہر سے موقوف کرنے پر آمادہ ہوں اور میرا مصمم ارادہ ہے کہ میرے کنبے میں جس مرد یا عورت کو میری اس تجویز سے اتفاق نہ ہوگا، میں اس سے ہمیشہ کے لیے ملنا چھوڑدوں گا۔

میری آپ صاحبوں سے بھی یہی التماس ہے کہ اگر اس رسم کو موقوف کرانا ہے تو آپ بھی ایسی ہی سختی اختیار کریں، ورنہ اگر صرف چند گھروں سے یہ رسم اٹھ گئی تو کوئی عمدہ نتیجہ پیدا ہونے کی توقع نہیں ہے۔

پردہ کی بابت ہماری قوم کے شیعہ اور سنّی صاحبوں کو چاہیے کہ اپنے اپنے عالموں سے پردے کا شرعی قاعدہ دریافت فرماکر اس کے موافق کاربند ہوں۔

آپ صاحبوں کو معلوم رہے کہ میں کچھ اوپر تیس برس سے شہر دہلی میں آمدورفت رکھتا ہوں اور کم سے کم پندرہ سولہ برس اس شہر میں میرا قیام رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اس قدر مدت تک کسی جگہ رہے، اگرچہ وہ ایک مختصر گاؤں ہی ہو، تو بھی اس سے طبیعت مانوس ہوجاتی ہے چہ جائیکہ دلی جیسا شہر، جو ہر دلیسی کو چند روز میں اپنا دلدادہ اور اپنا مفتوں کرلیتا ہے

چنانچہ یہی سبب ہے کہ ہزاروں پردیسیوں نے اپنا عزیز وطن چھوڑ کر یہاں بود و باش اختیار کرلی ہے۔ اس تقدیر پر مجھ کو بھی چاہئے تھا کہ میں بھی اپنے عزیز وطن سے قطع تعلق کر کے دلّی کی بود و باش اختیار کرلیتا، لیکن میں نے آج تک ایسا نہیں کیا اور ہمیشہ دلّی کو پردیس سمجھتا رہا۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ شہر اور قلعہ کے اکثر خاندانوں کا حال جو سننے میں آتا تھا، اور شہر کا مقابلہ اپنے قصبے کے خاندانوں کے چال چلن سے کیا جاتا تھا تو شہر کی سکونت اور اہلِ شہر کے میل جول سے نہایت نفرت اور اپنے وطن کی حد سے زیادہ قدر معلوم ہوتی تھی اور یہ ارادہ ہوتا تھا کہ اگر اتفاقات قضا و قدر سے اپنی تمام عمر دلّی میں بسر ہو جائے تو بھی اس کو اپنا وطن بنانا اور اپنے وطن مالوف سے تعلق قطع کرنا نہیں چاہئے۔

اگرچہ اب تک میں اپنے اس ارادہ پر قائم ہوں اور میری یہ رائے ہے کہ جو شخص غیرت اور حمیت رکھتا ہو اور جس کو اپنے ننگ و ناموس کی، عفت اور پاکدامنی کا خیال ہو، اس کو قصبہ چھوڑ کر شہر میں کبھی بود و باش اختیار کرنی نہیں چاہیئے لیکن افسوس ہے کہ کچھ مدت سے قصبات کی حالت بھی نازک ہوتی جارہی ہے اور آئندہ آثار... اچھے نظر نہیں آتے۔

ہر چند کوئی قصبہ اور کوئی گاؤں اور شہر زمانے کی زبردست تاثیروں سے کسی طرح بچ نہیں سکتا، لیکن جب تک مسلمانوں میں اسلام باقی ہے اور شریعت کی قید سے آزاد نہیں ہوئے، اس وقت تک ہمارے خاندانوں کی عفت اور پاکدامنی کی حفاظت کے لیے پردے کا ایک ایسا پاک اور محکم قاعدہ موجود ہے جس پر زمانے کی تاثیر کا کوئی افسوں اور منتر چل نہیں سکتا۔ روم اور مصر میں ترکوں نے تمام معاشرت کے طریقے بدل ڈالے۔ مکان اور طعام، اور لباس اور سواری، غرض کہ ہر چیز میں اہلِ یورپ کی پیروی اختیار کرلی۔ مگر چونکہ شریعت کی پابندی نے پردے سے آج تک آزاد ہونے نہیں دیا، اس

لیے جس قدر عفت اور پاک دامنی وہاں کے مسلمانوں میں اب تک موجود ہے، یورپ کی کسی قوم میں خواہ انگریز ہوں، خواہ روسی، خواہ فرانسیسی، خواہ جرمن اس کا دسواں حصہ بھی نہیں پایا جاتا۔

پس، اے میرے بزرگو اور عزیزو! پردے کے محکم اور مضبوط قاعدے کو ہاتھ سے نہ چھوڑو کہ اس اخیر زمانے میں صرف یہی ایک چیز باقی رہ گئی ہے جس کی بدولت ہم تمام دنیا کی قوموں پر فخر کر سکتے ہیں، اور صرف یہی ایک چیز ایسی ہے، جس سے قوم میں غیرت اور حمیت باقی رہ سکتی ہے۔

وَمَا عَلَیْنَآ اِلَّا الْبَلَاغ

▲

۳۲ - تحریک سودیشی کے متعلق

تین سوالوں کے جواب

(از رسالہ زمانہ کانپور جلد ۶ - نمبر ۴ بابت اپریل ۱۹۰۶ء صفحہ ۲۰۴)

(اوائل ۱۹۰۶ء میں جناب دیا نرائن نگم بی - اے، اڈیٹر رسالہ زمانہ کانپور نے تمام مسلم مشاہیر ہند سے تحریک سودیشی کے متعلق تین سوال پوچھے تھے، اور اُن کے جوابات کو رسالہ زمانہ میں شائع کیا تھا، وہ تینوں سوال مندرجہ ذیل تھے۔

(۱) سودیشی تحریک بذات خود ملک کی ترقی کے لیے کہاں تک مفید ہے، اور اس تحریک کے نشیب و فراز اور نفع و نقصان اور عمل و رآمد کے متعلق آپ کی مفصل رائے کیا ہے۔

(۲) اس تحریک میں ہندو مسلمانوں کے اتفاق کی کہاں تک ضرورت ہے خاص کر مسلمانوں کے لیے اس سے کوئی نفع یا نقصان پہنچنے کی کہاں تک امید ہے؟

(۳) اس تحریک کی کامیابی کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے اور اس کی کامیابی کا ہندو مسلمانوں پر جداگانہ اور ملک پر بہ حیثیت مجموعی کیا اثر ہوگا؟

من جملہ دیگر مشاہیر کے مولانا حالی کی خدمت میں بھی یہ سوالات نگم صاحب

سے لکھ کر بھیجے تھے، مولانا نے اُن کے جو صائب اور معقول
جواب دیئے، وہ ذیل میں درج ہیں۔)

پہلے سوال کا جواب

جس قدر تحریکیں اب تک ہندوستان کی بھلائی کے لیے دلیسیوں کی طرف سے ہوئی ہیں۔ میرے نزدیک ان میں سے کوئی ایسی تحریک جس سے ملک کو حقیقی فائدہ پہنچنے کی اُمید ہو، سودیشی تحریک سے بہتر نہیں ہوئی، لیکن اس تحریک کو تقسیم بنگال کے معاملے میں متعلق کرنا گویا اس بات کا اعتراف کرنا ہے کہ اگر یہ تجویز منسوخ ہو جائے تو ہم اس تحریک سے دست بردار ہو جائیں گے۔

میں نے سُنا ہے کہ گزشتہ کانگرس کے اجلاس میں ایک ریزولیوشن اس مضمون کا پیش ہوا تھا کہ سودیشی تحریک کو تقسیم بنگال کے مسئلہ سے کچھ تعلق نہ ہونا چاہیے، لیکن بنگالیوں نے اس کی سخت مخالفت کی اور اس کو ہرگز پاس نہ ہونے دیا۔ جب اس تحریک کے اصل محرکوں کے یہ خیالات ہیں، اور جب کہ اس کی بنیاد محض بنگالیوں کی خود غرضی (نہ کہ تمام ہندوستان کی بھلائی) پہ ہے۔ تو ایسی تحریک سے کیا بھلائی کی اُمید ہو سکتی ہے؟ خود اکثر انگریز جو منصف مزاج، راست باز، اور نوعِ انسانی کے ہمدرد ہیں اس تحریک کو پسند کرتے ہیں۔ خود مجھ سے ایک معزز انگریز نے کہا کہ:

> "یہ تحریک ہندوستان کے حق میں نہایت مفید ہوگی۔ بشرطیکہ ہندوستانی استقلال کے ساتھ اس باب میں کوشش جاری رکھیں۔"

مگر میں کہتا ہوں کہ جس طریقے سے یہ تحریک شروع کی گئی ہے اس میں خود بے استقلالی کا تخم موجود ہے۔

دوسرے سوال کا جواب

ہندو مسلمانوں کے اتفاق کی نہ صرف سودیشی تحریک میں، بلکہ ہر کام میں جو ہندوستان کی بھلائی سے تعلق رکھتا ہو، اشد ضرورت ہے۔ اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں سودیشی تحریک جیسی ہندوؤں کے حق میں مفید ہے ایسی ہی مسلمانوں کے حق میں مفید ہے۔

مگر مجھے امید نہیں ہے کہ جب تک بنگالی سودیشی تحریک تقسیم بنگال کی منسوخی پر معلق رکھیں گے اور ملک کی عام ہمدردی کے خیال کو اس خود غرضی کے میل کچیل سے پاک نہ کریں گے، تب تک مسلمان اُن کے شریک نہ ہونگے ممکن ہے کہ تقسیم بنگال کی مخالفت کو پبلک کا جوش قائم رکھنے کا ایک آلہ سمجھا گیا ہو، مگر میرے نزدیک سودیشی تحریک کا خیال اب اس بات کا محتاج نہیں رہا کہ اس کے قائم رکھنے کے لیے تقسیم بنگال کی مخالفت کا جوش برقرار رکھا جائے۔ تقسیم بنگال کے موقوف ہوجانے سے اگر کوئی فائدہ ہندو مسلمان، یا خاص کر اہلِ بنگال کے حق میں متصور ہے کہ تو اُس کے سمجھنے والے بنگال میں بھی خال خال اشخاص ہوں گے۔ لیکن سودیشی تحریک کے عمدہ نتائج سے ہندوستان کے خاص و عام واقف ہو گئے ہیں یا ہوتے جاتے ہیں۔

پس، اس کے قائم رکھنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے کہ عملی تدابیر سے اس کو ترقی دی جائے اور اس کو کسی ایسی شرط سے مشروط نہ کیا جائے کہ جب وہ فوت ہوجائے تو مشروط بھی فوت ہوجائے۔

تیسرے سوال کا جواب

اس تحریک کا اثر ملک پر ضرور ہو گا، اور رفتہ رفتہ کم و بیش ہوتا جاتا ہے۔ لوگوں کو اس سرنگ کا راستہ معلوم ہو گیا ہے

جس راستے سے مُلک کی دولت غیر ملکوں میں کھنچی چلی جاتی ہے، مگر اس راستے کا بند کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے، اور اس کے لیے جلدی کرنا نیچر سے مقابلہ کرنا ہے ع

ایک دن کا کام کچھ روما کی آبادی نہیں

اگر ایک صدی میں بھی ہندستان غیر ملکیوں کی مصنوعات کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائے تو سمجھو اس کی بہت جلد کامیابی ہوئی۔

تمّت

انتخاب سعیدی	سعید شہیدی	۳/-۔
انتخاب کرشن موہن	کرشن موہن	۱۰/-۔
بھگوت گیتا	مترجم: محمد اجمل خاں	۳/۵۰
تذکرہ شعرائے جے پور	از مولوی احترام الدین احمد شاغل	۱۰/۵۰
تذکرہ گلشن سخن	مرتبہ و مولفہ: پروفیسر سید مسعود حسن رضوی	۴/-۔
خسرو کا ذہنی سفر	ظ۔ انصاری	۱۰/-۔
حافظ کی شاعری	کے۔ این پنڈت	۱۵/۵۰
دیوان اثر	ڈاکٹر کامل قریشی	۱۸/-۔
دلّی کے اردو مخطوطات	مرتب: صلاح الدین	
	ڈی لکس ایڈیشن	۲۵/-۔
	عام ایڈیشن	۱۲/-۔
سب رس کا تنقیدی جائزہ	از: منظر اعظمی۔ عام ایڈیشن	۲/-۔
	ڈی لکس ایڈیشن	۱۰/-۔
شادی کی کہانی شاد کی زبانی۔	مرتب: محمد مسلم۔	۵/-۔
صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات	مرتب عتیق صدیقی	۱۵/-۔
صحیفۂ خوشنویسان۔	احترام الدین احمد شاغل	۱۲/-۔
غالب	خورشید الاسلام	۱۱/-۔
فنِ شاعری (بوطیقا)	مترجم: عزیز احمد	۶/۵۰
فرانسیسی ادب	یوسف حسین خاں	۳۰/-۔
قومی یک جہتی اور سکولرزم	مترجمہ شمیم حنفی	۳/۵۰
گل کرسٹ اور اس کا عہد	محمد عتیق صدیقی	۲۰/-۔
مرزا محمد رفیع سودا۔	خلیق انجم	۲۰/-۔
مسافتِ شب	زبیر رضوی	۱۰/-۔

مطالعۂ حضرتِ غمگین دہلوی	محمد یونس خالدی	۳/-
مدار الشمس	تصنیف: دنشا کھادت۔ ترجمہ، منوّر لکھنوی	۳/۵۰
نقشِ صدا	رفعت سروش	۵/-
نوائے ظفر	مرتب: خلیل الرحمٰن اعظمی	۱۰/-
نسیم مغرب	امیر چند بہار	
تسلیات اور جنسی انتخابات		۴/۵۰
نیاز فتحپوری	امیر عارفی	۱۵/-
ہندوستانی اخبار نویسی (کمپنی کے عہد میں)	مرتبہ: محمد عتیق صدیقی	۱۶/-
ہندی مسلمان حکمراں کے سیاسی اصول۔	ایشور ٹوپا	۲/۲۵
یادگارِ حالی (جدید ایڈیشن)	بیگم صالحہ عابد حسین	۱۳/-
اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے	عنوان چشتی	۱۴/-
تاریخ ادبیات تاجکستان	یان ریپکاری۔ مترجم: کبیر احمد جائسی۔	۱۳/-
تقویم ہجری و عیسوی	انجمن ترقی اردو ہند	۶/۵۰
کلامِ سودا	انتخاب و ترتیب: خورشید الاسلام۔	۸/-
گاندھی اور نہرو کی راہ	سید عابد حسین	۵/۵۰
مذہب اور دھرم	مرتب: قاضی عبدالغفار۔	۳/-